تجلیات بندگی

ماہِ صیام کی یومیہ مناجات کے اسرار و معارف



سید لیاقت علی کاظمی


شهر رمضان
الذي أنزل فيه القرآن هدى للناس
أيها الذين آمنوا كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون

تجلیات بندگی

ماہِ صیام کی یومیہ مناجات کے اسرار و معارف



تالیف: سید لیاقت علی کاظمی

نام کتاب: تجلیات بندگی، ماہِ صیام کی یومیہ مناجات کے اسرار و معارف

تالیف: سید لیاقت علی کاظمی

نظر ثانی:

ترتیب و تنظیم: ابو امتثال

سن طباعت:

فہرست

پہلا عشرہ: عشرۂ رحمت، بیداری و خودسازی

دوسرا عشرہ: عشرۂ مغفرت، باطنی جراحی اور تزکیہ

تیسرا عشرہ: عشرۂ نجات، حتمی منزل اور استقامت

انتساب

اس کائنات کے حقیقی وارث اور بقیۃ اللہ الاعظم،

امامِ زمانہ، حجت ابن الحسن المہدی ارواحنا فداہ کے نام...

جن کے وجودِ مسعود کی برکت سے یہ زمین و آسمان قائم ہیں،

اور جن کی ایک نگاہِ کرم تاریک دلوں کو معرفت کے نور سے روشن کر دیتی ہے۔

یہ ادنیٰ سی کاوش اور گرے ہوئے ریزوں کی یہ جمع آوری اسی امید پر آپ کے حضور پیشِ خدمت ہے کہ شاید یہ آپ کے قدموں کی خاک بن کر ہماری نجات کا وسیلہ بن جائے۔

اور اپنے شفیق والدین خاص کر اپنی مرحومہ دادی جان سیدہ ریاض فاطمہ کے نام، جنہوں نے میرے دل میں محمد و آلِ محمد علیہم السلام کی محبت کا وہ بیج بویا جو آج میری زندگی کا کل سرمایہ ہے۔

پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَانَا لِحَمْدِهِ وَجَعَلَنَا مِنْ أَهْلِهِ، لِنَكُونَ لِإِحْسَانِهِ مِنَ الشَّاكِرِينَ، وَلِيَجْزِيَنَا عَلَى ذٰلِكَ جَزَاءَ الْمُحْسِنِينَ. الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي جَعَلَ الْحَمْدَ مِفْتَاحاً لِذِكْرِهِ، وَسَبَباً لِتَفَضُّلِهِ، وَدَلِيلاً عَلَىٰ آلَائِهِ وَعَظَمَتِهِ. الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي حَبَانَا بِدِينِهِ، وَاخْتَصَّنَا بِمِلَّتِهِ، وَسَلَكَ بِنَا فِي سُبُلِ إِحْسَانِهِ، لِنَسْلُكَهَا بِمَنِّهِ إِلَىٰ رِضْوَانِهِ. وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي جَعَلَ مِنْ تِلْكَ السُّبُلِ شَهْرَهُ شَهْرَ رَمَضَانَ؛ شَهْرَ الصِّيَامِ، وَشَهْرَ الْإِسْلَامِ، وَشَهْرَ الطَّهُورِ، وَشَهْرَ التَّمْحِيصِ، وَشَهْرَ الْقِيَامِ، الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ.

ثُمَّ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ سَيِّدِ الْبَشَرِ، وَنُورِ الْبَصَرِ، الشَّفِيعِ الْمُشَفَّعِ فِي الْمَحْشَرِ، أَبِي الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ، وَعَلَىٰ آلِهِ الْغُرِّ الْمَيَامِينِ؛ مَعَادِنِ الرَّحْمَةِ، وَتَرَاجِمَةِ وَحْيِهِ، وَأَرْكَانِ تَوْحِيدِهِ، وَأَدِلَّاءِ مَرْضَاتِهِ. وَلَا سِيَّمَا بَقِيَّةِ اللّٰهِ فِي أَرْضِهِ، وَخَاتَمِ أَوْصِيَائِهِ، الْقَائِمِ بِالْقِسْطِ وَالْعَدْلِ، مَوْلَانَا وَمُقْتَدَانَا الْحُجَّةِ

بْنِ الْحَسَنِ الْمَهْدِيِّ (أَرْوَاحُنَا لِتُرَابِ مَقْدَمِهِ الْفِدَاءُ)؛ الَّذِي بِيُمْنِهِ رُزِقَ الْوَرَىٰ، وَبِوُجُودِهِ ثَبَتَتِ الْأَرْضُ وَالسَّمَاءُ. اللَّهُمَّ عَجِّلْ فَرَجَهُ، وَسَهِّلْ مَخْرَجَهُ، وَاجْعَلْنَا مِنْ خِيَارِ مُنْتَظِرِيهِ وَأَعْوَانِهِ، وَالْمُجَاهِدِينَ بَيْنَ يَدَيْهِ.

أَمَّا بَعْدُ؛ فَقَدْ مَنَّ اللهُ عَلَيْنَا بِإِدْرَاكِ شَهْرِهِ الْعَظِيمِ، رَبِيعِ الْقُلُوبِ وَنُورِ الْأَبْصَارِ. فَهٰذِهِ بِضَاعَةٌ مُزْجَاةٌ وَجُهْدٌ مُتَوَاضِعٌ، ضَمَّنَّاهُ شُرُوحاً لِأَدْعِيَةِ أَيَّامِهِ، وَصُغْنَاهُ بِمَنْهَجِ التَّحْقِيقِ وَالتَّدْقِيقِ؛ لِيَكُونَ زَاداً لِلْعَارِفِينَ، وَمَنَاراً لِلسَّالِكِينَ، وَتَوْطِئَةً لِمَعْرِفَةِ مَقَاصِدِ الشَّرِيعَةِ، وَتَقَرُّباً إِلَى النَّاحِيَةِ الْمُقَدَّسَةِ لِمَوْلَانَا صَاحِبِ الزَّمَانِ (عَجَّلَ اللّٰهُ تَعَالَىٰ فَرَجَهُ الشَّرِيفَ).

اللَّهُمَّ اجْعَلْ أَعْمَالَنَا خَالِصَةً لِوَجْهِكَ الْكَرِيمِ، وَتَقَبَّلْهَا بِقَبُولِكَ الْحَسَنِ، وَاجْعَلْهَا ذُخْراً لَنَا يَوْمَ نَلْقَاكَ، وَارْزُقْنَا نَظْرَةً رَحِيمَةً مِنْ مَوْلَانَا صَاحِبِ الْأَمْرِ، يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ. وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

کائنات کی لامتناہی وسعتوں اور زمان و مکان کی قید میں، جب ماہِ رمضان کا ہلالِ نَو اپنی روشنی کے ساتھ طلوع ہوتا ہے، تو یہ محض ایک تقویمی مہینے کا آغاز نہیں ہوتا، بلکہ یہ عالمِ کثرت کی ہنگامہ آرائیوں میں عالمِ وحدت کی ایک پُرشکوہ مداخلت ہوتی ہے۔ یہ عالمِ قدس سے زمین کی تاریکیوں کی جانب رحمتوں، برکتوں اور تجلیات کا وہ سیلِ رواں ہے جو انسانی روح کے تشنہ و بے قرار صحرا کو ابدی حیات کے چشموں سے سیراب کرنے کے لیے امنڈ آتا ہے۔ اللہ رب العزت نے اس مہینے کو "شَھْرُ

اللہ" قرار دے کر اسے زمانے کے جبر اور وقت کی عام گردش سے نکال کر، براہِ راست اپنی ذات سے منسوب کر دیا ہے۔

اس ماہِ مقدس کی فضیلت محض بھوک اور پیاس جھیلنے میں پنہاں نہیں، بلکہ اس کی اصل اساس وہ "ضیافتِ الٰہی" ہے جس کا دسترخوان زمین سے عرش تک بچھا دیا گیا ہے۔ یہ وہ بے مثل ضیافت ہے جس میں میزبان خود خالقِ کائنات ہے اور مہمان وہ خاکی بندہ، جو ضبطِ نفس اور روزے کے ذریعے اپنے وجود کو مادی زنجیروں اور حیوانی جبلتوں سے آزاد کر کے، بندگی کی معراج کی طرف محوِ سفر ہوتا ہے۔

اس بلند پایہ معنوی سفر میں "دعا" محض مانگنے کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ایسا ہمہ گیر، مستحکم اور طاقتور وسیلہ ہے جو خالق اور مخلوق کے درمیان موجود تمام مادی اور نفسیاتی پردوں کو چشمِ زدن میں چاک کر دیتا ہے۔ ماہِ رمضان کی روزمرہ کی دعائیں در حقیقت ایک "روحانی نقشۂ راہ" ہیں، جو سالک کو یہ سکھاتی ہیں کہ ہر روز بندگی کے کن نئے آفاق کو تسخیر کرنا ہے اور نفسِ امارہ کے کن حصاروں کو پامال کرنا ہے۔

یہ دعائیں محض بکھرے ہوئے الفاظ کا مجموعہ نہیں ہیں، بلکہ یہ انسانی نفسیات اور روحانی ارتقاء کا ایک انتہائی منظم اور کمالاتی نصاب ہیں۔ پہلے دن کی دعا خوابِ غفلت کی بیداری سے اپنا سفر شروع کرتی ہے، جو اس حقیقت کی غماز ہے کہ معرفت کے سفر کا پہلا زینہ اس بات کا شعور ہے کہ انسان غافل ہے۔ پھر یہ نصاب بندے کو اس کی پست حالت سے اٹھاتا ہے اور توبہ کی گھاٹی، پاکیزگی، حلاوتِ ذکر، اور مکارمِ اخلاق کے مشکل مراحل سے گزارتا ہوا، اسے قربِ الٰہی تک لے جاتا ہے۔ یہ دعائیں قدم بہ قدم انسان کی انفرادی اصلاح سے لے کر اس کی اجتماعی ذمہ داریوں—جیسے یتیم پروری، معاشرتی عدل اور اخوت—تک اس کی ہمہ جہت تربیت کرتی ہیں۔

دعا کی قبولیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ بندہ اپنے رب کو کس حد تک پہچانتا ہے۔ ان دعاؤں میں اللہ تعالیٰ کو جن جلیل القدر اسماء و صفات کے ساتھ پکارا گیا ہے، وہ توحید کے عمیق ترین ابواب کھولتے ہیں۔ جب بندہ پکارتا ہے "يَا أَبْصَرَ النَّاظِرِينَ" تو اس کے اندر تقویٰ کا وہ شعور بیدار ہوتا ہے کہ خدا ہر لمحہ حاضر و ناظر ہے؛ اور جب وہ پکارتا ہے "يَا مُقِيلَ عَثَرَاتِ الْمُذْنِبِينَ" تو مایوسی کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں۔ یہ اسماء و صفات بندے کے دل میں ایک طرف اللہ کا جلال اور ہیبت پیدا کرتے ہیں، اور دوسری طرف اس کی بے پایاں رحمت اور جمال سے لو لگاتے ہیں۔

اگرچہ ان دعاؤں کے روحانی اور عرفانی مضامین دلوں کو موہ لینے والے ہیں، لیکن ایک طالب علم اور محقق کی حیثیت سے جب علمِ حدیث اور علمِ رجال کے کڑے معیارات پر ان کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے، تو ان کی استنادی حیثیت کے حوالے سے چند اہم علمی حقائق سامنے آتے ہیں جن کا ادراک ہر قاری کے لیے ضروری ہے:

- **سندی کمزوری:** تاریخی اعتبار سے، ان دعاؤں کو سب سے پہلے ساتویں صدی ہجری کے نامور عالم سید ابن طاؤسؒ نے اپنی کتاب میں ماہِ رمضان کے روزمرہ اعمال کے تحت نقل کیا، مگر انہوں نے ان کی کوئی سند بیان نہیں کی (اقبال الاعمال، ج ۱، ص ۱۰۹)۔ بعد ازاں، نویں صدی ہجری میں کفعمیؒ نے اپنی کتب میں انہیں ابن عباس کی وساطت سے رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کیا اور لکھا کہ یہ دعائیں کتاب "الذخیرہ" سے لی گئی ہیں (البلد الامین، ص ۲۱۹)۔ چونکہ "الذخیرہ" کے مصنف نامعلوم ہیں اور روایت منقطع (مرسل) ہے، اس لیے محض ابن عباس کا نام ہونے سے اس کی سندی کمزوری دور نہیں ہوتی۔

- **صلوات کا فقدان:** مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام میں دعا کی قبولیت کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کی آل پر صلوات بھیجنا بنیادی آداب میں شامل ہے (الکافی، ج ۲، ص ۴۸۴)۔ حیرت انگیز طور پر، ان تیس دعاؤں میں سے صرف دو مقامات پر صلوات کا ذکر ملتا ہے، اور وہ بھی بعض نسخوں میں سرے سے موجود ہی نہیں۔

- **شبِ قدر کا تعین:** ان دعاؤں کے پرانے نسخوں میں ستائیسویں رمضان کی دعا میں شبِ قدر کی فضیلت مانگی گئی ہے (اقبال الاعمال، ج ۱، ص ۲۳۰)، جبکہ شیعہ روایات میں شبِ قدر کی تلاش عموماً اکیسویں اور تیئیسویں رات کو کی جاتی ہے (الکافی، ج ۴، ص ۱۵۶)۔ ستائیسویں کو شبِ قدر ماننا زیادہ تر اہلِ سنت علماء کا نظریہ ہے (التفسیر الکبیر، ج ۳۲، ص ۲۳۰)۔

- **متن کا وسیع اختلاف:** ان دعاؤں کے مختلف نسخوں میں ۵۸۹ الفاظ کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ کل گیارہ سو الفاظ پر مشتمل ان مختصر دعاؤں میں اتنے بڑے پیمانے پر تبدیلی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کلام محفوظ حالت میں ہم تک نہیں پہنچا۔

- **مبالغہ آمیز اجر:** کفعمی نے ان مختصر دعاؤں کے پڑھنے پر جو اجر بیان کیا ہے (جیسے اربوں حوروں کا ملنا)، وہ عمل اور جزا کے شرعی تناسب کے اصول سے ہم آہنگ نہیں (البلد الامین، ص ۲۲۰)۔

جلیل القدر محدث علامہ محمد باقر مجلسیؒ نے بھی ان دعاؤں کو نقل کرنے کے بعد ان کی معتبر روایات نہ ملنے کا اشارہ دیا ہے (زاد المعاد، ص ۱۴۷)۔ تاہم، ان تمام حقائق کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان دعاؤں کو پڑھنا ممنوع ہے۔ اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز کسی بھی زبان اور کسی بھی خوبصورت پیرائے

میں کیا جا سکتا ہے۔

سندی کمزوری کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم قطعی یقین کے ساتھ انہیں معصوم علیہم السلام کا حرف بہ حرف کلام قرار نہیں دے سکتے، لیکن چونکہ ان دعاؤں کے مضامین عالی، پُر تاثیر اور قرآنی تعلیمات سے مکمل ہم آہنگ ہیں، اس لیے انہیں پڑھنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ شریعت کا مستند اصول ہے کہ نیک اعمال اور دعائیں ثواب کی امید (قصدِ رجاء) سے انجام دی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں عقائد کا محور بنائے بغیر، خلوصِ نیت کے ساتھ پروردگار سے مناجات کے لیے استعمال کیا جائے۔ عموماً ہمارا المیہ یہ رہا ہے کہ ہم ان دعاؤں کے ظاہری ترجمے تک محدود رہتے ہیں اور اس باطنی روح تک نہیں پہنچ پاتے جو ان مناجات میں دھڑک رہی ہے۔ اس کتاب میں یہ شعوری کوشش کی گئی ہے کہ ہر دعا کو محض ایک روایتی ترجمے کے بجائے، ایک رواں، تجزیاتی اسلوب میں پیش کیا جائے تاکہ قاری حقائق کو بخوبی سمجھ سکے۔ مطالعے کی سہولت کے لیے ہر دعا کو درج ذیل سانچے میں ترتیب دیا گیا ہے:

مقدمہ: ہر دعا کے آغاز میں ایک جامع تعارف جو اس دن کے روحانی تقاضوں کو واضح کرے۔ **دعا کا مرکزی پیغام:** دعا کے بنیادی فلسفے کا بیان۔ **اہم نِکات:** دعا میں مانگی گئی التجاؤں کی فکری اور اخلاقی جہتیں۔ **دعائیہ فقرات کی تشریح اور خلاصہ:** قرآنی آیات اور احادیث کی مستند روشنی میں ہر فقرے کی گہرائی کا تجزیہ اور آخر میں مکمل نچوڑ۔

یہ دعائیں ہمیں بتاتی ہیں کہ روزہ اس وقت تک بارگاہِ الٰہی میں شرفِ قبولیت نہیں پا سکتا جب تک کہ اس کی جڑیں معرفت اور ولایتِ الٰہیہ میں پیوست نہ ہوں۔ اور یہ کہ ماہِ رمضان اگر "بہارِ قرآن" ہے،

تو اس کلامِ الٰہی کی تلاوت اور اس کی دعاؤں کا عرفان اس وقت تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا، جب تک اس کا تعلق "وارثِ قرآن" سے نہ جڑ جائے۔ مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام کا یہ اٹل عقیدہ ہے کہ خاموش قرآن اس وقت تک اپنے کامل اسرار اور باطنی تجلیات منکشف نہیں کرتا، جب تک اسے بولتے قرآن کی ولایت کی روشنی میں نہ پڑھا جائے۔ اور آج کے اس پرفتن دور میں وہ وارثِ قرآن اور عدلِ الٰہی کے امین، ہمارے امامِ زمانہ، بقیۃ اللہ الاعظم، حجت ابن الحسن المہدی (عجل اللہ فرجہ الشریف) ہیں۔ اس عظیم الشان علمی اور روحانی سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر، جب میں اپنے وجود اور اپنی علمی بساط پر نظر ڈالتا ہوں، تو سراپا عجز و نیاز بن جاتا ہوں۔ میں اپنی انتہائی کم علمی، کم مائیگی اور بے بضاعتی کا کھلے دل سے اعتراف کرتا ہوں۔ اس تشریح و تجزیے میں جو کچھ بھی حسن، کمال، اور حقانیت ہے، وہ خالصتاً محمد و آلِ محمد علیہم السلام کے در کی خیرات اور ان کی غیبی دستگیری کا نتیجہ ہے؛ اور جو خامی، نقص یا لغزش ہے، وہ سراسر میرے اپنے نفس کی کمزوری اور فہم کی کوتاہی ہے۔ یہ عاجزانہ، ٹوٹی پھوٹی اور حقیر سی کاوش، کائنات کے اسی حقیقی وارث اور وارثِ قرآن کے حضور ایک طالب علمانہ ہدیہ ہے۔ پروردگارِ عالم سے گڑگڑا کر التجا ہے کہ وہ ہماری اس بے بضاعت اور عجز میں ڈوبی ہوئی سعی کو وارثِ قرآن، امامِ زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی نگاہِ کرم اور آپ کی خاص عنایت کے صدقے شرفِ قبولیت عطا فرمائے، اور اسے روزِ جزا ہماری بخشش کا سامان اور بہترین زادِ راہ بنا دے۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ

سید لیاقت علی کاظمی

پہلا باب

پہلا عشرہ: عشرۂ رحمت؛ بیداری و خود سازی



پہلے دن کی دعا



﴿اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صِيامى فيهِ صِيامَ الصّائِمينَ، وَقِيامى فيهِ قِيامَ الْقائِمينَ، وَنَبِّهْنى فيهِ عَنْ نَوْمَةِ الْغافِلينَ، وَهَبْ لى جُرْمى فيهِ يا اِلـهَ الْعالَمينَ، وَاعْفُ عَنّى يا عافِياً عَنِ الْمُجْرِمينَ﴾

اے اللہ! میرے روزے کو اس مہینے میں حقیقی روزہ داروں کا روزہ قرار دے، اور میرے قیام (عبادت) کو حقیقی عبادت گزاروں کا قیام قرار دے، اور مجھے اس میں غافلوں کی نیند سے بیدار کر دے، اور اس مہینے میں میرے گناہوں (جرائم) کو بخش دے اے جہانوں کے معبود، اور مجھ سے درگزر فرما اے گنہگاروں (مجرموں) سے درگزر کرنے والے۔

پہلا دن: بیداریٔ قلب اور شعورِ بندگی

ماہ صیام کا پہلا دن در حقیقت ایک نئے روحانی سال کا آغاز اور غفلت کی گہری نیند سے بیداری کا نقطہ ہے۔ جس طرح انسان مادی زندگی کے سفر میں منازل طے کرتا ہے، اسی طرح یہ دن روح کے ارتقائی سفر کی پہلی اور کٹھن ترین منزل ہے۔ اس دعا کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ محض بھوکا اور پیاسا رہنا سچے روزے کی معراج نہیں، بلکہ حقیقی بندگی کا آغاز اس احساسِ ندامت سے ہوتا ہے جب بندہ اپنے خالق کے حضور اپنی خطاؤں کا بے لاگ اعتراف کرتا ہے۔ جب تک دل کی زمین سے غفلت اور دنیوی الجھنوں کی جڑیں نہ اکھاڑی جائیں، اس میں معرفت کا بیج نہیں بویا جا سکتا۔ لہٰذا، یہ مناجات دراصل انسان کے اندر چھپے ہوئے اس حقیقی عبد (بندے) کو جگانے کی پکار ہے جو مشینی عبادات کے خول سے نکل کر اپنے دل کو یادِ خدا کے لیے فارغ کرتا ہے۔ یہ دعا سالک کو سکھاتی ہے کہ انا کو مٹا کر کیا گیا سچا اعترافِ جرم ہی وہ پہلا زینہ ہے جو اسے پروردگار کی کامل پردہ پوشی، بے پایاں رحمت اور عفو و درگزر کی پناہ گاہ تک لے جاتا ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے پہلے دن کی دعا محض چند کلمات کی ادائیگی کا نام نہیں، بلکہ یہ مادی غفلتوں سے بیداری اور حقیقی بندگی کے شعور کا آغاز ہے۔ یہ مناجات انسان کو ظاہری عبادات (فاقہ کشی اور جسمانی قیام) کے خول سے نکال کر باطنی پاکیزگی، خلوص، اور بارگاہِ الٰہی میں سچے اعترافِ جرم کے ذریعے کامل عفو و درگزر کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔ یہ دراصل روح کو بیدار کرنے اور کائنات کے خالق کے

ساتھ اپنا تعلق شعوری سطح پر استوار کرنے کا ایک مکمل ارتقائی سفر ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **حقیقی صیام کا حصول:** روزہ محض بھوک اور پیاس کا نام نہیں، بلکہ جسم کے تمام اعضاء کو گناہوں سے بچانے اور دل کو اللہ کے سوا ہر خیال سے پاک کرنے (صیامِ خواص الخواص) کی التجا ہے۔
- **عبادت میں حضورِ قلب:** رات کے قیام اور نمازوں کو محض مشینی انداز یا عادت سے نکال کر سچے خلوص اور دل کی کامل حاضری کے ساتھ ادا کرنے کی طلب۔
- **خوابِ غفلت سے بیداری:** دنیا کی رنگینیوں، بے مقصد زندگی اور آخرت کی فراموشی جیسی مہلک روحانی غفلتوں اور ضمیر کی بے حسی سے مکمل بیداری کی درخواست۔
- **سچا اعترافِ جرم:** بارگاہِ الٰہی میں تکبر، انا اور تاویل کے بجائے انتہائی خاکساری کے ساتھ اپنی خطاؤں کا بے لاگ اعتراف، جو سچی توبہ کی پہلی اور لازمی شرط ہے۔

عفوِ کامل کی التجا: گناہوں پر محض پردہ پڑنے (مغفرت) کے بجائے، نامۂ اعمال سے گناہوں کے نشان تک مٹ جانے (عفو) اور رحمتِ الٰہی پر کامل یقین کے ساتھ مایوسی کے خاتمے کی درخواست۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

١. صِيامي فيهِ صِيامَ الصّائِمينَ

روزے کے درجات اور حقیقی صیام کا فلسفہ

دعا کا پہلا فقرہ بظاہر انتہائی سادہ ہے مگر باطن میں یہ ایک کڑی آزمائش اور بلند ترین معیار کا متقاضی ہے: "اے اللہ! میرے روزے کو حقیقی روزہ داروں کا روزہ قرار دے"۔

یہاں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک شخص نے صبحِ صادق سے لے کر مغرب تک کھانا پینا ترک کر دیا ہے اور شریعت کے تمام ظاہری اصولوں کی پابندی کی ہے، تو پھر اسے یہ دعا مانگنے کی کیا ضرورت ہے کہ اس کا روزہ "روزہ داروں والا روزہ" بن جائے؟ اس کا واضح اور دو ٹوک جواب یہ ہے کہ اعمال اور عبادات کے دو رُخ ہوتے ہیں؛ ایک ظاہر اور دوسرا باطن۔ انسان ایک ایسے وجود کا حامل ہے جو دو عناصر پر مشتمل ہے: ایک اس کا وجودِ حیوانی اور دوسرا اس کا وجودِ روحانی۔ روزہ اصل میں حیوانیت کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کر کے روحانیت کی تقویت کا سامان فراہم کرتا ہے۔

اگر انسان روزہ رکھ کر بھی اس کی روح جلوۂ ربانی کے لیے ترستی رہے اور اس کی حیوانیت ہنستی، کھیلتی اور دندناتی پھرے، تو ایسا بے روح روزہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی پھول ہو مگر اس میں خوشبو نہ ہو، کوئی جسم ہو مگر اس میں روح نہ ہو، کوئی چراغ ہو مگر اس میں روشنی نہ ہو۔ ماہِ رمضان کا اصل مقصد یہ ہے کہ نورِ تجلی جو خاک کے اس مادی وجود میں پنہاں ہے، وہ فربہ اور توانا بن کر اپنے مرکزِ اصلی کی طرف مائلِ پرواز ہو جائے۔

مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام کے علمائے اخلاق و عرفان نے احادیث کی روشنی میں روزے کو تین واضح درجات میں تقسیم کیا ہے[۱]۔

الف) صیامِ عوام (عام انسانوں کا روزہ)

یہ روزے کا سب سے نچلا اور ابتدائی درجہ ہے۔ اس میں انسان صرف اپنے پیٹ کو کھانے پینے اور شہوات سے روکے رکھتا ہے۔ اس سے انسان پر عائد ہونے والا شرعی فریضہ تو ادا ہو جاتا ہے، لیکن اس کی روح کو کوئی بلندی نہیں ملتی۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اسی روزے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک انتہائی بصیرت افروز حقیقت بیان فرماتے ہیں: «كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ إِلَّا الْجُوعُ وَالظَّمَأُ، وَكَمْ مِنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهِ إِلَّا السَّهَرُ وَالْعَنَاءُ» "کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں جنہیں ان کے روزے سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اور کتنے ہی قیام کرنے والے (عبادت گزار) ایسے ہیں جنہیں ان کے قیام سے سوائے جاگنے اور تھکاوٹ کے کچھ نہیں ملتا"[۲]۔

ب) صیامِ خواص (خاص لوگوں کا روزہ)

اس درجے میں پیٹ کے روزے کے ساتھ ساتھ انسان کے تمام اعضاء و جوارح (آنکھ، کان، زبان، ہاتھ اور پاؤں) بھی گناہوں سے روزہ رکھتے ہیں۔ یعنی آنکھ نامحرم سے اور زبان جھوٹ، تہمت اور غیبت سے رکی رہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ ایک روزہ دار عورت کو دیکھا جو غصے میں

---

[۱] ملا احمد نراقی، معراج السعادۃ، بابِ اسرارِ صیام، صفحہ ۲۳۱۔

[۲] سید رضی، نہج البلاغہ، حکمت ۱۴۵۔

اپنی کنیز کو گالیاں دے رہی تھی۔ آپؐ نے کھانا منگوایا اور اس عورت کے سامنے پیش کر کے فرمایا اسے کھالو۔ اس نے حیرت سے عرض کی: میرا تو روزہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: « كَيْفَ تَكُونِينَ صَائِمَةً وَقَدْ سَبَبْتِ جَارِيَتَكِ، إِنَّ الصَّوْمَ لَيْسَ مِنَ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ» "تم کیسے روزہ دار ہو سکتی ہو جبکہ تم نے اپنی کنیز کو گالیاں دی ہیں؟ یقیناً روزہ صرف کھانے اور پینے سے رکنے کا نام نہیں ہے"[1]۔

ج) صیامِ خواص الخواص (خاص الخاص لوگوں کا روزہ)

یہ روزے کا بلند ترین اور عارفانہ مقام ہے۔ اس درجے میں انسان کا "دل" اور "سوچ" بھی روزہ رکھ لیتی ہے۔ یعنی دل میں خدا کے سوا دنیا کی کسی اور چیز کا خیال تک داخل نہیں ہوتا۔ پہلے دن کی دعا میں "صیام الصائمین" مانگ کر ہم در حقیقت اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ یارب! ہمیں محض بھوکا پیاسا رہنے والوں کی صف سے نکال کر ان کاملین کی فہرست میں شامل فرمالے۔

۲. قِيامى فيهِ قِيامَ الْقائِمينَ

حقیقی قیام، عبادت میں حضورِ قلب اور خلوص

دعا کا دوسرا اہم ترین فقرہ قیام اور عبادت کی باطنی کیفیت سے متعلق ہے: "اور میرے قیام کو حقیقی قیام کرنے والوں کا قیام قرار دے"۔

یہاں "قیام" سے مراد رات کو کھڑے ہو کر نمازیں پڑھنا یا وہ مکمل حالتِ بندگی ہے جس میں

---

[1] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۴، صفحہ ۸۷۔

انسان اپنے رب کے حضور کھڑا ہوتا ہے۔ کیا محض مصلے پر کھڑے ہو جانا، مشینی انداز میں جسم کو جھکانا اور زبان سے بغیر سوچے سمجھے عربی الفاظ ادا کر دینا حقیقی قیام ہے؟ ہر گز نہیں۔ حقیقی قیام وہ ہے جس کی بنیاد "حضورِ قلب" پر استوار ہو۔

قرآن مجید میں ان حقیقی قیام کرنے والوں کی صفات نہایت خوبصورت انداز میں بیان کی گئی ہیں: ﴿وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا﴾ "اور وہ لوگ جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام کی حالت میں راتیں گزارتے ہیں"[۱]۔

حقیقی قیام کی ایک اور بڑی شرط "اخلاص" ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام عبادت کے اس معیار کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «لَا تَغْتَرُّوا بِطُولِ رُكُوعِ الرَّجُلِ وَسُجُودِهِ، فَإِنَّ ذَلِكَ شَيْءٌ قَدِ اعْتَادَهُ وَلَوْ تَرَكَهُ اسْتَوْحَشَ لِذَلِكَ، وَلَكِنِ اخْتَبِرُوهُمْ بِصِدْقِ الْحَدِيثِ وَأَدَاءِ الْأَمَانَةِ» "کسی شخص کے سجدے اور رکوع کی طوالت کو دیکھ کر دھوکہ نہ کھاؤ، کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی اسے عادت پڑ چکی ہے اور اگر وہ اسے ترک کرے تو اسے وحشت ہوتی ہے، بلکہ انہیں بات کی سچائی اور امانت کی ادائیگی سے پرکھو"[۲]۔

یہ فقرہ ہمیں شعور دیتا ہے کہ ہم ظاہری نماز کی مشق سے نکل کر حقیقتِ نماز تک پہنچیں، اور ہمارا قیام ہماری عملی زندگی میں ہمارے اخلاق کو سنوارنے کا سبب بنے۔

---

[۱] قرآن مجید، سورہ الفرقان، آیت ۶۴۔

[۲] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۲، صفحہ ۱۰۵۔

٣. نَبِّهْنِی فیهِ عَنْ نَوْمَةِ الْغافِلِینَ

غفلت کی نیند، روح کا شعور اور بیداری کا تقاضا

تیسرا تقاضا اس پوری دعا کا مرکز اور انسان کی کایا پلٹ دینے والا نکتہ ہے: "اور مجھے اس مہینے میں غافلوں کی نیند سے بیدار کر دے"۔

یہاں جس "نیند" (نومۃ) کا ذکر کیا جا رہا ہے، وہ رات کی جسمانی نیند نہیں، بلکہ یہ "روح کی نیند" اور ضمیر کی بے حسی کا نام ہے۔ غفلت کا مطلب یہ ہے کہ انسان حقیقت کو جانتا ہو، موت کو برحق مانتا ہو، خدا اور قیامت کا اقرار کرتا ہو، لیکن اس کی عملی زندگی ایسی ہو جیسے اسے کبھی مرنا ہی نہیں ہے۔

احادیثِ معصومین علیہم السلام اور بزرگانِ دین کی تعلیمات کی روشنی میں اس غفلت کے کئی بنیادی اسباب اور عوامل ہیں۔ پہلا سبب دنیا میں رونما ہونے والے حادثات و واقعات سے عبرت نہ لینا ہے؛ جیسا کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: «أَغْفَلُ النَّاسِ مَنْ لَمْ يَتَّعِظْ بِتَغَيُّرِ الدُّنْيَا مِنْ حَالٍ إِلَى حَالٍ» "لوگوں میں سب سے زیادہ غافل وہ شخص ہے جو دنیا کے ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنے سے نصیحت (عبرت) حاصل نہ کرے"[1]۔

دوسرا سبب عمر کو بیہودہ کاموں میں برباد کرنا ہے؛ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں: «كَفَى بِالْمَرْءِ غَفْلَةً أَنْ يُضَيِّعَ عُمُرَهُ فِيمَا لَا يُنْجِيهِ» "انسان کی غفلت کے لیے بس

[1] شیخ صدوق، من لایحضرہ الفقیہ، جلد ۴، صفحہ ۳۷۸۔

یہی کافی ہے کہ وہ اپنی عمر کو ان کاموں میں برباد کر دے جو اسے نجات دلانے والے نہیں ہیں"[۱]۔

تیسرا سبب لاابالی پن اور آخرت کو فراموش کر دینا ہے؛ جیسا کہ جنابِ لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: «لِلْغَافِلِ ثَلَاثُ عَلَامَاتٍ : السَّهْوُ، وَاللَّهْوُ، وَالنِّسْيَانُ» "غافل کی تین نشانیاں ہیں: سہو (کھویا کھویا رہنا)، لہو (کھیل کود/لاابالی پن)، اور نسیان (آخرت کو بھول جانا)"[۲]۔

اس غفلت کا انجام انتہائی ہولناک ہے۔ احادیث کی روشنی میں غفلت قساوتِ قلب (دل کی سختی) اور روحانی ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔ اس غفلت کے اسباب میں مال و اولاد کی کثرت اور دنیوی مسابقت نمایاں ہیں، جیسا کہ قرآنِ مجید کا واضح اعلان ہے: ﴿أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ﴾ "تمہیں باہمی مقابلۂ کثرتِ مال و اولاد نے غافل بنا دیا"[۳]۔

٤. وَ هَبْ لی جُرْمی فیهِ یا اِلهَ الْعالَمینَ

اعترافِ جرم، انا کی شکست اور بندگی کا آغاز

چوتھا فقرہ انسان کی اپنی حقیقت کے سچے اعتراف پر مبنی ہے: "اور اس مہینے میں میرے گناہوں (جرائم) کو بخش دے اے جہانوں کے معبود"۔

---

[۱] عبد الواحد آمدی، غرر الحکم و درر الکلم، صفحہ ۵۲۱۔
[۲] شیخ صدوق، الخصال، جلد ۱، صفحہ ۱۲۱۔
[۳] قرآن مجید، سورہ التکاثر، آیت ۱۔

یہاں ایک بہت ہی باریک لغوی نکتہ قابلِ غور ہے۔ دعاؤں میں عام طور پر گناہ کے لیے "ذنب" یا "خطیئہ" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن اس دعا میں "جرم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں جرم کا لفظ کھلی قانون شکنی، بغاوت اور اللہ سے تعلق توڑ لینے کے معنوں میں آتا ہے۔

جب بندہ پہلے دن غفلت سے بیدار ہوتا ہے تو وہ اللہ کے حضور انتہائی عاجزی کے مقام پر ہوتا ہے۔ وہ حیلے بہانے نہیں بناتا بلکہ سیدھا اعترافِ جرم کرتا ہے۔ ابلیس کا سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ اس نے اعتراف کرنے کے بجائے تکبر اور تاویل کا سہارا لیا، جبکہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی لغزش پر فوراً بارگاہِ الٰہی میں اعتراف کیا: ﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ "دونوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے"[1]۔

امیر المومنین علی علیہ السلام اس سچے اعتراف کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «الْمُقِرُّ بِالذَّنْبِ تَائِبٌ» "اپنے گناہ کا (سچے دل سے) اعتراف کرنے والا حقیقت میں توبہ کرنے والا ہے"[2]۔

یہ اعتراف انسان کو خدا کی رحمت کے سب سے زیادہ قریب کر دیتا ہے۔ تاہم، علمِ فقہ اور اخلاق

---

[1] قرآن مجید، سورہ الاعراف، آیت ۲۳۔
[2] عبد الواحد آمدی، غرر الحکم ودرر الکلم، صفحہ ۱۹۴۔

کی روشنی میں یہ یادرکھنا انتہائی ضروری ہے کہ خدا کی عادت تو بخشنا ہے، لیکن "حقوق العباد" کے سلسلے میں اگر کوئی خطا ہوئی ہو، تو اس کی معافی خود جاکر اسی شخص سے مانگنی ہوگی جس کے حق میں تقصیر اور ظلم کیا گیا ہو[۱]۔

۵. وَ اعْفُ عَنّی یا عافِیاً عَنِ الْمجْرِمینَ

عفو و درگزر، مجرموں کے لیے امید کی کرن

دعا کا حتمی اختتام اللہ کی صفتِ عفو پر ہوتا ہے: "اور مجھ سے درگزر فرما اے گنہگاروں (مجرموں) سے درگزر کرنے والے"۔

قرآنی اصطلاحات میں "مغفرت" اور "عفو" کے درمیان ایک اہم فرق ہے۔ مغفرت میں اللہ بندے کے گناہ پر پردہ ڈال دیتا ہے اور سزا سے بچا لیتا ہے لیکن نشان باقی رہتا ہے۔ جبکہ "عفو" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نامۂ اعمال سے اس گناہ کا نشان ہی مکمل طور پر مٹا دے، گویا وہ گناہ کبھی کیا ہی نہ تھا[۲]۔ اسی لیے قرآنی دعاؤں میں مغفرت کے ساتھ عفو کی خصوصی التجا کی گئی ہے: ﴿وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا﴾ "اور ہم سے درگزر فرما (عفو کر)، اور ہمیں بخش دے (مغفرت کر)، اور ہم پر رحم فرما"[۳]۔

یہ آخری جملہ انسان کو شدید مایوسی سے نکال کر امید کے روشن راستے پر کھڑا کر دیتا ہے، کیونکہ

---

[۱] شیخ حر عاملی، وسائل الشیعہ، کتاب الجہاد، بابِ توبہ، جلد ۱۶، صفحہ ۵۲۔

[۲] حسن مصطفوی، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، جلد ۸، صفحہ ۱۸۳۔

[۳] قرآن مجید، سورہ البقرہ، آیت ۲۸۶۔

قرآن کا واضح اعلان ہے: ﴿لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ﴾ "اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو"[1]۔

اگر ماہِ رمضان کے پہلے ہی دن انسان کی غفلت دور ہو گئی اور اس نے خلوص کے سانچے میں ڈھل کر سچے دل سے توبہ کر لی، تو یہ ایک دن اسے روحانیت کی ان بلند ترین منازل تک لے جائے گا جہاں اس کا دل حقیقی معنوں میں عرشِ رحمان بن جائے گا۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے پہلے دن کی دعا در حقیقت ایک نئے روحانی سفر کا نقطہ آغاز ہے۔ یہ انسان کو ظاہری اور مشینی عبادات کے خول سے نکال کر باطنی کمال اور شعور کی منازل تک لے جاتی ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

- **روزے کی حقیقت کی طلب:** دعا میں محض بھوکے پیاسے رہنے کی التجا نہیں کی گئی، کیونکہ یہ عام لوگوں کا روزہ ہے۔ اس میں خدا سے یہ توفیق مانگی گئی ہے کہ ہمارے تمام اعضاء گناہوں سے محفوظ رہیں اور ہمارا دل اللہ کے سوا ہر خیال سے پاک ہو جائے، جو کہ سچے اور خاص الخاص لوگوں کا روزہ ہے۔

- **روحانی اور سچا قیام:** رات کی عبادت اور نمازوں میں محض جسمانی طور پر کھڑا ہونا یا مشقت اٹھانا کافی نہیں۔ دعا ہمیں سکھاتی ہے کہ سچا قیام وہ ہے جس کی بنیاد دل کی حاضری (حضورِ قلب) اور خالص نیت پر ہو۔

[1] قرآن مجید، سورہ الزمر، آیت ۵۳۔

- **خوابِ غفلت سے بیداری:** دعا میں جس نیند سے پناہ مانگی گئی ہے، وہ جسم کی نہیں بلکہ 'روح کی نیند' اور ضمیر کی بے حسی ہے۔ دنیا کی رنگینیوں میں کھو جانا، وقت کو برباد کرنا اور آخرت کو بھلا دینا روحانی ہلاکت کا سبب بنتا ہے، اور یہ دعا اس ہلاکت خیز غفلت سے بیداری کی پکار ہے۔

- **عاجزی اور اعترافِ جرم:** بندہ اپنے رب کے حضور تکبر یا بہانے بازی کے بجائے اپنی خطاؤں کا کھلے دل سے اعتراف کرتا ہے۔ اپنی کوتاہیوں کا یہ سچا اقرار انسان کی انا کو توڑتا ہے اور اسے اللہ کی رحمت کے بے حد قریب کر دیتا ہے۔

- **کامل عفو و درگزر کی التجا:** دعا کے آخر میں محض مغفرت (گناہ چھپانے) کی نہیں، بلکہ 'عفو' (گناہ کا نشان تک مٹا دینے) کی التجا کی گئی ہے۔ یہ التجا گنہگار کو شدید مایوسی سے نکال کر ربِ کریم کی رحمت پر کامل امید اور بھروسہ بخشتی ہے۔

❖ رمضان المبارک کے پہلے دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ اگر انسان سچے دل سے غفلت کی چادر اتار پھینکے، اپنی خطاؤں کو تسلیم کر لے، اور خالص نیت کے ساتھ روزے اور قیام کا حق ادا کرے، تو اس کا دل پہلے ہی دن تجلیاتِ الٰہی کا مرکز بننے کا اہل ہو جاتا ہے۔

دوسرے دن کی دعا



﴿اَللّٰهُمَّ قَرِّبْنی فیهِ اِلی مَرْضاتِكَ، وَجَنِّبْنی فیهِ مِنْ سَخَطِكَ وَنَقِماتِكَ، وَوَفِّقْنی فیهِ لِقِرآءَةِ آیاتِكَ، بِرَحْمَتِكَ یا اَرْحَمَ الرّاحِمینَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں اپنی رضا (خوشنودی) کے قریب کر دے، اور مجھے اس میں اپنی ناراضگی اور اپنے عذابوں سے بچالے، اور مجھے اس میں اپنی آیات (قرآن) پڑھنے کی توفیق عطا فرما، اپنی رحمت کے صدقے اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے۔

دوسرا دن: جستجوئے رضائے الٰہی اور اُنسِ قرآن

غفلت کے اندھیروں سے بیداری پانے کے بعد، روحانی مسافر کو اپنے طویل اور کٹھن سفر کے لیے ایک واضح سمت اور حتمی منزل کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے دن کی دعا دراصل اسی سمت کے تعین کا نام ہے، جس کا واحد محور رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ یہ دن انسان کو اس کائناتی حقیقت کا شعور بخشتا ہے کہ دنیوی مقاصد اور مخلوق کی خوشنودی سراب کے سوا کچھ نہیں، حقیقی سکون صرف خالق کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں ہے۔ اس دعا کا عرفانی پہلو یہ ہے کہ بندگی کا توازن امید اور خوف کے درمیان قائم رہتا ہے؛ ایک طرف انسان اللہ کی قربت اور رضا کا طلبگار ہوتا ہے، تو دوسری طرف وہ اپنے گناہوں کے سبب نازل ہونے والے قہر اور ناراضگی سے لرزتا ہے۔ ان دونوں کیفیتوں کے درمیان، یہ مناجات کلامِ الٰہی (قرآنِ مجید) کو وہ واحد اور مستند راستہ قرار دیتی ہے جو سالک کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہ دن ہمیں سکھاتا ہے کہ جب تک انسان قرآن سے قلبی اور نظریاتی وابستگی پیدا نہیں کرتا، وہ نہ تو اللہ کی رضا پا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے غضب سے خود کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے دوسرے دن کی دعا انسان کو بیداری کے بعد ایک واضح سمت عطا کرتی ہے۔ یہ مناجات بندے کو اس بات کا شعور بخشتی ہے کہ اس کی زندگی اور عبادات کا واحد محور رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہیے۔ یہ دعا قہرِ خداوندی سے بچنے، کلامِ الٰہی (قرآن) سے قلبی وابستگی پیدا کرنے اور اپنی نجات کے لیے محض پروردگار کی بے پایاں رحمت پر کامل بھروسہ کرنے کا ایک عظیم اور

روحانی درس ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **رضائے الٰہی کا حصول:** اللہ کے قرب سے مراد کوئی مکانی فاصلہ نہیں بلکہ روحانی و اخلاقی قرب اور اس کی خوشنودی کا حصول ہے، جو بندگی کی معراج ہے۔
- **قہرِ الٰہی سے پناہ:** گناہوں، نافرمانیوں اور تکبر سے بچنے کی التجا تاکہ انسان اللہ کی ناراضگی (سخط) اور اس کے عذابوں (نقمات) سے محفوظ رہ سکے۔
- **تلاوتِ قرآن کی توفیق:** محض طوطے کی طرح الفاظ دہرانے کے بجائے، آیاتِ الٰہی میں تدبر اور غور و فکر کے ساتھ تلاوت کرنے کی باطنی توفیق کی طلب۔
- **رحمتِ خداوندی کا واسطہ:** اپنی عبادتوں پر مغرور ہونے کے بجائے، بندگی کی ہر منزل کو طے کرنے کے لیے اللہ کی وسیع رحمت پر کامل یقین اور انحصار۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

۱. قَرِّبْنی فیهِ اِلی مَرْضاتِكَ

قربِ الٰہی اور رضائے پروردگار کی معراج

دعا کا پہلا فقرہ انسان کے شعورِ بندگی کی معراج ہے: "اے اللہ! مجھے اس مہینے میں اپنی رضا کے قریب کر دے"۔

یہاں دو لفظ انتہائی اہمیت کے حامل ہیں: "قرب" (نزدیکی) اور "مرضات" (رضا اور خوشنودی)۔ جب ہم اللہ کے قرب کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد کوئی جسمانی، مادی یا مکانی نزدیکی نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ زمان و مکان کی قید سے پاک ہے۔ وہ تو کائنات کی ہر شے اور ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے، جیسا کہ قرآنِ مجید کا واضح اعلان ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ "اور یقیناً ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم جانتے ہیں جو وسوسے اس کا نفس اس کے دل میں ڈالتا ہے، اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں"[1]۔ تو پھر بندہ کس قرب کی التجا کر رہا ہے؟ یہاں "قرب" سے مراد "روحانی، اخلاقی اور صفاتی قرب" ہے۔ یعنی بندہ اپنے اندر وہ صفات پیدا کر لے جو اللہ کو پسند ہیں۔ جس قدر انسان اللہ کی صفات (جیسے رحم، کرم، عفو، درگزر، عدل اور علم) کو اپنی ذات میں نافذ کرتا جائے گا، وہ اسی قدر اللہ کے قریب ہوتا جائے گا۔ اور اس قرب کا حتمی نتیجہ "مرضات" (اللہ کی رضا) کا حصول ہے۔ انسان کی پوری زندگی کا سب سے بڑا اور حتمی مقصد خالق کو راضی کرنا ہونا چاہیے۔ جب انسان دنیا کے لوگوں کو راضی کرنے نکلتا ہے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، کیونکہ مخلوق کی خواہشات بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن خالق کی رضا کا معیار بالکل واضح اور متعیّن ہے۔

تاریخِ اسلام میں رضائے الٰہی کی جستجو کی سب سے شاندار اور بے مثال تصویر شبِ ہجرت (لیلۃ المبیت) پر امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا بسترِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سونا ہے۔ قرآن مجید نے اس عظیم عمل کی تعریف میں رضائے الٰہی کا ذکر یوں فرمایا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ

---

[1] قرآن مجید، سورہ ق، آیت ۱۶۔

ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ﴾ "اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی رضاجوئی کے لئے اپنی جان بیچ ڈالتا ہے، اور اللہ بندوں پر بڑی مہربانی کرنے والا ہے"[1]۔

اسی طرح سید الشہداء امام حسین علیہ السلام نے میدانِ کربلا میں مقامِ رضا کی وہ عظیم الشان مثال قائم کی جس کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے۔ آپؑ کا فرمان ہے: «رِضَى اللَّهِ رِضَانَا أَهْلَ الْبَيْتِ، نَصْبِرُ عَلَى بَلَائِهِ وَيُوَفِّينَا أُجُورَ الصَّابِرِينَ» "جو اللہ کی رضا ہے وہی ہم اہل بیتؑ کی رضا ہے، ہم اس کی طرف سے آنے والی آزمائش پر صبر کرتے ہیں اور وہ ہمیں صبر کرنے والوں کا پورا پورا اجر عطا فرمائے گا"[2]۔ دوسرے دن کی دعا میں ہم اللہ سے گڑگڑا کر التجا کرتے ہیں کہ یا رب! ہمارے دل کو ایسا بنا دے کہ جو تیری مرضی ہو، وہی ہماری مرضی بن جائے اور ہم تیری رضا کے مقام کے قریب تر ہو جائیں۔

۲. وَجَنِّبْنی فیهِ مِنْ سَخَطِكَ وَنَقِماتِكَ

قہرِ الٰہی سے پناہ اور گناہوں سے دوری

دعا کا دوسرا فقرہ انسان کے خوف، عاجزی اور پناہ مانگنے کی عکاسی کرتا ہے: "اور مجھے اس میں اپنی ناراضگی اور اپنے عذابوں سے بچالے"۔ جس طرح مقناطیس کے دو قطب ہوتے ہیں، اسی طرح بندگی کے بھی دو لازمی پہلو ہیں: ایک طرف اللہ کی رضا کی کشش اور امید (رجاء) ہے، اور دوسری طرف اس کی ناراضگی سے بچنے کی کوشش (خوف) ہے۔ دعا کے اس حصے میں "سخط" اور "نقمات"

---

[1] قرآن مجید، سورہ البقرہ، آیت ۲۰۷۔
[2] سید ابن طاؤس، اللہوف علی قتلی الطفوف، صفحہ ۶۰۔

کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ عربی لغت میں "سخط" کا مطلب ہے اللہ کا غضب اور شدید ناراضگی، جبکہ "نقمات" (نقمہ کی جمع) کا مطلب ہے وہ سزائیں اور عذاب جو اللہ کی ناراضگی کے نتیجے میں بندے پر نازل ہوتے ہیں[1]۔ اللہ تعالیٰ بذاتِ خود کسی بندے سے ناراض نہیں ہونا چاہتا، وہ تو "ارحم الراحمین" ہے۔ لیکن انسان کے اپنے اعمال، اس کے گناہ، دوسروں پر ظلم، اور تکبر وہ اسباب ہیں جو اللہ کے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔ امیر المومنین علی علیہ السلام انسان کو اسبابِ غضب سے ڈراتے ہوئے فرماتے ہیں: «وَايْمُ اللَّهِ مَا كَانَ قَوْمٌ قَطُّ فِي غَضِّ نِعْمَةٍ مِنْ عَيْشٍ فَزَالَ عَنْهُمْ إِلَّا بِذُنُوبٍ اجْتَرَحُوهَا، لِأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ» "خدا کی قسم! کوئی قوم کبھی خوشحالی اور نعمتوں بھری زندگی میں نہیں رہی کہ پھر وہ نعمتیں ان سے چھن گئی ہوں، مگر ان گناہوں کی وجہ سے جن کا انہوں نے ارتکاب کیا، کیونکہ اللہ اپنے بندوں پر ہرگز ظلم کرنے والا نہیں ہے"[2]۔ یہاں التجا یہ ہے کہ اے اللہ! مجھ میں تیرے قہر اور تیرے عذاب کی شدت کو برداشت کرنے کی ذرہ برابر بھی طاقت نہیں ہے۔ دعائے کمیل میں حضرت علی علیہ السلام انسان کی اسی کمزوری اور عاجزی کو انتہائی رقت انگیز انداز میں بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتے ہیں: «يَا رَبِّ ارْحَمْ ضَعْفَ بَدَنِي، وَرِقَّةَ جِلْدِي، وَدِقَّةَ عَظْمِي... وَهَذَا مَا لَا تَقُومُ لَهُ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ» "اے میرے رب! میرے کمزور بدن، میری پتلی کھال اور میری باریک ہڈیوں پر رحم فرما... اور (تیرے عذاب کی شدت) تو وہ ہے جسے آسمان اور زمین بھی برداشت نہیں کرسکتے"[3]۔

---

[1] حسن مصطفوی، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، جلد ۵، صفحہ ۸۵۔

[2] سید رضی، نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۸۔

[3] شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، دعائے کمیل۔

یہ فقرہ دراصل ترکِ گناہ کی دعا ہے۔ ماہِ رمضان، جس میں شیاطین قید کر دیے جاتے ہیں، اللہ کے غضب کے اسباب سے بچ کر اس کی رحمت کی آغوش میں آنے کا سب سے بہترین موقع ہے۔

۳. وَوَفِّقْنی فیهِ لِقِرآءَةِ آیاتِكَ

تلاوتِ قرآن کی توفیق اور باطنی تدبر

تیسرا تقاضا رمضان کے سب سے اہم اور مرکزی عمل کے بارے میں ہے: "اور مجھے اس میں اپنی آیات (قرآن) پڑھنے کی توفیق عطا فرما"۔ رمضان المبارک اور قرآن مجید کا آپس میں بہت گہرا ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رمضان کا تعارف ہی قرآن کے نزول کے حوالے سے کروایا ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ﴾ "رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، جو لوگوں کے لئے سراسر ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کی واضح نشانیاں ہیں"[1]۔ یہاں ایک بہت اہم بات قابلِ غور ہے۔ قرآنِ مجید تو ہر مسلمان کے گھر میں موجود ہے، اسے کھول کر پڑھنا بظاہر کوئی مشکل کام نہیں، تو پھر اس کے لیے "توفیق" (وَفِّقْنی) کیوں مانگی جا رہی ہے؟ علمِ اخلاق کی روشنی میں توفیق کا مطلب صرف کام کا آسان ہونا نہیں، بلکہ اسباب کا اس طرح مہیا ہو جانا ہے کہ انسان کا دل اس نیک کام کی طرف مائل ہو جائے اور تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں[2]۔ بہت سے لوگ دن بھر فارغ رہتے ہیں لیکن قرآن مجید کے دو صفحات پڑھنے کی انہیں "توفیق" نہیں ہوتی، کیونکہ قرآن محض ایک عام کتاب

---

[1] قرآن مجید، سورہ البقرہ، آیت ۱۸۵۔

[2] شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب معنی التوفیق، صفحہ ۲۴۲۔

نہیں، ربِ ذوالجلال کا کلام ہے۔ جب تک اللہ خود کسی بندے کو اپنے کلام سے ہم کلام ہونے کی اجازت نہ دے، بندہ اس کی آیات کی تلاوت کا شرف حاصل نہیں کر سکتا۔ رسولِ خدا ﷺ نے ماہِ رمضان کی آمد پر اپنے مشہور خطبہ شعبانیہ میں اس مہینے میں تلاوتِ قرآن کی بے پناہ فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا: «وَمَنْ تَلَا فِيهِ آيَةً مِنَ الْقُرْآنِ كَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِ مَنْ خَتَمَ الْقُرْآنَ فِي غَيْرِهِ مِنَ الشُّهُورِ» "جو شخص اس مہینے میں قرآن مجید کی ایک آیت کی تلاوت کرے گا، اسے اتنا ثواب ملے گا جتنا دوسرے مہینوں میں پورا قرآن ختم کرنے کا ملتا ہے"[۱]۔ دعا میں "آیات" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ آیت کا مطلب ہوتا ہے "نشان"۔ تلاوت کا مطلب صرف الفاظ کو دہرا دینا نہیں، بلکہ ان آیات میں غور و فکر (تدبر) کرنا اور انہیں اپنی عملی زندگی کا حصہ بنانا ہے، جیسا کہ قرآنِ پاک خود مطالبہ کرتا ہے: ﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾ "تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟"[۲]۔

٤. بِرَحْمَتِكَ يا اَرْحَمَ الرّاحِمينَ

رحمتِ الٰہی کا واسطہ اور کامل بھروسہ

دعا کا اختتام ایک نہایت ہی پر امید اور دلربا واسطے پر ہوتا ہے: "اپنی رحمت کے صدقے، اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے"۔ بندہ جانتا ہے کہ نہ تو اس کے اندر اتنی طاقت ہے کہ وہ خود بخود اللہ کی رضا حاصل کر سکے، نہ ہی اس میں یہ قدرت ہے کہ وہ اپنے بل بوتے پر گناہوں اور قہرِ الٰہی سے بچ

---

[۱] شیخ صدوق، فضائل الاشہر الثلاثۃ، صفحہ ۷۷۔

[۲] قرآن مجید، سورہ محمد، آیت ۲۴۔

سکے، اور نہ ہی اسے اپنے ارادے پر اتنا بھروسہ ہے کہ وہ بغیر توفیقِ الٰہی تلاوتِ قرآن کا حق ادا کر سکے۔ یہ سب منازل صرف اور صرف ایک ہی صورت میں طے ہو سکتی ہیں، اور وہ ہے اللہ کی بے پایاں رحمت کا شاملِ حال ہونا۔ خدا کی رحمت اس کا وہ عظیم وصف ہے جس نے اس کے غضب کو ڈھانپ رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود قرآن مجید میں اعلان فرماتا ہے: ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ "اور میری رحمت ہر چیز پر محیط ہے"[1]۔ بندہ اس دعا کے آخر میں اپنے اعمال کے بجائے، اللہ کی اس صفت کو پکارتا ہے جو سب سے بڑی ہے: یعنی "ارحم الراحمین" ہونا۔ وہ عرض کرتا ہے کہ اے اللہ، میں اس قابل تو نہیں کہ مجھے اپنی رضا کے قریب کرے یا مجھے قرآن کی سمجھ دے، لیکن تیرا رحم سب سے بڑھ کر ہے، پس تو میری نااہلی کو نہ دیکھ، بلکہ اپنے رحم و کرم کو دیکھتے ہوئے میری ان التجاؤں کو شرفِ قبولیت بخش دے اور میرے اس ماہِ صیام کو اپنی رحمت کے سائے میں محفوظ فرما لے۔

خلاصہ

ماہِ رمضان کے دوسرے دن کی دعا در حقیقت پہلے دن کی روحانی بیداری کے بعد، سالک کے لیے سمت اور منزل کا تعین کرتی ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے: **رضائے الٰہی اور قرب کا حصول:** دعا کے آغاز میں اللہ کے قرب کی التجا کی گئی ہے، جس سے مراد کوئی مکانی فاصلہ طے کرنا نہیں بلکہ روحانی اور اخلاقی قرب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اس قرب کا حتمی مقصد اللہ کی رضا کا حصول ہے، جس کی عظیم الشان مثالیں شبِ ہجرت

---

[1] قرآن مجید، سورہ الاعراف، آیت ۱۵۶۔

امیر المومنین علی علیہ السلام کا عمل اور میدانِ کربلا میں امام حسین علیہ السلام کا تسلیم و رضا کا مظاہرہ ہیں۔ **قہرِ الٰہی سے پناہ کی التجا:** بندگی کا ایک لازمی پہلو اللہ کی ناراضگی (سخط) اور اس کے عذابوں (نقمات) سے بچنا ہے۔ چونکہ انسان کے گناہ اور سرکشی ہی اللہ کے غضب اور نعمتوں کے چھن جانے کا سبب بنتے ہیں، اور انسان کے کمزور و ناتواں وجود میں عذاب سہنے کی طاقت نہیں، اس لیے اس دعا میں گناہوں سے دوری اور قہرِ الٰہی سے پناہ مانگی گئی ہے۔ **تلاوتِ قرآن کی توفیق اور تدبر:** چونکہ ماہِ رمضان اور قرآن کا آپس میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے، اس لیے دعا میں محض تلاوت نہیں بلکہ اس کی 'توفیق' مانگی گئی ہے، جس کا مطلب دل کا اس نیک کام کی طرف مائل ہونا اور اسباب کا مہیا ہونا ہے۔ اس مبارک مہینے میں ایک آیت کی تلاوت کا ثواب پورا قرآن ختم کرنے کے برابر ہے، بشرطیکہ یہ تلاوت ظاہری الفاظ کے بجائے آیات میں غور و فکر (تدبر) کے ساتھ کی جائے۔ **رحمتِ خداوندی پر کامل بھروسہ:** چونکہ انسان اپنے محدود ارادے اور کمزور اعمال کے بل بوتے پر یہ تمام منازل طے نہیں کر سکتا، اس لیے دعا کا اختتام اللہ کی اس وسیع رحمت کے واسطے پر ہوتا ہے جو کائنات کی ہر شے پر محیط ہے۔

❖ دوسرے دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور بخشتی ہے کہ گناہوں اور غضبِ الٰہی کے اسباب سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے اور قرآنِ مجید کے ساتھ قلبی وابستگی پیدا کر کے ہی ہم خالق کی رضا حاصل کر سکتے ہیں، اور یہ تمام تر کامیابیاں محض پروردگار کی بے پایاں رحمت ہی سے ممکن ہیں۔

تیسرے دن کی دعا



﴿اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنی فیهِ الذِّهْنَ وَالتَّنْبیهَ، وَباعِدْنی فیهِ مِنَ السَّفاهَةِ وَالتَّمْويهِ، وَاجْعَلْ لی نَصیباً مِنْ كُلِّ خَيْر تُنْزِلُ فیهِ، بِجُودِكَ یا اَجْوَدَ الْاَجْوَدینَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں ہوشمندی اور بیداری عطا فرما، اور مجھے اس میں حماقت (بے وقوفی) اور باطل کو حق نما بنا کر پیش کرنے (فریب) سے دور رکھ، اور میرے لیے ہر اس خیر (بھلائی) میں سے ایک وافر حصہ قرار دے جو تو اس مہینے میں نازل فرمائے، اپنی سخاوت کے واسطے، اے سخاوت کرنے والوں میں سب سے بڑے سخی۔

تیسرا دن: طہارتِ افکار اور ذہنی بالیدگی

بندگی کے سفر میں محض جسمانی عبادات اور ظاہری روزے کی تکمیل کافی نہیں ہوتی، جب تک کہ اس کے ساتھ فکری طہارت اور ذہنی بالیدگی شامل نہ ہو۔ تیسرے دن کی دعا انسان کے ذہن اور سوچ کی جراحی کرتی ہے۔ یہ ہمیں بتاتی ہے کہ دنیوی خرافات، لایعنی افکار اور حماقتوں کے ہجوم میں گھرا ہوا ذہن کبھی بھی معرفت کا نور جذب کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اس دعا میں اللہ تعالیٰ سے جو ہوشمندی اور بیداری طلب کی گئی ہے، وہ دراصل اس شیطانی فریب سے بچنے کی ڈھال ہے جو باطل کو نہایت خوبصورت اور حق نما بنا کر پیش کرتا ہے۔ سالک اس دن پروردگار کی بارگاہ میں التجا کرتا ہے کہ اس کی سوچ کو ان تمام آلودگیوں سے پاک کر دیا جائے جو ابدی زندگی کے بجائے فانی دنیا کی محبت پیدا کرتی ہیں۔ انسان اللہ کی بارگاہ میں محض جزوی نعمتوں پر اکتفا نہ کرے، بلکہ اپنی فکری طہارت کے بعد آسمان سے نازل ہونے والے ہر خیر اور بھلائی میں سے اپنا وافر حصہ مانگے، اور اس کے لیے اپنے اعمال کے بجائے اللہ کی لامحدود سخاوت (جود) پر بھروسہ کرے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے تیسرے دن کی دعا انسان کی ذہنی اور فکری طہارت پر مرکوز ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ جسمانی روزے کے ساتھ ذہن کا بیدار ہونا اور سوچ کا فریب سے پاک ہونا انتہائی ضروری ہے۔ یہ دعا درحقیقت عقل کی بالیدگی، شیطانی ملمع سازی سے پناہ، اور اللہ کی لامحدود سخاوت پر کامل بھروسہ کرتے ہوئے، کائنات کے ہر نازل ہونے والے خیر میں سے وافر حصہ پانے کا ایک جامع روحانی اور فکری لائحہ عمل ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **فکری ہوشمندی اور بیداری:** ذہن کی تیزی اور باطنی بیداری کو سب سے بڑے 'رزق' کے طور پر مانگنا، تاکہ انسان روزے کی حقیقت اور قرآن کے اسرار کو سمجھ سکے۔ **حماقت اور فریبِ نفس سے دوری:** دنیا کی فانی لذتوں کے بدلے آخرت کا سودا کرنے والی بے وقوفی (سفاہت) اور گناہوں کو خوبصورت بنا کر پیش کرنے والے شیطانی دھوکے (تمویہ) سے پناہ کی التجا۔ **خیرِ کثیر کی طلب:** بارگاہِ الٰہی میں بلند ہمتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے محض کسی ایک نعمت کے بجائے، نازل ہونے والے "ہر خیر" (دنیوی و اخروی بھلائی) میں سے وافر حصے کا تقاضا۔ **جود و سخاوتِ الٰہی پر بھروسہ:** اپنے محدود اور ناتواں اعمال کے بجائے، اللہ کی صفتِ 'جود' (وہ لامحدود سخاوت جو مانگنے سے پہلے عطا کر دے) کو واسطہ بنانا۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

۱. اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنی فیهِ الذِّهْنَ وَالتَّنْبیهَ

فکری ہوشمندی اور باطنی بیداری کا رزق

دعا کا پہلا فقرہ انسان کے فکری اور ذہنی ارتقاء کی بنیاد ہے: "اے اللہ! مجھے اس مہینے میں ہوشمندی اور بیداری عطا فرما"۔

یہاں دو انتہائی اہم الفاظ استعمال ہوئے ہیں: "الذِّهْن" (ذہن/ہوشمندی) اور "التَّنْبیه" (بیداری/آگاہی)۔ عربی لغت میں "ذہن" سے مراد انسان کی وہ قوتِ حافظہ اور فکری صلاحیت ہے جس کے ذریعے وہ حقائق کو سمجھتا ہے، یاد رکھتا ہے اور ان میں غور و فکر کرتا ہے۔ جبکہ "تنبیہ" کا مطلب ہے کسی سوئے ہوئے شخص کو جگانا، خبردار کرنا اور غفلت کے پردے ہٹا کر اسے حقیقت سے آگاہ کر دینا۔

ماہِ رمضان میں جب انسان مسلسل روزہ رکھتا ہے تو بھوک اور پیاس کی وجہ سے بسا اوقات جسمانی کمزوری غالب آجاتی ہے اور انسان کا ذہن سست پڑنے لگتا ہے۔ ایسے میں بندہ اللہ سے التجا کرتا ہے کہ یارب! میرا جسم ضرور کمزور ہے، مگر میرے "ذہن" کو کُند نہ ہونے دینا۔ مجھے وہ روحانی تیزی اور ہوشمندی عطا کر جس کے ذریعے میں تیرے قرآن کی آیات کے پوشیدہ اسرار کو سمجھ سکوں۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ اسی ذہنی بیداری اور قلبی ہوشمندی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ﴾ "یقیناً اس

(قرآن کی باتوں) میں اس شخص کے لیے نصیحت ہے جس کے پاس (بیدار) دل ہو، یا وہ پوری توجہ اور ہوشمندی سے کان لگائے"[۱]۔

اس دعا میں "ذہن" اور "تنبیہ" کو ایک "رزق" کے طور پر مانگا گیا ہے (ارزقنی)۔ ہم عام طور پر رزق سے مراد صرف روٹی، کپڑا، مکان اور مال و دولت لیتے ہیں، جبکہ انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کی نگاہ میں سب سے بڑا رزق "عقل اور فہم" کا رزق ہے۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اپنے مایۂ ناز صحابی ہشام بن حکم کو عقل کی اہمیت بتاتے ہوئے فرماتے ہیں: «يَا هِشَامُ، إِنَّ لِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حُجَّتَيْنِ: حُجَّةً ظَاهِرَةً وَحُجَّةً بَاطِنَةً، فَأَمَّا الظَّاهِرَةُ فَالرُّسُلُ وَالْأَنْبِيَاءُ وَالْأَئِمَّةُ، وَأَمَّا الْبَاطِنَةُ فَالْعُقُولُ» "اے ہشام! بے شک لوگوں پر اللہ کی دو حجتیں ہیں: ایک ظاہری حجت اور ایک باطنی حجت۔ ظاہری حجت تو رسول، انبیاء اور ائمہ (علیہم السلام) ہیں، جبکہ باطنی حجت انسان کی عقلیں ہیں"[۲]۔

۲. وَباعِدْنی فیهِ مِنَ السَّفاهَةِ وَالتَّمْويهِ

حماقت اور فریبِ نفس سے دوری

دعا کا دوسرا اور انتہائی حساس فقرہ روحانی بیماریوں سے پناہ مانگنے کی عکاسی کرتا ہے: "اور مجھے اس میں حماقت (بے وقوفی) اور باطل کو حق نما بنا کر پیش کرنے (فریب) سے دور رکھ"۔

---

[۱] قرآن مجید، سورہ ق، آیت ۳۷۔
[۲] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۱، صفحہ ۱۶۔

الف) السَّفاهَة **(حماقت اور کم عقلی):** عربی زبان میں "سفاہت" کا مطلب ہے عقل کا کمزور ہونا، ہلکا پن، غیر سنجیدگی اور اپنے نفع و نقصان کی تمیز نہ ہونا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے سب سے بڑا بیوقوف وہ شخص نہیں جسے دنیا کے حساب کتاب نہ آتے ہوں، بلکہ سب سے بڑا بیوقوف (سفیہ) وہ ہے جو دنیا کی چند روزہ فانی لذتوں کے بدلے اپنی ابدی آخرت کا سودا کر لے۔ قرآنِ مجید واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ جو شخص اللہ کے بتائے ہوئے راستے سے منہ موڑتا ہے، وہ دراصل اپنی ذات کو بیوقوف بناتا ہے: ﴿وَمَن يَرْغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُ﴾ "اور کون ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے دین سے روگردانی کرے، سوائے اس شخص کے جس نے خود کو حماقت (بیوقوفی) میں مبتلا کر لیا ہو"[1]۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام حماقت کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «أَغْنَى الْغِنَى الْعَقْلُ، وَأَكْبَرُ الْفَقْرِ الْحُمْقُ» "سب سے بڑی تونگری (مالداری) عقل ہے، اور سب سے بڑی محتاجی (مفلسی) حماقت ہے"[2]۔

ب) التَّمْويه **(فریب اور ملمع سازی):**

"تمویہ" کا مطلب ہے باطل کو اس قدر سجا کر اور خوبصورت بنا کر پیش کرنا کہ وہ حق نظر آنے لگے۔ شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار یہی "تمویہ" (فریب) ہے۔ وہ گناہ کو کبھی اس کی اصل بھیانک شکل میں پیش نہیں کرتا، بلکہ اسے دلفریب غلاف میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے۔ قرآنِ مجید شیطان کے اس فریب کے بارے میں فرماتا ہے: ﴿قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ

---

[1] قرآن مجید، سورہ البقرہ، آیت ۱۳۰۔

[2] سید رضی، نہج البلاغہ، حکمت ۳۸۔

وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ﴿﴾ "اس (شیطان) نے کہا: اے میرے رب! چونکہ تونے مجھے گمراہ کیا ہے، تواب میں بھی زمین میں ان کے لیے (گناہوں کو) خوب مزین (خوبصورت) کر کے پیش کروں گا اور ان سب کو گمراہ کروں گا"[۱]۔

تیسرے دن کی دعا میں "باعدنی" کے ذریعے ہم اللہ سے التجاء کر رہے ہیں کہ اے رب! میرے دل کی آنکھوں کو اتنا روشن کر دے کہ میں شیطان کی ملمع سازی کو پہچان سکوں اور دھوکے کا شکار نہ ہوں۔

۳. وَاجْعَلْ لی نَصیباً مِنْ کُلِّ خَیْر تُنْزِلُ فیهِ

ہر خیر اور رحمت میں وافر حصے کی طلب

تیسرا تقاضا مومن کی بلند ہمتی اور دعاؤں کی وسعت کو ظاہر کرتا ہے: "اور میرے لیے ہر اس خیر (بھلائی) میں سے ایک وافر حصہ قرار دے جو تو اس مہینے میں نازل فرمائے"۔

یہاں ایک بہت ہی لطیف اور عرفانی نکتہ ہے۔ بندہ اللہ سے محض "کچھ" خیر یا کسی ایک خاص نعمت کا سوال نہیں کر رہا، بلکہ وہ "مِنْ کُلِّ خَیْر" (ہر خیر میں سے) حصے کی طلب کر رہا ہے۔ لفظ "خیر" اسلام کی ایک انتہائی جامع اصطلاح ہے۔ اس میں دنیا کی عافیت، رزقِ حلال، صحت، اولاد کی نیک نامی سے لے کر آخرت کی مغفرت، شبِ قدر کا ادراک، قرآن فہمی، اور محمد و آلِ محمد علیہم السلام کی شفاعت تک سب کچھ شامل ہے۔

---

[۱] قرآن مجید، سورہ الحجر، آیت ۳۹۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ ان عظیم انسانوں کے بارے میں فرماتا ہے جنہیں اس خیرِ کثیر کا حصہ ملتا ہے: ﴿وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ﴾ "اور یہ (اعلیٰ مقام) نہیں دیا جاتا مگر انہیں جو صبر کرتے ہیں، اور یہ نہیں دیا جاتا مگر اسے جو (خیر کا) بہت بڑا حصہ (نصیب) رکھنے والا ہو"[۱]۔

سید الساجدین امام زین العابدین علیہ السلام ماہِ رمضان کی آمد پر اپنی مشہور دعا میں اللہ کی بارگاہ میں اسی خیرِ کثیر کی التجا کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «اللَّهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْ أَوْفَرِ عِبَادِكَ نَصِيباً مِنْ كُلِّ خَيْرٍ تُنْزِلُهُ فِي هَذَا الشَّهْرِ» "اے اللہ! ہمیں اپنے ان بندوں میں سے قرار دے جن کا اس ہر خیر میں سے سب سے زیادہ (وافر) حصہ ہو جو تو اس مہینے میں نازل فرماتا ہے"[۲]۔

اس فقرے سے ہمیں یہ عظیم سبق ملتا ہے کہ جب اللہ کے دربار میں ہاتھ پھیلاؤ، تو اپنی ظرفیت کو نہ دیکھو بلکہ اس کے لامحدود خزانوں کو دیکھ کر مانگو۔

٤. بِجُودِكَ يا اَجْوَدَ الْاَجْوَدِينَ

جود و سخاوت، بارگاہِ صمدیت کا عظیم دروازہ

دعا کا حتمی اختتام اللہ کی صفتِ جود (لامحدود سخاوت) کے نہایت خوبصورت واسطے پر ہوتا ہے: "اپنی سخاوت کے واسطے، اے سخاوت کرنے والوں میں سب سے بڑے سخی"۔

---

[۱] قرآن مجید، سورہ فصلت، آیت ۳۵۔

[۲] علی ابن الحسین (علیہ السلام)، صحیفہ سجادیہ، دعا ۴۴۔

علمِ کلام اور اسماء الحسنیٰ کی بحث میں "کرم" اور "جود" کے درمیان ایک انتہائی باریک فرق ہے۔ "کریم" وہ ہوتا ہے جو مانگنے پر بہت زیادہ عطا کرے، لیکن "جواد" وہ ہوتا ہے جو سائل کی ضرورت کو جان کر، اس کے مانگنے سے پہلے ہی اسے عطا کر دے۔ جب بندے نے پچھلے فقرے میں اللہ سے "ہر خیر" کا حصہ مانگا، تو یہ ایک بہت بڑا مطالبہ تھا۔ انسان کا اپنا عمل اتنا معمولی ہے کہ وہ اس کی بنیاد پر اللہ سے اس قدر عظیم خیر کا تقاضا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا، وہ فوراً اپنے عمل کے بجائے اللہ کی صفتِ جود کا سہارا لیتا ہے۔ ماہِ رجب کی مشہور اور متواتر دعا میں ہم اللہ کی اسی صفتِ جود کی گواہی دیتے ہیں: «يَا مَنْ يُعْطِي مَنْ لَمْ يَسْأَلْهُ وَمَنْ لَمْ يَعْرِفْهُ تَحَنُّناً مِنْهُ وَرَحْمَةً» "اے وہ جو اسے بھی عطا کر دیتا ہے جس نے اس سے کچھ نہیں مانگا، اور جو اسے جانتا تک نہیں، (یہ سب عطا کرنا) اس کی طرف سے محض شفقت اور رحمت کی بنا پر ہے"[1]۔

تیسرے دن کی یہ دعا اپنے اختتام پر انسان کے دل کو ایک لامتناہی سکون اور امید سے بھر دیتی ہے۔ جب بندہ سچے دل سے اللہ کی سخاوت کو پکارتا ہے، تو اللہ اپنے فضل و جود سے اس کی جھولی کو ایسی ذہنی بیداری، فکری طہارت اور خیرِ کثیر سے بھر دیتا ہے کہ اس کا باقی ماندہ ماہِ رمضان ایک حقیقی عاشقِ خدا کی طرح گزرتا ہے۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے تیسرے دن کی دعا در حقیقت روحانی منازل طے کرنے کے لیے ذہنی صلاحیت، فکری طہارت اور بصیرت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات

[1] شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، اعمال ماہِ رجب۔

پر مشتمل ہے: **ہوشمندی اور آگاہی کا رزق:** دعا کے آغاز میں ذہن کی بیداری اور ہوشمندی کو اللہ سے رزق کے طور پر مانگا گیا ہے۔ جسمانی کمزوری کے باوجود روحانی تیزی کی طلب کی گئی ہے تاکہ انسان دین کی باطنی حجت (یعنی عقل) کو استعمال کرتے ہوئے حقائق کا گہرا ادراک کر سکے۔ **فکری بیماریوں سے پناہ:** بندگی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ حماقت اور فریب ہے۔ دعا میں اس بے وقوفی سے پناہ مانگی گئی ہے جو انسان کو ابدی زندگی کے بجائے چند روزہ دنیا میں الجھا دے۔ اس کے ساتھ ہی، شیطان کی اس ملمع سازی سے بچنے کی التجا کی گئی ہے جو باطل کو حق نما بنا کر پیش کرتی ہے اور انسان کو دھوکے میں مبتلا رکھتی ہے۔ **رحمتوں کے نزول میں وافر حصہ:** ایک سچے مؤمن کی نگاہ بہت وسیع اور ہمت نہایت بلند ہوتی ہے۔ وہ اس مبارک مہینے میں اللہ سے محض دنیوی نعمتیں نہیں مانگتا، بلکہ دنیا کی عافیت سے لے کر آخرت کی مغفرت اور شبِ قدر کے ادراک تک، ہر اس بھلائی (خیر) میں سے اپنا وافر حصہ طلب کرتا ہے جو آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ **بارگاہِ صمدیت کی لامحدود سخاوت:** چونکہ انسان کا اپنا عمل اس قدر عظیم نہیں کہ وہ ہر خیر کا حقدار بن سکے، اس لیے دعا کا اختتام اللہ کی صفتِ 'جود' پر ہوتا ہے۔ یہ اس عظیم اور لامحدود سخاوت کا اقرار ہے جو بندے کی اہلیت کو نہیں دیکھتی بلکہ اپنی رحمت کے طفیل بن مانگے ہی جھولیاں بھر دیتی ہے۔ رمضان المبارک کے تیسرے دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ جب تک ہمارا ذہن بیدار اور سوچ فریب سے پاک نہیں ہوگی، ہم معرفت کا نور جذب نہیں کر سکتے۔ جب ہم فکری طہارت کے ساتھ اللہ کی سخاوت کو پکارتے ہیں، تو وہ اپنے فضل سے ہمیں ہر خیر سے مالا مال کر دیتا ہے۔

چوتھے دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ قَوِّنِي فِيهِ عَلَى إِقَامَةِ أَمْرِكَ، وَأَذِقْنِي فِيهِ حَلَاوَةَ ذِكْرِكَ، وَأَوْزِعْنِي فِيهِ لِأَدَاءِ شُكْرِكَ بِكَرَمِكَ، وَاحْفَظْنِي فِيهِ بِحِفْظِكَ وَسِتْرِكَ، يَا أَبْصَرَ النَّاظِرِينَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں اپنے حکم کے قیام (بجالانے) پر قوت عطا فرما، اور مجھے اس میں اپنے ذکر کی مٹھاس چکھادے، اور مجھے اس میں اپنے کرم کے طفیل اپنے شکر کی ادائیگی کا الہام (توفیق) فرما، اور مجھے اس میں اپنی حفاظت اور پردہ پوشی کے ذریعے محفوظ رکھ، اے دیکھنے والوں میں سب سے زیادہ دیکھنے والے۔

چوتھا دن: قوتِ اطاعت اور حلاوتِ ذکر

جب فکری طہارت حاصل ہو جائے اور راستے کی منازل واضح ہو جائیں، تو شریعت کے کڑے احکامات پر عمل پیرا ہونے کے لیے ایک خاص قسم کی استقامت درکار ہوتی ہے۔ چوتھے دن کی دعا اس غلط فہمی کو دور کرتی ہے کہ احکامِ الٰہی کی بجاآوری کے لیے بازوؤں کی جسمانی طاقت درکار ہے۔ روزہ دار بھوک اور پیاس کی حالت میں جس "قوت" کی التجا کرتا ہے، وہ دراصل روح کی وہ ملکوتی طاقت اور ارادے کی وہ پختگی ہے جو نفسِ امارہ کی ہر مزاحمت کو کچل دیتی ہے۔ اس دعا کا سب سے خوبصورت اور عرفانی پہلو ذکرِ الٰہی کی "حلاوت" (مٹھاس) کا حصول ہے۔ جس طرح ایک بیمار انسان کو خالص شہد بھی کڑوا محسوس ہوتا ہے، اسی طرح گناہوں سے بیمار روح کو عبادت ایک بوجھ لگتی ہے۔ یہ مناجات در حقیقت روح کے ذائقے کی بحالی کی التجا ہے تاکہ عبادت کی مشقت، تھکاوٹ کے بجائے دل کے اطمینان اور راحت کا باعث بن جائے۔ یہ دن ہمیں سکھاتا ہے کہ جب دل پر ذکر کی لذت طاری ہو جائے، تو بندہ اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت کا عملی شکر ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اس کی پردہ پوشی کے مضبوط حصار میں آ جاتا ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے چوتھے دن کی دعا انسان کو بندگی کے کٹھن راستے پر استقامت اور طمانیت عطا کرتی ہے۔ یہ مناجات ظاہری جسمانی کمزوری کے برعکس ملکوتی قوت، عبادت کی لذت، عملی شکر کے شعور اور پروردگار کی پردہ پوشی کی طلب پر مبنی ہے۔ یہ دعا دراصل نفسِ امارہ کی مزاحمت کو توڑ کر شریعت کے احکامات پر راضی ہونے اور ذکرِ الٰہی کی مٹھاس سے قلبی سکون پانے کا ایک خوبصورت روحانی زادِ راہ ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **احکامِ الٰہی کی اقامت کے لیے قوت:** جسمانی طاقت کے بجائے ارادے کی پختگی اور وہ باطنی قوت مانگنا جس کے ذریعے نفس کو زیر کر کے احکامِ الٰہی پر عمل آسان ہو جائے۔
- **ذکرِ خدا کی حلاوت:** روح کی بیماریوں اور گناہوں کی آلودگی سے نجات پا کر عبادت اور ذکرِ الٰہی میں وہ مٹھاس اور لذت محسوس کرنا جو ایک محب کو محبوب کی یاد میں ملتی ہے۔
- **حقیقی اور عملی شکر کا الہام:** محض زبان سے شکر ادا کرنے کے بجائے، باطنی توفیق کے ذریعے اللہ کی دی گئی نعمتوں کو ان کے درست مقاصد میں استعمال کرنا اور حرام سے بچنا۔
- **پردہ پوشی اور الٰہی حصار:** سب کچھ دیکھنے والے (ابصر الناظرین) رب سے یہ عاشقانہ التجا کرنا کہ وہ ہماری خطاؤں پر پردہ ڈالے اور ہمیں دنیا و آخرت کی رسوائی سے محفوظ رکھے۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

۱. قَوِّنِي فِيهِ عَلَى إِقَامَةِ أَمْرِكَ

احکامِ الٰہی کی اقامت اور حقیقی قوت کا سرچشمہ

دعا کا پہلا فقرہ بندگی کی راہ میں درکار طاقت اور استقامت کا تقاضا ہے: "اے اللہ! مجھے اس مہینے میں اپنے حکم کے قیام پر قوت عطا فرما"۔

یہاں بظاہر ایک تضاد نظر آتا ہے؛ ماہِ رمضان میں انسان صبح سے شام تک بھوکا اور پیاسا رہتا ہے، جس سے اس کا مادی اور جسمانی وجود کمزور پڑ جاتا ہے۔ لیکن عین اسی حالت میں وہ اللہ سے "قوت" (طاقت) مانگ رہا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ یہاں جس قوت کی طلب ہے، وہ بازوؤں کی جسمانی طاقت نہیں، بلکہ ارادے اور روح کی وہ طاقت ہے جو احکامِ الٰہی کو قائم (اقامۃ امرک) کرنے کے لیے درکار ہوتی ہے۔

جب انسان کا ارادہ اللہ کے ارادے میں فنا ہو جاتا ہے، تو اس کا کمزور جسم بھی وہ معجزات انجام دیتا ہے جو ظاہری اسباب سے بالاتر ہوتے ہیں۔ تاریخِ اسلام میں اس روحانی قوت کی سب سے عظیم اور ناقابلِ تردید مثال فاتحِ خیبر، امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ذاتِ گرامی ہے۔ آپؑ نے جنگِ خیبر میں اس بھاری دروازے کو اکھاڑ پھینکا جسے کئی طاقتور افراد مل کر بھی نہیں ہلا سکتے تھے۔ آپؑ نے اس روحانی قوت کے سرچشمے کو یوں بیان فرمایا: «وَاللَّهِ مَا قَلَعْتُ بَابَ خَيْبَرَ بِقُوَّةٍ جَسَدِيَّةٍ وَلَا حَرَكَةٍ غِذَائِيَّةٍ، وَلَكِنْ قُلِعْتُ بِقُوَّةٍ مَلَكِيَّةٍ وَنَفْسٍ بِلِقَاءِ رَبِّهَا

مُطْمَئِنَّةٍ» "خدا کی قسم! میں نے خیبر کے دروازے کو کسی جسمانی طاقت یا غذا سے حاصل ہونے والی قوت سے نہیں اکھاڑا، بلکہ اسے ایک ملکوتی قوت اور اس نفس کی طاقت سے اکھاڑا جو اپنے رب کی ملاقات پر مکمل اطمینان رکھتا ہے"[1]۔

روزے دار اس دعا کے ذریعے اللہ سے التجا کرتا ہے کہ اے رب! میرے نفسِ امارہ کی مزاحمت کو توڑ دے اور مجھے وہ ملکوتی قوت عطا کر کہ میں تیرے احکام (نماز، روزہ، انفاق، عدل) کو اپنی زندگی اور معاشرے میں بغیر کسی رکاوٹ کے قائم کر سکوں۔

۲. وَأَذِقْنِي فِيهِ حَلَاوَةَ ذِكْرِكَ

ذکرِ خدا کی حلاوت اور روح کا ذائقہ

دعا کا دوسرا تقاضا عبادت کی سب سے بڑی لذت سے متعلق ہے: "اور مجھے اس میں اپنے ذکر کی مٹھاس چکھا دے"۔

یہاں "حلاوت" (مٹھاس/لذت) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ایک بہت بڑا عرفانی اور نفسیاتی سوال یہ ہے کہ ہم گھنٹوں نمازیں پڑھتے ہیں، تسبیح پڑھتے ہیں، لیکن ہمیں اس میں وہ لذت کیوں محسوس نہیں ہوتی جو ایک عاشق کو اپنے محبوب سے گفتگو میں محسوس ہوتی ہے؟ اس کی بنیادی وجہ روح کی بیماری ہے۔ جس طرح ایک بیمار شخص، جسے شدید بخار ہو، اسے خالص شہد بھی کڑوا محسوس ہوتا ہے، حالانکہ شہد میں کڑواہٹ نہیں ہوتی بلکہ خرابی اس شخص کے ذائقے کی حس میں ہوتی ہے۔ بالکل

[1] شیخ صدوق، الآمالی، صفحہ ۵۱۴۔

اسی طرح، گناہوں کی کثرت، دنیا کی محبت اور غفلت نے ہماری روح کو بیمار کر دیا ہے جس کی وجہ سے ہم ذکرِ الٰہی کی مٹھاس کو محسوس نہیں کر پاتے۔

قرآنِ مجید قلب کے حقیقی اطمینان اور لذت کو صرف اللہ کے ذکر میں منحصر قرار دیتا ہے: ﴿أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ "آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان (اور سکون) نصیب ہوتا ہے"[۱]۔

امام زین العابدین علیہ السلام اپنی مناجات (مناجات الذاکرین) میں اللہ کی بارگاہ میں اسی حلاوت اور مٹھاس کے لیے گڑگڑاتے ہوئے عرض کرتے ہیں: «إِلَهِي فَأَلْهِمْنَا ذِكْرَكَ فِي الْخَلَاءِ وَالْمَلَاءِ، وَاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ... وَأَذِقْنَا حَلَاوَةَ ذِكْرِكَ» "اے میرے معبود! پس ہمیں تنہائی میں اور محفل میں، رات میں اور دن میں اپنے ذکر کا الہام فرما... اور ہمیں اپنے ذکر کی مٹھاس (لذت) چکھا دے"[۲]۔

جب انسان کو اس ذکر کی حلاوت مل جاتی ہے تو پھر مصلہ اس کے لیے بوجھ نہیں رہتا، بلکہ وہ اس کی پناہ گاہ اور سب سے بڑی تفریح بن جاتا ہے۔

---

[۱] قرآن مجید، سورہ الرعد، آیت ۲۸۔

[۲] شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، مناجات الذاکرین۔

۳. وَأَوْزِعْنِي فِيهِ لِأَدَاءِ شُكْرِكَ بِكَرَمِكَ

الہامِ شکر اور نعمتوں کا درست استعمال

تیسرا فقرہ انسان کے خالق کے سامنے احساسِ تشکر کو بیدار کرتا ہے: "اور مجھے اس میں اپنے کرم کے طفیل اپنے شکر کی ادائیگی کا الہام (توفیق) فرما"۔

دعا میں "أَوْزِعْنِي" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب صرف ظاہری توفیق نہیں، بلکہ دل میں کسی چیز کا شدت سے الہام کر دینا اور اسے انسان کی فطرت کا حصہ بنا دینا ہے۔ قرآنِ پاک میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی اللہ سے شکر کی یہی باطنی کیفیت طلب کی تھی: ﴿رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ﴾ "اے میرے رب! مجھے الہام کر (توفیق دے) کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر انعام کی ہے"[1]۔

علمِ اخلاق کی نگاہ میں شکر صرف زبان سے "الحمدللہ" کہہ دینے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو محض زبان کا شکر ہے۔ حقیقی اور عملی شکر یہ ہے کہ اللہ نے جو نعمت جس مقصد کے لیے دی ہے، اسے اسی مقصد میں خرچ کیا جائے۔ آنکھ کا شکر یہ ہے کہ نامحرم کو نہ دیکھے، مال کا شکر یہ ہے کہ غریبوں پر خرچ ہو، اور علم کا شکر یہ ہے کہ اس سے معاشرے کی جہالت دور ہو۔

امام جعفر صادق علیہ السلام شکر کی انتہائی جامع اور عمیق تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «شُكْرُ النِّعْمَةِ اجْتِنَابُ الْمَحَارِمِ، وَتَمَامُ الشُّكْرِ قَوْلُ الرَّجُلِ: الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ

---

[1] قرآن مجید، سورہ النمل، آیت ۱۹۔

الْعَالَمِينَ» "نعمت کا (حقیقی) شکر یہ ہے کہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے بچا جائے، اور شکر کی تکمیل انسان کے اس قول سے ہوتی ہے کہ: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے"[1]۔

اس فقرے میں ہم اللہ کے "کرم" کا واسطہ دے کر اس کامل شکر کی ادائیگی کی باطنی توفیق مانگ رہے ہیں۔

٤. وَاحْفَظْنِي فِيهِ بِحِفْظِكَ وَسِتْرِكَ، يَا أَبْصَرَ النَّاظِرِينَ

پردہ پوشی، الٰہی حصار اور بیناترین ذات

دعا کا اختتام انسان کے رازوں اور عیوب کی حفاظت کی التجا پر ہوتا ہے: "اور مجھے اس میں اپنی حفاظت اور پردہ پوشی کے ذریعے محفوظ رکھ، اے دیکھنے والوں میں سب سے زیادہ دیکھنے والے"۔

یہ فقرہ ایک عجیب عاشقانہ تضاد اور حسنِ بندگی پر مشتمل ہے۔ ہم اس ذات (اللہ) سے کہہ رہے ہیں جو "يَا أَبْصَرَ النَّاظِرِينَ" (دیکھنے والوں میں سب سے زیادہ تیز اور گہری نگاہ رکھنے والا) ہے، کہ وہ ہم پر اپنا "ستر" (پردہ) ڈال دے۔ ہم دنیا والوں سے چھپ کر بند کمروں اور تاریکیوں میں گناہ کرتے ہیں تاکہ کوئی ہمیں نہ دیکھے، لیکن وہ ذات جو کائنات کے ذرے ذرے کو دیکھ رہی ہے، وہ ہمارے ان

---

[1] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۲، صفحہ ۹۵۔

گناہوں کو دیکھ کر بھی دنیا کے سامنے انہیں ظاہر نہیں کرتی اور ہماری عزت کا بھرم رکھتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت "ستار العیوب" (عیوب پر پردہ ڈالنے والا) انسان کے لیے سب سے بڑی پناہ گاہ ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام دعائے کمیل میں اللہ کی اسی پردہ پوشی پر گریہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں: «وَلَكِنَّكَ إِلَهِي حِلْمُكَ أَوْسَعُ، وَعَفْوُكَ أَعْظَمُ... وَكَمْ مِنْ قَبِيحٍ سَتَرْتَهُ» "لیکن اے میرے معبود! تیری بردباری بہت وسیع ہے اور تیری معافی بہت عظیم ہے... اور کتنے ہی برے کام تھے جن پر تو نے پردہ ڈال دیا"[1]۔

ماہِ رمضان میں جب انسان اپنے گناہوں سے توبہ کے لیے اللہ کی بارگاہ میں کھڑا ہوتا ہے، تو وہ اس التجا کے ساتھ اپنے دن کا آغاز کرتا ہے کہ اے رب! تو نے دنیا میں میری خطاؤں کو مخلوق سے چھپا کر میری عزت رکھی ہے، اس مہینے کی برکت سے مجھ پر ایسا الٰہی حصار (حفظ) قائم کر دے کہ میں دوبارہ ان گناہوں کی طرف نہ پلٹوں، اور میرے گناہوں کے داغ مکمل طور پر مٹا دے تاکہ روزِ قیامت بھی مجھے کسی کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے چوتھے دن کی دعا درحقیقت ذہنی بیداری اور منزل کے تعین کے بعد، احکامِ الٰہی پر عمل درآمد کے لیے روحانی زادِ راہ اور باطنی قوت اکٹھا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

---

[1] شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، دعائے کمیل۔

روحانی قوت اور احکامِ الٰہی کی بجا آوری: روزے کی حالت میں جسمانی کمزوری کے باوجود اللہ سے 'قوت' مانگنے کا مطلب بازوؤں کی طاقت نہیں، بلکہ ارادے کی وہ ملکوتی طاقت ہے جس کے ذریعے انسان اپنے نفسِ امارہ کی رکاوٹوں کو عبور کر کے اللہ کے احکامات کو اپنی زندگی میں مکمل طور پر نافذ کر سکے۔ **ذکرِ الٰہی کی حلاوت اور لذت:** دعا میں ذکر کی 'مٹھاس' چکھنے کی التجا کی گئی ہے۔ جس طرح بخار کے مریض کو خالص شہد بھی کڑوا لگتا ہے، اسی طرح گناہوں کی وجہ سے بیمار پڑ جانے والی روح کو عبادت بوجھ لگنے لگتی ہے۔ یہ دعا روح کی اس بیماری کے علاج کی التجا ہے تاکہ مصلہ اور عبادت گاہ بوجھ کے بجائے دلی سکون اور راحت کا باعث بن جائیں۔ **عملی شکر کی باطنی توفیق:** شکر محض زبان سے 'الحمدللہ' کہہ دینے کا نام نہیں، بلکہ حقیقی اور عملی شکر یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت کو اس کی رضا کے مطابق اور حرام کاموں سے بچتے ہوئے استعمال کیا جائے۔ دعا میں اللہ کے 'کرم' کے واسطے سے اسی کامل شکر کا الہام (باطنی توفیق) مانگا گیا ہے۔ **سب سے زیادہ دیکھنے والے کی پردہ پوشی:** دعا کا اختتام ایک انتہائی دلگداز مناجات پر ہوتا ہے۔ بندہ اس ذات سے جو ہر اندھیرے اور اجالے میں سب سے زیادہ دیکھنے والی (ابصر الناظرین) ہے، یہ التجا کرتا ہے کہ وہ اس کے عیوب پر اپنا پردہ (ستر) ڈال دے اور اسے آئندہ گناہوں اور رسوائی سے محفوظ (حفظ) رکھے۔

- رمضان المبارک کے چوتھے دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ جب انسان کے قلب پر اللہ کے ذکر کی حلاوت طاری ہو جاتی ہے اور اسے نعمتوں کے درست استعمال (شکر) کا سلیقہ آ جاتا ہے، تو شریعت کے مشکل ترین احکامات بھی اس کے لیے آسان ہو جاتے ہیں اور وہ پروردگار کی پردہ پوشی کے محفوظ الٰہی حصار میں آ جاتا ہے۔

پانچویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ اجْعَلْنِي فِيهِ مِنَ الْمُسْتَغْفِرِينَ، وَاجْعَلْنِي فِيهِ مِنْ عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ الْقَانِتِينَ، وَاجْعَلْنِي فِيهِ مِنْ أَوْلِيَائِكَ الْمُقَرَّبِينَ، بِرَأْفَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ﴾

اے اللہ! مجھے اس دن استغفار کرنے والوں (سچے دل سے بخشش مانگنے والوں) میں شامل کر دے، اور مجھے اس میں اپنے نیک اور فرمانبردار بندوں میں قرار دے، اور مجھے اس میں اپنے مقرب اولیاء (قریب کیے گئے دوستوں) میں سے قرار دے، اپنی شفقت و مہربانی کے واسطے، اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے۔

پانچواں دن: مقامِ استغفار اور قربِ مقربین

ماہِ رمضان کے ابتدائی دنوں میں بیداری اور طہارت کے بعد، پانچویں دن کی دعا انسان کو روحانی ارتقاء کی ان تین عظیم اور مرحلہ وار منازل سے گزارتی ہے جو اس کی کایا پلٹ دیتی ہیں۔ ان منازل کا آغاز "تخلیہ" (باطن کو گناہوں کی غلاظت سے پاک کرنے) سے ہوتا ہے، جس کے لیے محض زبان سے نہیں، بلکہ سچے دل اور پختہ ارادے کے ساتھ استغفار کیا جاتا ہے۔ جب توبہ کے آنسوؤں سے دل دھل جاتا ہے، تو دوسری منزل "تجلیہ" (نیکیوں اور فرمانبرداری سے آراستہ ہونے) کی آتی ہے، جہاں سالک عبادِ صالحین اور قانتین کی صف میں کھڑا ہونے کا اہل بنتا ہے۔ اور اس سفر کی حتمی منزل "قربت" ہے، جہاں انسان جنت کی طمع اور دوزخ کے خوف سے بالاتر ہو کر خالصتاً اللہ کی عظمت کے سامنے جھک جاتا ہے اور اس کے مقرب ترین دوستوں (اولیاء) میں شمار ہوتا ہے۔ یہ دعا ہمیں یہ عظیم شعور بخشتی ہے کہ ہمارا اپنا کوئی عمل ہمیں ان بلند ترین مقامات تک نہیں پہنچا سکتا، بلکہ یہ صرف اور صرف پروردگار کی "رأفت" (وہ خالص اور لطیف مہربانی جس میں سختی کا کوئی شائبہ نہ ہو) ہے جو ایک گنہگار کو اٹھا کر بندگی کی معراج تک لے جاتی ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے پانچویں دن کی دعا انسان کو روحانی ارتقاء کی تین عظیم اور مرحلہ وار منازل—تخلیہ (گناہوں سے پاکیزگی)، تجلیہ (نیکیوں سے آراستگی) اور قربت (خدا کی دوستی)—سے گزارتی ہے۔ یہ مناجات محض زبانی معافی کا نام نہیں، بلکہ سچے استغفار کے ذریعے اپنی ماہیت تبدیل کر کے،

ایک عام بندے سے ترقی پاتے ہوئے اللہ کے صالح اور مقرب ترین دوستوں (اولیاء) کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کی ایک پُر امید التجا ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **حقیقی استغفار کی طلب:** محض زبان سے توبہ کرنے کے بجائے، گناہوں پر سچی ندامت، حقوق العباد کی ادائیگی، اور برائی کی طرف نہ پلٹنے کے پختہ ارادے کے ساتھ بارگاہِ الٰہی سے بخشش کی التجا۔
- **صالحیت اور قنوت کا درجہ:** باطنی طہارت کے بعد اپنے ظاہر، باطن اور اعمال کو ہر طرح کے فساد سے پاک کر کے اللہ کے نیک اور انتہائی فرمانبردار (قانتین) بندوں کی صف میں کھڑا ہونے کی طلب۔
- **بندگی کی معراج اور قربِ مقربین:** جنت کی لالچ یا دوزخ کے خوف سے بالاتر ہو کر، خالصتاً اللہ کی عظمت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اس کے 'مقرب اولیاء' (قریب کیے گئے دوستوں) کا عظیم مرتبہ مانگنا۔
- **رأفتِ الٰہی کا واسطہ:** اپنے اعمال کی بے بضاعتی کا اعتراف کرتے ہوئے، ان کٹھن روحانی منازل کو طے کرنے کے لیے اللہ کی اس خالص اور لطیف ترین مہربانی (رأفت) پر مکمل بھروسہ کرنا جس میں سختی کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

۱. اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي فِيهِ مِنَ الْمُسْتَغْفِرِينَ

استغفار کی حقیقت، شرائط اور ثمرات

دعا کا پہلا فقرہ انسان کے باطنی تزکیے اور گناہوں کی آلودگی کو دھونے سے متعلق ہے: "اے اللہ! مجھے اس دن استغفار کرنے والوں میں شامل کر دے"۔

عربی زبان میں "غفر" کا مطلب ہے کسی چیز کو ڈھانپ لینا اور چھپا دینا۔ استغفار کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اللہ سے التجا کرتا ہے کہ وہ اس کے گناہوں کے داغ کو اپنی رحمت کی چادر سے ڈھانپ دے تاکہ وہ عذاب سے محفوظ رہ سکے۔ استغفار کوئی معمولی عمل نہیں، بلکہ یہ وہ کیمیا ہے جو انسان کی تقدیر بدل دیتا ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کثرت سے استغفار کرنے کے روحانی اور مادی ثمرات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: «مَنْ أَكْثَرَ الِاسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللَّهُ لَهُ مِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجاً، وَمِنْ كُلِّ ضِيقٍ مَخْرَجاً، وَرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ» "جو شخص کثرت سے استغفار کرتا ہے، اللہ اس کے لیے ہر غم و پریشانی سے کشادگی (نجات) پیدا کر دیتا ہے، ہر تنگی سے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے، اور اسے وہاں سے رزق عطا فرماتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا"[1]۔

یہاں یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ "رزق" کا مفہوم صرف مال و دولت یا روٹی تک محدود نہیں ہے۔ رزقِ معنوی مادی رزق سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ ایک اچھا، مخلص اور نیک دوست رزق ہے،

[1] شیخ صدوق، ثواب الاعمال و عقاب الاعمال، صفحہ ۱۶۵۔

زندگی کا ایک باوفا ہمسفر رزق ہے، اور عبادت میں ملنے والا سکون بھی رزق کی ہی ایک اعلیٰ قسم ہے۔

تاہم، استغفار کا مطلب صرف زبان سے "أَسْتَغْفِرُ اللَّهَ" کہہ دینا نہیں ہے۔ مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام میں استغفار کی شرائط انتہائی کڑی ہیں۔ ایک شخص امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور لاپرواہی سے زبان سے "استغفر اللہ" کہنے لگا۔ آپؑ نے اس کی اس غفلت پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: «ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ! أَ تَدْرِي مَا الِاسْتِغْفَارُ؟ الِاسْتِغْفَارُ دَرَجَةُ الْعِلِّيِّينَ، وَهُوَ اسْمٌ يَقَعُ عَلَى سِتَّةِ مَعَانٍ» "تیری ماں تیرے غم میں روئے! کیا تو جانتا بھی ہے کہ استغفار کیا ہے؟ استغفار 'علیین' (بلند ترین ہستیوں) کا درجہ ہے، اور یہ ایک ایسا نام ہے جو چھ شرائط (معانی) پر پورا اترتا ہے"[1]۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے حقیقی استغفار کی وہ چھ شرائط بیان فرمائیں جو انسان کے پورے وجود کو جھنجھوڑ دیتی ہیں:

اول: ماضی کے کیے گئے گناہوں پر سچی ندامت اور پچھتاوا۔ دوم: گناہ کی طرف دوبارہ کبھی نہ پلٹنے کا پختہ اور حتمی ارادہ۔ سوم: مخلوق (لوگوں) کے حقوق کی ادائیگی، تاکہ جب تو خدا سے ملے تو تیری گردن پر کسی انسان کا کوئی حق نہ ہو۔ چہارم: ہر اس فریضے (واجب) کی ادائیگی جسے تو نے ضائع کر دیا تھا (یعنی قضا نمازیں، روزے وغیرہ ادا کرنا)۔ پنجم: اس گوشت کو غم اور مشقت کے ذریعے پگھلانا جو حرام مال سے پروان چڑھا ہو، یہاں تک کہ جلد ہڈیوں سے جا ملے اور نیا گوشت پیدا ہو۔ ششم: اپنے جسم کو عبادت کی وہ مشقت چکھانا جس طرح تو نے اسے گناہ کی لذت چکھائی تھی۔

---

[1] سید رضی، نہج البلاغہ، حکمت ۴۱۷۔

امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب یہ چھ شرائط پوری ہو جائیں، تب تیرا زبان سے "استغفر اللہ" کہنا حقیقت بنے گا۔ پانچویں دن ہم اللہ سے یہی التجا کرتے ہیں کہ ہمیں ایسے حقیقی استغفار کرنے والوں میں شامل فرما۔

۲. وَاجْعَلْنِي فِيهِ مِنْ عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ الْقَانِتِينَ

صالحیت اور قنوت (فرمانبرداری) کا درجہ

دعا کا دوسرا مرحلہ باطنی طہارت کے بعد عمل کی پاکیزگی سے متعلق ہے: "اور مجھے اس میں اپنے نیک (صالح) اور فرمانبردار (قانتین) بندوں میں قرار دے"۔

جب استغفار کے پانی سے انسان کا دل دھل جاتا ہے، تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اسے "عبادِ صالحین" (نیک بندوں) کی صف میں کھڑا کیا جائے۔ "صالح" وہ ہوتا ہے جس کا ظاہر، باطن، نیت اور عمل ہر طرح کے فساد اور کھوٹ سے پاک ہو۔ اور "قانتین" (قنوت سے مشتق) کا مطلب ہے وہ لوگ جو انتہائی عاجزی، انکساری اور مسلسل طاعت کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔

قرآنِ مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسی اولو العزم ہستی بھی اللہ سے صالحین میں شامل ہونے کی التجا کرتی نظر آتی ہے: ﴿رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ﴾ "اے میرے رب! مجھے علم و حکمت عطا فرما اور مجھے نیکوکاروں (صالحین) کے ساتھ ملا دے"[1]۔

ہم جانتے ہیں کہ عبدِ صالح ہونا اور قنوت کا درجہ پانا ہماری محدود صلاحیتوں سے کہیں بلند ہے،

---

[1] قرآن مجید، سورہ الشعراء، آیت ۸۳۔

لیکن خدا کا دسترخوانِ کرم اتنا وسیع ہے کہ وہ اپنے خزانوں سے یہ عظیم مرتبے بھی مانگنے والوں کو عطا کر دیتا ہے، کیونکہ پروردگار خود فرمانبردار انسانوں کو پسند کرتا ہے اور اپنے صالح بندوں کے دائرے کو وسیع کرنے پر خوش ہوتا ہے۔

٣. وَاجْعَلْنِي فِيهِ مِنْ أَوْلِيَائِكَ الْمُقَرَّبِينَ

قربِ الٰہی اور بندگی کی معراج

تیسرا تقاضا اس سفر کی حتمی منزل اور بندگی کی معراج ہے: "اور مجھے اس میں اپنے مقرب اولیاء (قریب کیے گئے دوستوں) میں سے قرار دے"۔

بندگی کے سفر میں انسان پہلے "تائب" (استغفار کرنے والا) بنتا ہے، پھر "صالح اور قانت" (نیک اور فرمانبردار) بنتا ہے، اور جب اس کی فرمانبرداری کامل ہو جاتی ہے تو اللہ اسے اپنا "ولی" (دوست) اور "مقرب" (انتہائی قریب ترین رازدار) بنالیتا ہے۔ جسے یہ قربِ الٰہی نصیب ہو جائے، وہ اپنی زندگی کے کسی بھی لمحے میں یادِ خدا سے غافل نہیں ہوتا۔ اس کی عبادت میں پھر دوزخ کا ڈر یا جنت کا لالچ باقی نہیں رہتا، بلکہ اس کی بندگی خالصتاً اللہ کی عظمت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا نام بن جاتی ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام مقربین کی اسی خالص عبادت اور معرفتِ الٰہی کی ترجمانی کرتے ہوئے بارگاہِ صمدیت میں عرض کرتے ہیں: «إِلَهِي مَا عَبَدْتُكَ خَوْفاً مِنْ نَارِكَ، وَلَا طَمَعاً فِي جَنَّتِكَ، لَكِنْ وَجَدْتُكَ أَهْلًا لِلْعِبَادَةِ فَعَبَدْتُكَ» "اے میرے معبود! میں

نے تیری عبادت نہ تو تیری جہنم کے خوف سے کی ہے اور نہ ہی تیری بہشت کی لالچ میں کی ہے، بلکہ میں نے تجھے عبادت کے لائق پایا تو تیری بندگی کی"[1]۔

پانچویں دن کا یہ فقرہ انسان کو طمع اور خوف کی سطح سے نکال کر اس حقیقی بندگی کی طرف لے جاتا ہے جہاں مقربینِ الٰہی قیام پذیر ہوتے ہیں۔

٤. بِرَأْفَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ

رأفت اور رحمت کا پُر امید واسطہ

دعا کا اختتام ذاتِ باری تعالیٰ کی بے پایاں مہربانی کے واسطے پر ہوتا ہے: "اپنی شفقت و مہربانی کے واسطے، اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے"۔

"رأفت" کا مفہوم رحمت سے بھی زیادہ لطیف اور گہرا ہے۔ رحمت میں بسا اوقات انسان کی اصلاح کے لیے سختی یا تنبیہ کا پہلو بھی شامل ہو سکتا ہے، لیکن "رأفت" سراسر شفقت، نرمی اور خالص پیار کا نام ہے۔ انسان جانتا ہے کہ اس کا عمل اتنا ناقص ہے کہ وہ خود کو مستغفرین، صالحین اور مقربین کی صف میں کھڑا نہیں کر سکتا۔ یہ منازل بہت کٹھن اور دشوار گزار ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے عمل کی بے بضاعتی کو دیکھتے ہوئے اللہ کی اس مہربانی (رأفت) کو پکارتا ہے جو تمام جہانوں کو محیط ہے۔ وہ عرض کرتا ہے کہ اے ارحم الراحمین، اگرچہ میری کوئی حیثیت نہیں، لیکن تیری رأفت کا تقاضا یہی ہے کہ تو اس ماہِ مبارک کی برکت سے مجھے اپنے مقربین کی بارگاہ میں جگہ عطا فرما دے تاکہ میں ہمیشہ تیری اطاعت

---

[1] محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، جلد ۴۱، صفحہ ۱۴۔

کے سائے میں زندہ رہوں۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے پانچویں دن کی دعا درحقیقت انسان کو باطنی آلودگی سے نکال کر قربِ خداوندی کے بلند ترین قلعے میں داخل کرنے کا سفر ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

- **سچے استغفار کے شرائط اور ثمرات:** دعا کا آغاز 'مستغفرین' (سچے دل سے بخشش مانگنے والوں) میں شامل ہونے کی التجا سے ہوتا ہے۔ استغفار محض 'استغفر اللہ' کہہ دینے کا نام نہیں، بلکہ یہ 'علیین' (بلند ترین ہستیوں) کا درجہ ہے۔ اس کے لیے ماضی کے گناہوں پر کڑی ندامت، فرائض کی قضا، اور مخلوق کے حقوق کی ادائیگی شرط ہے۔ سچا استغفار انسان کے لیے ہر تنگی سے نکلنے کا راستہ اور بن مانگے رزقِ معنوی کے دروازے کھول دیتا ہے۔
- **عبادِ صالحین اور فرمانبرداروں کی صف:** جب استغفار سے دل دھل جاتا ہے، تو بندہ اللہ سے التجا کرتا ہے کہ اسے 'صالح' اور 'قانت' بندوں میں شامل کرلے۔ صالح وہ ہے جس کی نیت اور عمل کھوٹ سے پاک ہو، اور قانت وہ ہے جو انتہائی عاجزی کے ساتھ مسلسل طاعتِ الٰہی میں جھکا رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسی اولوالعزم ہستیوں نے بھی اسی صالحیت کی دعا مانگی تھی۔
- **مقرب اولیاء کا مقامِ قرب:** بندگی کا سفر استغفار سے شروع ہو کر صالحیت سے گزرتا ہوا 'ولایت' اور 'قرب' کی منزل پر پہنچتا ہے۔ اس دعا میں بلند ہمتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اللہ

کے ان مقرب اور قریب ترین دوستوں کا درجہ مانگا گیا ہے جن کی بندگی جنت کی طمع یا دوزخ کے خوف پر نہیں، بلکہ خالصتاً اللہ کو عبادت کے لائق سمجھنے پر استوار ہوتی ہے۔

- **ارحم الراحمین کی رأفتِ کاملہ:** چونکہ انسان کا اپنا عمل اس قدر ناقص ہے کہ وہ خود کو ان عظیم منازل کا حقدار نہیں سمجھتا، اس لیے دعا کا اختتام اللہ کی صفتِ 'رأفت' پر ہوتا ہے۔ رأفت، رحمت سے بھی زیادہ لطیف اور خالص پیار کا نام ہے۔ بندہ اسی مہربانی کو واسطہ بنا کر عرض کرتا ہے کہ اے رب، اپنے کرم سے مجھے اپنے مقربین کے سائے میں جگہ عطا فرما دے۔

❖ رمضان المبارک کے پانچویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ اگر انسان سچے استغفار کے ذریعے اپنے وجود کی جراحی کر لے اور خلوص کے ساتھ صالحیت کے راستے پر چل پڑے، تو پروردگار کی رأفت اسے ایک عام گنہگار سے اٹھا کر اپنے مقرب ترین دوستوں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔

چھٹے دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ لَا تَخْذُلْنِي فِيهِ لِتَعَرُّضِ مَعْصِيَتِكَ، وَلَا تَضْرِبْنِي بِسِيَاطِ نَقِمَتِكَ، وَزَحْزِحْنِي فِيهِ مِنْ مُوجِبَاتِ سَخَطِكَ، بِمَنِّكَ وَأَيَادِيكَ يَا مُنْتَهَى رَغْبَةِ الرَّاغِبِينَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں اپنی نافرمانی کے ارتکاب کی وجہ سے رسوا (اور بے یار و مددگار) نہ چھوڑنا، اور مجھے اپنے عذاب کے تازیانے (کوڑے) نہ مارنا، اور مجھے اس میں اپنی ناراضگی کے اسباب سے دور ہٹادے، اپنے احسان اور نعمتوں کے واسطے، اے رغبت کرنے والوں کی آخری آرزو۔

چھٹا دن: حصارِ عافیت اور غضبِ الٰہی سے پناہ

بندگی کے کٹھن سفر میں جہاں اللہ کی رحمت کی بے پناہ امید ضروری ہے، وہیں اپنے اعمال کی کوتاہیوں اور ان کے ہولناک نتائج کا خوف بھی کامل ایمان کا لازمی حصہ ہے۔ چھٹے دن کی دعا انسان کو بندگی کی سب سے بڑی اور خطرناک ترین سزا یعنی "خذلان" (بے یار و مددگار چھوٹ جانے) کے تصور سے لرزا دیتی ہے۔ یہ دعا ہمیں آگاہ کرتی ہے کہ سب سے بڑا عذاب آسمان سے بجلی گرنا نہیں، بلکہ اللہ کا انسان سے اپنی توفیق چھین کر اسے اس کے سرکش نفسِ امارہ کے حوالے کر دینا ہے۔ جب بندہ مسلسل گناہوں کے سبب پروردگار کی اعانت سے محروم ہو جاتا ہے، تو اس کی روح پر غضب کے باطنی تازیانے برستے ہیں، جن سے عبادت کی لذت چھن جاتی ہے اور دل پتھر ہو جاتا ہے۔ یہ مناجات دراصل انسان کے اسی عجز و انکسار کا اقرار ہے کہ وہ اپنی طاقت سے گناہوں کی شدید کشش سے نہیں بچ سکتا۔ لہٰذا، وہ انتہائی دردمندی سے اللہ کی طاقت کو پکارتا ہے کہ وہ اسے اپنی ناراضگی کے اسباب سے کوسوں دور کر دے اور اپنے خالص احسان اور کرم کی اس پناہ گاہ میں لے آئے جو ہر آرزومند کی آخری منزل ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے چھٹے دن کی دعا انسان کو اس کے اپنے اعمال کی ہولناکی اور ان کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرتی ہے۔ یہ مناجات سالک کو روحانی زوال، یعنی اللہ کی طرف سے بے یار و مددگار چھوڑ دیے جانے (خذلان) کے خوف سے خبردار کرتی ہے۔ اس کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ گناہ انسان کو قہرِ خداوندی کا نشانہ بناتے ہیں، لہٰذا بندہ انتہائی عاجزی کے ساتھ روحانی سزاؤں سے پناہ مانگتا ہے اور اپنے تحفظ کے لیے اللہ کے خالص احسان اور کرم کا مضبوط حصار طلب کرتا ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **خذلانِ الٰہی سے پناہ:** مسلسل گناہوں کے سبب اللہ کی مدد سے محروم ہو کر اپنے نفسِ امارہ کے حوالے ہو جانے جیسی بدترین روحانی سزا سے بچنے کی التجا۔ **قہر کے باطنی تازیانے:** جسمانی تکلیف کے بجائے روح پر برسنے والے غضب کے کوڑوں، جیسے عبادت کی لذت چھن جانے اور دل کے پتھر (سنگدل) ہو جانے سے ڈرنا۔ **اسبابِ غضب سے دوری:** گناہوں کی شدید کشش سے خود کو بچانے کے لیے پروردگار کی طاقت کے ذریعے ناراضگی کے اسباب سے کوسوں دور ہٹائے جانے کا تقاضا۔ **احسانِ پروردگار پر کامل توکل:** اپنی تمام تر خطاؤں کے باوجود مایوس ہونے کے بجائے، اللہ کے بے لوث کرم اور نعمتوں کو واسطہ بنا کر اسے اپنی آرزوؤں کی آخری منزل تسلیم کرنا۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

١. لَا تَخْذُلْنِي فِيهِ لِتَعَرُّضِ مَعْصِيَتِكَ

گناہ کی نحوست اور خذلانِ الٰہی (بے یار و مددگار چھوٹ جانا)

دعا کا پہلا فقرہ بندگی کی راہ میں ملنے والی سب سے بڑی سزا سے متعلق ہے: "اے اللہ! مجھے اس مہینے میں اپنی نافرمانی کے ارتکاب کی وجہ سے بے یار و مددگار نہ چھوڑنا"۔

یہاں ایک انتہائی عمیق قرآنی اور عرفانی اصطلاح "خِذْلَان" (لا تخذلنی) استعمال ہوئی ہے۔ عربی لغت میں "خذلان" کا مطلب ہے کسی ایسے شخص کی مدد سے ہاتھ کھینچ لینا جو آپ کی مدد کا شدت سے محتاج ہو، اور اسے اس کے اپنے حال پر تنہا چھوڑ دینا[1]۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے بڑی سزا یہ نہیں ہے کہ وہ انسان پر فوراً آسمانی بجلی گرا دے یا اس کا رزق چھین لے، بلکہ بدترین سزا یہ ہے کہ پروردگار انسان کو اس کے اپنے نفسِ امارہ کے حوالے کر دے اور اپنی خصوصی توفیق اور رہنمائی اس سے چھین لے۔ جب انسان جان بوجھ کر، مسلسل گناہوں کی طرف قدم بڑھاتا ہے (لِتَعَرُّضِ مَعْصِيَتِكَ)، تو وہ خود اللہ کی پناہ گاہ سے باہر نکل آتا ہے۔

قرآنِ مجید اس حقیقت کو ایک اٹل قانون کے طور پر بیان کرتا ہے کہ اگر اللہ مدد سے ہاتھ کھینچ

[1] راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، مادہ خ ذ ل۔

لے تو کائنات کی کوئی طاقت انسان کو سہارا نہیں دے سکتی: ﴿إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾ "اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا، اور اگر وہ تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ دے (خذلان کا شکار کر دے)، تو پھر اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے؟ اور مومنوں کو چاہیے کہ وہ صرف اللہ ہی پر توکل کریں"[1]۔

سید الساجدین امام زین العابدین علیہ السلام دعائے ابو حمزہ ثمالی میں اس خذلان کے اسباب کو روتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتے ہیں کہ اے اللہ! تو نے مجھے کیوں اپنے دروازے سے دور کر دیا؟ «أَوْ لَعَلَّكَ رَأَيْتَنِي آلِفَ مَجَالِسِ الْبَطَّالِينَ فَبَيْنِي وَبَيْنَهُمْ خَلَّيْتَنِي، أَوْ لَعَلَّكَ لَمْ تُحِبَّ أَنْ تَسْمَعَ دُعَائِي فَبَاعَدْتَنِي» "یا شاید تو نے مجھے اہل باطل کی محفلوں سے مانوس دیکھا تو مجھے انہی کے حال پر چھوڑ دیا (خذلان کا شکار کر دیا)، یا شاید تو نے میری دعا کی آواز سننا ہی پسند نہیں کیا اور مجھے اپنے در سے دور کر دیا"[2]۔

لہٰذا، چھٹے دن ہم التجا کرتے ہیں کہ یا رب! اگرچہ ہم گنہگار ہیں، لیکن ہمیں ہمارے حال پر تنہا نہ چھوڑنا، کیونکہ تیرے سائے کے بغیر ہم شیطان کا تر نوالہ بن جائیں گے۔

---

[1] قرآن مجید، سورہ آل عمران، آیت ١٦٠۔

[2] شیخ طوسی، مصباح المتہجد، صفحہ ٥٩٠۔

۲. وَلَا تَضْرِبْنِي بِسِيَاطِ نَقِمَتِكَ

قہرِ الٰہی کے تازیانے اور باطنی سزائیں

دعا کا دوسرا تقاضا انسان کی روح کو ہلا دینے والا ہے: "اور مجھے اپنے عذاب کے تازیانے (کوڑے) نہ مارنا"۔

لفظ "سِيَاط" (سوط کی جمع) کے معنی کوڑے یا تازیانے کے ہیں، اور "نَقِمَة" کا مطلب انتقام یا شدید قہر اور عذاب ہے۔ دنیوی عدالتوں میں مجرموں کو جسمانی کوڑے مارے جاتے ہیں جن کی تکلیف صرف کھال اور گوشت تک محدود رہتی ہے اور کچھ عرصے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اللہ کے قہر کے تازیانے جسم پر نہیں بلکہ انسان کی روح اور دل پر برستے ہیں۔

جب انسان اللہ کی نافرمانی کی حدوں کو پار کر لیتا ہے، تو اس پر باطنی کوڑے برسنا شروع ہو جاتے ہیں۔ عبادت کی لذت چھن جانا، دعا میں آنسوؤں کا خشک ہو جانا، اور دل کا پتھر (سنگدل) ہو جانا—یہ سب اللہ کے عذاب کے وہ تازیانے ہیں جو خاموشی سے برستے ہیں اور انسان کو احساس تک نہیں ہوتا۔

امام محمد باقر علیہ السلام ان باطنی تازیانوں کی حقیقت کو منکشف کرتے ہوئے ایک نہایت لرزہ خیز فرمان جاری کرتے ہیں: «إِنَّ لِلَّهِ عُقُوبَاتٍ فِي الْقُلُوبِ وَالْأَبْدَانِ: ضَنْكٌ فِي الْمَعِيشَةِ وَوَهْنٌ فِي الْعِبَادَةِ، وَمَا ضُرِبَ عَبْدٌ بِعُقُوبَةٍ أَعْظَمَ مِنْ قَسْوَةِ الْقَلْبِ» "یقیناً اللہ کی سزائیں دلوں اور جسموں دونوں پر نازل ہوتی ہیں: زندگی کی تنگی اور عبادت میں سستی کی صورت

میں، اور کسی بندے کو دل کے مردہ اور پتھر ہو جانے (سنگدلی) سے بڑھ کر کسی اور عذاب کا تازیانہ نہیں مارا گیا"[1]۔

پس اس دعا کے ذریعے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ اے خالق! ہمیں ان باطنی اور روحانی تازیانوں سے بچا لے جو ہماری روح کو ابدی موت سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔

٣. وَزَحْزِحْنِي فِيهِ مِنْ مُوجِبَاتِ سَخَطِكَ

اسبابِ غضب سے دوری اور روحانی نجات

تیسرا فقرہ اللہ کی ناراضگی کے اسباب سے کوسوں دور بھاگنے کی التجا ہے: "اور مجھے اس میں اپنی ناراضگی کے اسباب سے دور ہٹا دے"۔

"زَحْزَحَة" عربی زبان کا ایک بہت ہی بلیغ لفظ ہے۔ اس کا مطلب محض دور ہونا نہیں، بلکہ کسی بھاری چیز کو انتہائی مشقت اور زور لگا کر اپنی جگہ سے ہٹا دینا اور دور کر دینا ہے[2]۔ گناہوں اور نفسانی خواہشات کی کشش اتنی شدید اور بھاری ہوتی ہے کہ انسان کا اپنا ارادہ اسے ہٹانے کے لیے ناکافی ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اللہ کی طاقت کو پکارتا ہے (زَحْزِحْنِي) کہ اے اللہ! تو مجھے اپنی طاقت سے کھینچ کر ان جگہوں، ان محفلوں اور ان کاموں سے دور کر دے جو تیرے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔

قرآنِ مجید میں بھی دوزخ سے نجات کے لیے یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ دوزخ کی کشش

---

[1] حسن بن علی ابن شعبہ حرانی، تحف العقول، صفحہ ٢٩٦۔

[2] حسن مصطفوی، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، جلد ٤، صفحہ ٣١٥۔

سے بچنا اللہ کے فضل کے بغیر ناممکن ہے: ﴿فَمَن زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ "پس جو جہنم کی آگ سے (کھینچ کر) دور ہٹا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا، تو یقیناً وہی کامیاب ہوا"[1]۔

موجباتِ سخط (غضبِ الٰہی کے اسباب) میں ظلم، غرور، غیبت، یتیم کا مال کھانا، اور والدین کی نافرمانی جیسی روحانی بیماریاں شامل ہیں۔ ماہِ رمضان ان تمام اسباب سے دور ہٹنے (زحزحہ) کی سب سے عظیم اور بہترین مشق ہے۔

٤ . بِمَنِّكَ وَأَيَادِيكَ يَا مُنْتَهَى رَغْبَةِ الرَّاغِبِينَ

احسانِ پروردگار اور آرزوؤں کی آخری منزل

دعا کا حتمی اختتام اللہ کے وسیع فضل اور انسان کے اس پر مکمل توکل کے اعلان پر ہوتا ہے: "اپنے احسان اور نعمتوں کے واسطے، اے رغبت کرنے والوں کی آخری آرزو"۔

لفظ "مَنّ" کا مطلب ہے وہ خالص احسان جو بغیر کسی غرض یا بدلے کے کیا جائے، اور "أَيَادِي" (ید کی جمع) سے مراد اللہ کے وہ دستِ کرم اور نعمتیں ہیں جو مسلسل انسان پر سایہ فگن رہتی ہیں۔ بندہ بارگاہِ الٰہی میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے اور عذاب کے تازیانوں سے ڈرنے کے بعد، مایوس نہیں ہوتا، بلکہ اللہ کے لطف و احسان کی طرف پلٹتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگرچہ میں سزا کا مستحق ہوں، لیکن تیرا کرم میری خطاؤں سے بہت بلند ہے۔

---

[1] قرآن مجید، سورہ آل عمران، آیت ۱۸۵۔

اور دعا کے آخری کلمات "يَا مُنْتَهَى رَغْبَةِ الرَّاغِبِينَ" بندگی کی اس کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں جہاں دنیا کی ہر طلب ختم ہو کر صرف اللہ کی ذات باقی رہ جاتی ہے۔ انسان کی آرزوئیں محدود ہوتی ہیں، لیکن جب وہ لامحدود خدا سے لو لگاتا ہے تو خدا اس کی تمام رغبتوں کی آخری منزل (منتہٰی) بن جاتا ہے۔ سید الساجدین امام زین العابدین علیہ السلام مناجاتِ مفتقرین میں اسی خالص طلب کو یوں بیان فرماتے ہیں: «يَا غَايَةَ آمَالِ الْمُحِبِّينَ، وَيَا مُنْتَهَى مَطْلَبِ الطَّالِبِينَ، أَسْأَلُكَ قُرْبَكَ وَوُدَّكَ» "اے محبت کرنے والوں کی آرزوؤں کی آخری منزل، اور اے طلبگاروں کی جستجو کی انتہا! میں تجھ سے صرف تیرے قرب اور تیری محبت کا سوال کرتا ہوں"[1]۔

لہٰذا چھٹے دن ہم اللہ کی بارگاہ میں یہ عہد کرتے ہیں کہ اے کائنات کے خالق! ہمارے دلوں میں موجود ہر رغبت اور ہر آرزو کا اختتام صرف تیری ذات، تیری رضا اور تیری محبت پر ہی ہوتا ہے۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے چھٹے دن کی دعا در حقیقت بندگی کے سفر میں باطنی سزاؤں سے بچنے اور عافیت کا حصار طلب کرنے کا نام ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

- **بے یار و مددگار چھوٹ جانے کا خوف:** دعا کے آغاز میں 'خذلان' سے پناہ مانگی گئی ہے۔ خذلان کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس کے گناہوں کی وجہ سے تنہا چھوڑ دیا جائے اور اللہ اس سے اپنی توفیق چھین لے۔ یہ کائنات کی سب سے بڑی سزا ہے، کیونکہ رب کے

[1] شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، مناجات المفتقرین۔

سہارے کے بغیر انسان فوراً شیطانی قوتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

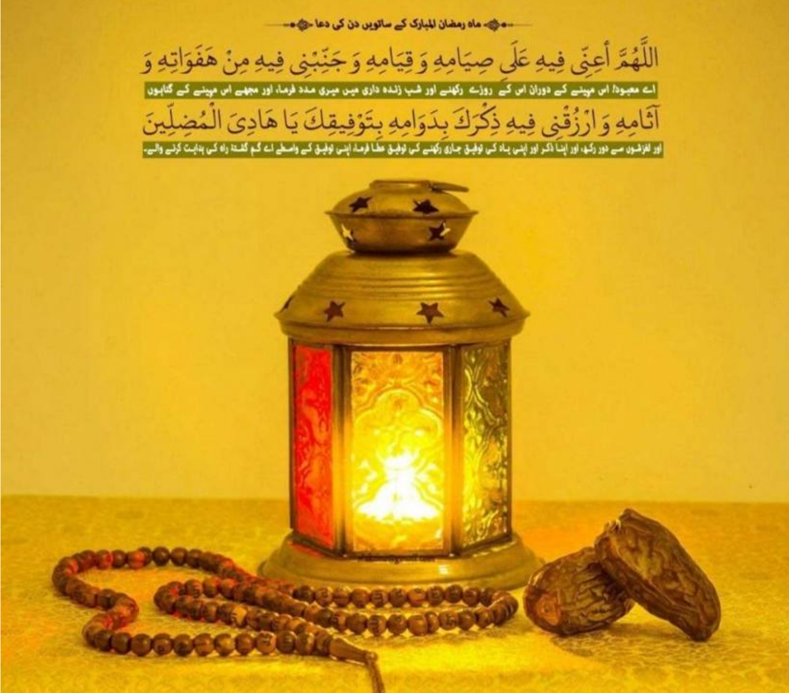
- **روحانی اور باطنی سزائیں:** اللہ کے عذاب کے تازیانے (کوڑے) صرف جسمانی نہیں ہوتے۔ جب بندہ نافرمانی کی حدوں کو پار کر لیتا ہے، تو اس پر باطنی کوڑے برستے ہیں جس سے دعا میں آنسو خشک ہو جاتے ہیں اور دل مردہ ہو جاتا ہے۔ یہ دعا دراصل روح کو ابدی موت سے بچانے کی ایک درد بھری پکار ہے۔

- **گناہوں کی کشش سے نجات:** گناہوں اور نفسانی خواہشات کا بوجھ اتنا بھاری ہوتا ہے کہ انسان کا اپنا ارادہ اسے ہٹانے کے لیے ناکافی ہوتا ہے۔ اسی لیے دعا میں 'زحزحہ' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب ہے کہ اے اللہ! تو اپنی لامحدود طاقت سے مجھے کھینچ کر ان محفلوں اور کاموں سے دور کر دے جو تیرے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔

- **آرزوؤں کی آخری منزل:** گناہوں کے اعتراف اور خوف کے بعد، بندہ مایوسی کا شکار نہیں ہوتا بلکہ پروردگار کے 'منّ' (بغیر غرض کے خالص احسان) کو پکارتا ہے۔ وہ اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ دنیا کی ہر طلب فانی ہے اور سچے طلبگاروں کی جستجو کی آخری منزل صرف اللہ کی ذات اور اس کی محبت ہے۔

❖ رمضان المبارک کے چھٹے دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ جب تک اللہ کی توفیق اور اس کا کرم شاملِ حال نہ ہو، ہم گناہوں کی کشش اور روحانی زوال سے نہیں بچ سکتے۔ لہٰذا اپنے نفس پر بھروسہ کرنے کے بجائے، پروردگار کے احسان کو اپنی پناہ گاہ بنانا ہی حقیقی کامیابی ہے۔

ساتویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ أَعِنِّي فِيهِ عَلَى صِيَامِهِ وَقِيَامِهِ، وَجَنِّبْنِي فِيهِ مِنْ هَفَوَاتِهِ وَآثَامِهِ، وَارْزُقْنِي فِيهِ ذِكْرَكَ بِدَوَامِهِ، بِتَوْفِيقِكَ يَا هَادِيَ الْمُضِلِّينَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں روزے رکھنے اور عبادت (قیام) کرنے پر مدد فرما، اور مجھے اس میں لغزشوں اور گناہوں سے بچائے رکھ، اور مجھے اس میں ہمیشہ اپنے ذکر کی توفیق (بطورِ رزق) عطا فرما، اپنی توفیق کے واسطے، اے بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھانے والے۔

ساتواں دن: اعانتِ پروردگار اور دوامِ ذکر

انسان کی سب سے بڑی بھول یہ ہے کہ وہ اپنی انجام دی گئی عبادات، روزے، اور شب بیداری کو اپنے مضبوط ارادے یا جسمانی طاقت کا کمال سمجھنے لگتا ہے۔ ساتویں دن کی دعا بندگی کے راستے میں حائل اس "شرکِ خفی" اور غرورِ نفس کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ یہ دن ہمیں سکھاتا ہے کہ جب تک پروردگار کی غیبی دستگیری اور اعانت شاملِ حال نہ ہو، کوئی انسان اپنی مرضی سے ایک سجدہ کرنے کی بھی استطاعت نہیں رکھتا۔ اس دعا میں سالک اپنی انا کو مکمل طور پر مٹا کر التجا کرتا ہے کہ اسے ارادی گناہوں کے ساتھ ساتھ ان غیر ارادی لغزشوں سے بھی محفوظ رکھا جائے جو روزے کی روحانیت کو مجروح کر دیتی ہیں۔ اس دعا کا سب سے بلند عرفانی مقام "دوامِ ذکر" کو روح کے رزق کے طور پر مانگنا ہے۔ یہ ہمیں احساس دلاتا ہے کہ جس طرح جسم خوراک کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح روح کی زندگی کا انحصار اس بات پر ہے کہ دل بازار میں ہو یا خلوت میں، ہر لمحہ اللہ کی یاد سے جڑا رہے۔ یہ دعا ناامیدی کے شکار انسانوں کو یہ پیغام دیتی ہے کہ اللہ وہ عظیم ہادی ہے جو بھٹکے ہوؤں کو بھی تنہا نہیں چھوڑتا۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے ساتویں دن کی دعا انسان کے غرورِ نفس کو توڑ کر اسے بندگی کی حقیقی معراج سے آشنا کرتی ہے۔ یہ مناجات سالک کو اس حقیقت کا ادراک کرواتی ہے کہ ظاہری عبادات (روزہ اور قیام) کی ادائیگی محض جسمانی طاقت یا ذاتی ارادے کا کمال نہیں، بلکہ یہ سراسر اللہ کی غیبی مدد

(اعانت) کی محتاج ہیں۔ یہ دعا بندگی میں خود انحصاری کی نفی کرتے ہوئے، ارادی گناہوں اور غیر ارادی لغزشوں سے تحفظ، اور ذکرِ الٰہی کو روح کی دائمی خوراک کے طور پر مانگنے کا ایک عظیم الشان نصاب ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **عبادات میں اعانتِ الٰہی کی طلب:** جسمانی کمزوریوں اور نفسانی رکاوٹوں پر قابو پا کر روزہ اور قیام مکمل کرنے کے لیے اپنی طاقت کے بجائے اللہ کی براہِ راست مدد مانگنا۔
- **لغزشوں اور گناہوں سے باطنی تحفظ:** جان بوجھ کر کیے جانے والے ارادی گناہوں (آثام) کے ساتھ ساتھ، روزے کی حالت میں غفلت کے سبب ہونے والی زبان یا نگاہ کی غیر ارادی لغزشوں (ہفوات) سے بھی پناہ مانگنا۔
- **دوامِ ذکر بطورِ رزق:** اللہ کی یاد کو محض مخصوص اوقات تک محدود رکھنے کے بجائے، چلتے پھرتے ہر حال میں ذکرِ الٰہی کو روح کی دائمی غذا (رزق) کے طور پر طلب کرنا۔
- **توفیقِ الٰہی اور بھٹکے ہوؤں کی رہنمائی:** اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود مایوس ہونے کے بجائے، اس پروردگار کی توفیق کا واسطہ دینا جو بھٹکے ہوئے اور گمراہ انسانوں کا ہاتھ تھام کر انہیں سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

۱. أَعِنِّي فِيهِ عَلَى صِيَامِهِ وَقِيَامِهِ

عبادت میں اعانتِ الٰہی اور توفیق کا فلسفہ

دعا کا پہلا فقرہ بندگی کے دوران پیش آنے والی دشواریوں میں اللہ کی مدد کی التجا ہے: "اے اللہ! میری اس مہینے کے روزے رکھنے اور عبادت (قیام) کرنے میں مدد فرما"۔

یہاں ایک بنیادی عقائدی اور عرفانی نکتہ پوشیدہ ہے۔ عام طور پر انسان یہ سمجھتا ہے کہ روزہ رکھنا یا رات کو جاگ کر نماز پڑھنا اس کا اپنا کمال ہے، اس کی اپنی جسمانی طاقت ہے یا اس کے مضبوط ارادے کا نتیجہ ہے۔ لیکن اسلام کا فلسفۂ بندگی اس سوچ کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ جب تک اللہ کی توفیق اور اس کی "اعانت" (مدد) شاملِ حال نہ ہو، کوئی بڑے سے بڑا پہلوان بھی گرمی کے طویل دن میں ایک روزہ مکمل نہیں کر سکتا، اور کوئی شب بیدار فجر کی دو رکعت ادا نہیں کر سکتا۔

قرآنِ مجید میں ہم ہر روز نماز میں یہی عہد دہراتے ہیں کہ عبادت کا دعویٰ اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب اس کے ساتھ اللہ کی مدد کی طلب شامل ہو: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ "ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں"[1]۔

یہاں "استعانت" (مدد مانگنا) دراصل عبادات کی ادائیگی میں درپیش آنے والی جسمانی اور

---

[1] قرآن مجید، سورہ الفاتحہ، آیت ۵۔

نفسانی رکاوٹوں پر قابو پانے کے لیے ہے۔ جب انسان بھوکا پیاسا ہوتا ہے، تو نفس اسے آرام اور غفلت کی طرف کھینچتا ہے۔ ایسے کڑے وقت میں بندہ التجا کرتا ہے کہ یا اللہ! تو نے روزہ فرض تو کر دیا ہے، لیکن اسے مکمل کرنے کی طاقت بھی تو ہی عطا فرما۔ سید الساجدین امام زین العابدین علیہ السلام عبادت میں اللہ کی اسی مدد کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں: «إِلَهِي لَوْ لَا تَوْفِيقُكَ ضَلَلْتُ، وَلَوْ لَا إِعَانَتُكَ لَمَا عَبَدْتُ» "اے میرے معبود! اگر تیری توفیق نہ ہوتی تو میں گمراہ ہو جاتا، اور اگر تیری مدد شامل نہ ہوتی تو میں ہرگز تیری عبادت نہ کر سکتا"[1]۔

ساتویں دن ہم "أَعِنِّي" کہہ کر اپنے اس عجز کا اقرار کرتے ہیں کہ پروردگار، ہماری تمام تر کوششوں کا دارومدار فقط تیری غیبی اعانت اور دستگیری پر ہے۔

۲. وَجَنِّبْنِي فِيهِ مِنْ هَفَوَاتِهِ وَآثَامِهِ

لغزشوں اور گناہوں کے مابین فرق اور باطنی تحفظ

دعا کا دوسرا فقرہ نفس کی پاکیزگی اور اعمال کی حفاظت کا ضامن ہے: "اور مجھے اس میں لغزشوں اور گناہوں سے بچائے رکھ"۔ اس فقرے میں دو انتہائی بلیغ اور باریک الفاظ استعمال ہوئے ہیں: "هَفَوَات" اور "آثَام"۔ لغوی اعتبار سے ان دونوں میں ایک واضح فرق ہے۔

الف) هَفَوَات (لغزشیں): لفظ "هَفْوَة" کا مطلب ہے وہ معمولی چوک، زبان کی وہ پھسلن، یا وہ غیر ارادی غلطی جو انسان سے انجانے میں یا غفلت کی وجہ سے سرزد ہو جائے، یعنی انسان کا ارادہ

[1] علامہ مجلسی، بحار الانوار، جلد ۹۱، صفحہ ۱۴۲۔

گناہ کا نہ ہو لیکن اس سے کوئی نامناسب حرکت ہو جائے [1]۔ جیسے بھوک کی حالت میں غصے میں منہ سے کوئی ایسا لفظ نکل جانا جو روزے کے کمال کو کم کر دے۔

ب) آثَام (گناہ): "إِثْم" کی جمع "آثَام" ہے، جس کا مطلب ہے وہ جان بوجھ کر کیا جانے والا ارادی اور بڑا گناہ، جو انسان کو اللہ کی رحمت سے دور کر دے اور جس پر شریعت میں سزا مقرر ہو [2]۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ ان دونوں قسم کی برائیوں (چاہے وہ چھوٹی اور غیر ارادی ہوں، یا بڑی اور ارادی) سے مکمل طور پر بچنے کا حکم دیتا ہے: ﴿وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ﴾ "اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور پوشیدہ گناہ کو بھی۔ یقیناً جو لوگ گناہ کماتے ہیں، انہیں عنقریب اس کی سزا دی جائے گی جو وہ کیا کرتے تھے" [3]۔ روزے کی حالت میں انسان کا جسم تو گناہوں (آثام) سے رکا ہوتا ہے، لیکن اس کی زبان یا نگاہ بسا اوقات لغزشوں (ہفوات) کا شکار ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزے دار کو اسی خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «الصِّيَامُ جُنَّةٌ مِنَ النَّارِ، فَمَنْ أَصْبَحَ صَائِماً فَلَا يَجْهَلْ وَلَا يَسْفَهْ، وَإِنِ امْرُؤٌ جَهِلَ عَلَيْهِ فَلْيَقُلْ إِنِّي صَائِمٌ» "روزہ جہنم کی آگ سے بچنے کی ڈھال ہے۔ پس جو شخص روزے کی حالت میں صبح کرے، اسے چاہیے کہ وہ جہالت اور بیوقوفی سے کام نہ لے، اور اگر کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ جہالت سے پیش آئے تو اسے چاہیے کہ بس یہ

---

[1] راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، مادہ ہ ف و۔

[2] حسن مصطفوی، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، جلد ۱، صفحہ ۳۳۔

[3] قرآن مجید، سورہ الانعام، آیت ۱۲۰۔

کہہ دے: میں روزے دار ہوں"[1]۔

۳. وَارْزُقْنِي فِيهِ ذِكْرَكَ بِدَوَامِهِ

دوامِ ذکر کا رزق اور قلب کی حیات

تیسرا تقاضا اس دعا کا سب سے زیادہ عرفانی اور عاشقانہ پہلو ہے: "اور مجھے اس میں ہمیشہ اپنے ذکر کی توفیق (بطور رزق) عطا فرما"۔ اس فقرے میں دو حیرت انگیز اور غور طلب باتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ اللہ کے ذکر کو "رزق" (ارزقنی) قرار دیا گیا ہے۔ ہم عام طور پر رزق سے مراد روٹی، پانی اور مال لیتے ہیں جو جسم کو زندہ رکھتا ہے۔ لیکن عرفانِ اسلامی میں "ذکر" روح کی غذا اور اس کا سب سے بڑا رزق ہے۔ جس طرح مادی رزق کے بغیر جسم مر جاتا ہے، اسی طرح ذکر کے بغیر روح مردہ ہو جاتی ہے۔ دوسری اہم بات "بِدَوَامِهِ" (اس کی ہمیشگی) کا لفظ ہے۔ ذکر کا مطلب محض تسبیح کے دانے گننا یا خاص اوقات میں مصلے پر بیٹھ کر وظائف پڑھنا نہیں ہے۔ دوامِ ذکر کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا دل ہر لمحے — چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کاروبار کرتے، اور لوگوں سے ملتے ہوئے — اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو۔ اسے ہر پل یہ احساس رہے کہ اس کا خالق اسے دیکھ رہا ہے۔

قرآنِ مجید میں اولو الالباب (عقل والوں) کی یہی صفت بیان کی گئی ہے کہ ان کا ذکر وقتی نہیں بلکہ دائمی ہوتا ہے: ﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ﴾ "وہ لوگ جو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں کے بل لیٹے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں"[2]۔ امیر

---

[1] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۴، صفحہ ۸۸۔

[2] قرآن مجید، سورہ آل عمران، آیت ۱۹۱۔

المومنین علیہ السلام دعائے کمیل کے اختتامی مناظر میں اپنے خالق کے سامنے اسی دائمی ذکر کی التجا کرتے ہوئے گڑگڑاتے ہیں: «يَا رَبِّ يَا رَبِّ يَا رَبِّ... وَاجْعَلْ أَوْقَاتِي مِنَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ بِذِكْرِكَ مَعْمُورَةً، وَبِخِدْمَتِكَ مَوْصُولَةً» "اے پروردگار، اے پروردگار، اے پروردگار... میرے رات اور دن کے تمام اوقات کو اپنے ذکر سے آباد کر دے، اور انہیں اپنی خدمت کے ساتھ جوڑ دے"[1]۔ جب انسان کا دل اس رزق (دوامِ ذکر) سے سیراب ہو جاتا ہے، تو پھر وہ کبھی کسی آزمائش میں تنہا اور مایوس نہیں ہوتا۔

٤. بِتَوْفِيقِكَ يَا هَادِيَ الْمُضِلِّينَ

توفیقِ الٰہی اور بھٹکے ہوؤں کے لیے رہنمائی

دعا کا اختتام ایک انتہائی پرامید اور امید افزا واسطے پر ہوتا ہے: "اپنی توفیق کے واسطے، اے بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھانے والے"۔ **الف)** بتوفیقک **(تیری توفیق کے واسطے):** توفیق کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کے لیے نیکی کے اسباب مہیا کر دے اور اس کے راستے کی رکاوٹوں کو دور کر دے۔ بندہ جانتا ہے کہ صیام و قیام کی ادائیگی، گناہوں سے دوری، اور دائمی ذکر کا حصول اس کے اپنے بس کی بات نہیں۔ اس لیے وہ اللہ کی بارگاہ میں اسی کی توفیق کا واسطہ پیش کرتا ہے، کہ اے اللہ! جو توفیق تیری ملکیت ہے، اسی کے صدقے میرے ارادوں کو منزل تک پہنچا دے۔ **ب)** يَا هَادِيَ الْمُضِلِّينَ **(اے بھٹکے ہوؤں کو ہدایت دینے والے):** یہ وہ جملہ ہے جو گنہگار اور راستے سے بھٹکے

---

[1] شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، دعائے کمیل۔

ہوئے انسان کو ناامیدی کی تاریکی سے نکال کر امید کی روشن کرن دکھاتا ہے۔ "مضلّین" (گمراہ اور بھٹکے ہوئے لوگ) وہ ہیں جو نفس کی پیروی میں صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے ہوں۔ جب انسان اپنی خطاؤں کا ادراک کرتا ہے اور اللہ کی بارگاہ میں واپس لوٹتا ہے، تو اللہ اسے دھتکارتا نہیں، بلکہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿قُلِ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ ۗ أَفَمَن يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَن يُتَّبَعَ أَمَّن لَّا يَهِدِّي إِلَّا أَن يُهْدَىٰ﴾ "کہہ دیجیے کہ صرف اللہ ہی ہے جو حق کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ تو کیا وہ جو حق کی طرف راستہ دکھائے، زیادہ حقدار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، یا وہ جو خود راستہ نہ پاسکے مگر یہ کہ اسے راستہ دکھایا جائے؟"[1]۔ الغرض، ساتویں دن کی دعا انسان کو عبادات میں اللہ کا محتاج بناتی ہے، لغزشوں سے بچنے کا شعور دیتی ہے، ذکرِ الٰہی کو روح کی دائمی خوراک قرار دیتی ہے اور یہ یقین دلاتی ہے کہ اگر انسان بھٹک بھی جائے، تو اللہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے دوبارہ حق کے راستے پر گامزن کر دیتا ہے۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے ساتویں دن کی دعا در حقیقت عملی عبادات کی ادائیگی کے کٹھن مراحل میں اللہ کی دستگیری اور ذکرِ دائمی کی طلب کا نام ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

صیام و قیام اور توفیق کا فلسفہ: دعا کے آغاز میں روزے اور قیام کے لیے اللہ سے 'اعانت' (مدد) مانگی گئی ہے۔ اسلام کا فلسفۂ بندگی یہ ہے کہ جب تک اللہ کی توفیق اور مدد شاملِ حال نہ ہو، انسان ایک سجدہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔ یہ فقرہ دراصل انسان کے اس عجز کا اقرار ہے کہ بندگی میں ذاتی استطاعت پر غرور

[1] قرآن مجید، سورہ یونس، آیت ۳۵۔

کرنا شرکِ خفی ہے۔ **ہفوات اور آثام سے مکمل پرہیز:** دعا کا دوسرا فقرہ نفس کی ہمہ گیر پاکیزگی کی ضمانت ہے۔ اس میں 'آثام' (ان بڑے گناہوں جو انسان کو رحمت سے دور کر دیتے ہیں) کے ساتھ ساتھ 'ہفوات' (ان معمولی لغزشوں اور غیر ارادی غلطیوں جو روزے کا کمال کم کر دیتی ہیں) سے بھی بچنے کی التجا کی گئی ہے۔ یہ ظاہر اور باطن، دونوں کے روزے کی تکمیل ہے۔ **قلب کی حیات اور رزقِ معنوی:** دعا کا سب سے عرفانی پہلو ذکرِ خدا کو 'رزق' قرار دینا ہے۔ جس طرح جسم روٹی پانی کا محتاج ہے، اسی طرح روح کا رزق اللہ کا ذکر ہے۔ اس میں 'دوام' کی شرط یہ بتاتی ہے کہ سچا ذکر مصلے تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ بازار، کاروبار اور تنہائی، غرض ہر لمحے انسان کے دل کو یادِ خدا سے آباد رکھتا ہے۔ **ہادیٔ مضلّین کی بارگاہ میں توکل:** دعا کا اختتام ایک انتہائی امید افزا کلمے پر ہوتا ہے۔ بندہ صیام، قیام اور ذکر کے کٹھن راستے پر چلنے کے لیے اللہ کی 'توفیق' کا واسطہ دیتا ہے اور اسے 'ہادی المضلین' (بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھانے والا) کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اگر گناہوں کے بوجھ تلے انسان راستہ بھٹک بھی جائے، تو پروردگار کی رحمت اسے کبھی دھتکارتی نہیں بلکہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے منزل تک پہنچا دیتی ہے۔

- ❖ رمضان المبارک کے ساتویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ ہماری تمام تر عبادات اور روحانی استقامت کا دار و مدار فقط پروردگار کی غیبی دستگیری پر ہے۔ جب انسان اپنی انا کو مٹا کر اللہ کی مدد، پرہیزگاری اور دائمی ذکر کا طلبگار ہوتا ہے، تو اللہ اسے گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنی عطا فرما دیتا ہے۔

آٹھویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ ارْزُقْنِي فِيهِ رَحْمَةَ الْأَيْتَامِ، وَإِطْعَامَ الطَّعَامِ، وَإِفْشَاءَ السَّلَامِ، وَصُحْبَةَ الْكِرَامِ، بِطَوْلِكَ يَا مَلْجَأَ الْآمِلِينَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں یتیموں پر رحم کرنے، اور (بھوکوں کو) کھانا کھلانے، اور سلام کو عام کرنے (پھیلانے)، اور نیک (کریم) لوگوں کی صحبت کا رزق عطا فرما، اپنے فضل و عطا کے واسطے، اے آرزومندوں کی پناہ گاہ۔

آٹھواں دن: معاشرتی ہمدردی اور تکریمِ انسانیت

اسلام کا فلسفۂ بندگی محض مصلے پر بیٹھ کر آنسو بہانے اور تنہائی میں روزے رکھنے کا نام نہیں ہے۔ آٹھویں دن کی دعا عبادت کے رخ کو انفرادیت سے نکال کر اجتماعیت اور معاشرتی حقوق کی جانب موڑ دیتی ہے۔ یہ مناجات اس حقیقت کا اعلان ہے کہ جو شخص اپنے اردگرد موجود کمزور طبقات کے درد سے بے نیاز ہے، اس کی باطنی طہارت اور عبادات بارگاہِ الٰہی میں نامکمل ہیں۔ یتیموں کے سر پر دستِ شفقت رکھنا، بھوکوں کو کھانا کھلا کر اپنے اندر سے بخل کا خاتمہ کرنا، اور تکبر کو مٹا کر معاشرے میں سلام اور امن کو رواج دینا—یہ سب محض اخلاقی فرائض نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ عظیم "رزق" اور سعادتیں ہیں۔ یہ دعا ہمیں سکھاتی ہے کہ خالق تک پہنچنے کا سیدھا راستہ مخلوقِ خدا کی ہمدردی اور خدمت سے ہو کر گزرتا ہے۔ انسان کو اپنے کردار کی حفاظت کے لیے نیک اور کریم لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہیے، اور ان تمام بھاری سماجی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے اپنے محدود ارادے کے بجائے اللہ کے لامحدود فضل اور اس کی مضبوط پناہ گاہ کا سہارا لینا چاہیے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے آٹھویں دن کی دعا بندگی کے سفر کو انفرادی عبادت کے خول سے نکال کر اجتماعی اور معاشرتی ذمہ داریوں کی طرف موڑ دیتی ہے۔ یہ مناجات ہمیں سکھاتی ہے کہ یتیموں کی کفالت، بھوکوں کو کھانا کھلانا، معاشرے میں امن (سلام) کو رواج دینا اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنا محض اخلاقی فرائض نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ عظیم 'رزق' ہیں۔ اس دعا کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ خالق کی رضا تک پہنچنے کا راستہ مخلوق کی خدمت اور ہمدردی سے ہو کر گزرتا ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **یتیموں پر شفقت:** معاشرے کے بے آسرا بچوں کی محض مالی کفالت نہیں، بلکہ انہیں محبت اور نفسیاتی سہارا فراہم کرنے کی عظیم سعادت طلب کرنا۔ **بھوکوں کو کھانا کھلانا:** انسانیت کی سب سے بنیادی ضرورت پوری کر کے اپنے اندر سے بخل اور کنجوسی کا خاتمہ کرنا، جو کہ اہلِ بیت علیہم السلام کا عظیم شیوہ ہے۔ **سلام کو عام کرنا:** طبقاتی فرق اور تکبر کو مٹا کر معاشرے میں سلامتی، امن اور تحفظ کا رواج پیدا کرنا۔ **نیک لوگوں کی صحبت:** اپنے کردار اور روحانی تحفظ کے لیے شریف، بااخلاق اور سچے لوگوں (کِرام) کی ہم نشینی کا رزق مانگنا۔ **فضلِ الٰہی اور امیدوں کی پناہ گاہ:** ان بھاری سماجی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے اپنی طاقت کے بجائے پروردگار کے بے پناہ فضل (طَول) اور اس کی پناہ کا سہارا لینا۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

۱. اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي فِيهِ رَحْمَةَ الْأَيْتَامِ

یتیموں پر شفقت اور معاشرتی ذمہ داری

دعا کا پہلا فقرہ معاشرے کے سب سے کمزور اور بے آسرا طبقے کی کفالت اور ان پر رحم کرنے سے متعلق ہے: "اے اللہ! مجھے اس مہینے میں یتیموں پر رحم کرنے کا رزق عطا فرما"۔ یہاں ایک انتہائی لطیف اور فکری نکتہ ہے کہ یتیموں پر رحم کرنے کو ایک "رزق" (ارزقنی) کے طور پر مانگا گیا ہے۔ ہم عام طور پر سمجھتے ہیں کہ ہم کسی یتیم پر خرچ کر کے اس پر احسان کر رہے ہیں، لیکن یہ التجا ہمیں بتاتی ہے کہ کسی دکھیارے اور یتیم کے کام آنا اور اس کے سر پر دستِ شفقت رکھنا دراصل اللہ کی طرف سے دیا گیا ایک بہت بڑا رزق اور سعادت ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔

عربی زبان میں "یتیم" اس بچے کو کہتے ہیں جو بلوغت سے پہلے اپنے باپ کے سائے سے محروم ہو جائے۔ باپ ایک بچے کے لیے تحفظ، معاشی کفالت اور نفسیاتی سہارے کا نام ہے۔ جب یہ سہارا اٹھ جاتا ہے تو بچہ معاشرے کی تیز دھوپ میں تنہا رہ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر یتیموں کے حقوق کی تاکید کی ہے اور ان کے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی سے سختی سے منع فرمایا ہے: ﴿فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ "پس آپ یتیم پر ہرگز دباؤ نہ ڈالیں (اس پر کوئی زیادتی نہ کریں)"[1]۔

[1] قرآن مجید، سورہ الضحیٰ، آیت ۹۔

اس دعا میں التجا یہ نہیں کہ مجھے یتیموں کو محض "پیسہ" دینے کی توفیق دے، بلکہ لفظ "رَحْمَةَ الْأَيْتَامِ" (یتیموں پر رحم کرنا) استعمال ہوا ہے۔ رحم کا مطلب محبت، شفقت اور نفسیاتی سہارا ہے۔ یتیم کو صرف روٹی نہیں چاہیے ہوتی، اسے مسکراہٹ اور محبت بھی چاہیے ہوتی ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک کے روحانی اثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «مَنْ كَفَلَ يَتِيماً حَتَّى يَسْتَغْنِيَ عَنْهُ أَوْجَبَ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ لَهُ بِذَلِكَ الْجَنَّةَ» "جو شخص کسی یتیم کی کفالت کرے یہاں تک کہ وہ یتیم (اس کفالت سے) بے نیاز ہو جائے، تو اللہ عَزَّوَجَلَّ اس عمل کے بدلے اس کے لیے جنت واجب کر دیتا ہے"[1]۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام جنہیں تاریخ میں "ابو الایتام" (یتیموں کا باپ) کہا جاتا ہے، اپنے آخری وصیت نامے میں، جب آپ بسترِ شہادت پر تھے، یتیموں کا حق یاد دلاتے ہوئے فرماتے ہیں: «اللَّهَ اللَّهَ فِي الْأَيْتَامِ، فَلَا تُغِبُّوا أَفْوَاهَهُمْ، وَلَا يَضِيعُوا بِحَضْرَتِكُمْ» "یتیموں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہنا، ایسا نہ ہو کہ کبھی وہ پیٹ بھر کر کھائیں اور کبھی بھوکے رہ جائیں، اور ایسا نہ ہو کہ تمہاری موجودگی میں وہ تباہ و برباد ہو جائیں"[2]۔

آٹھویں دن کی دعا ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ روزے کی بھوک کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ انسان کو ان یتیموں اور بے سہاروں کی بھوک کا احساس ہو، اور وہ معاشرے میں ان کے لیے ایک مہربان سرپرست کا کردار ادا کرے۔

---

[1] شیخ صدوق، ثواب الاعمال و عقاب الاعمال، صفحہ ۱۳۵۔
[2] سید رضی، نہج البلاغہ، مکتوب ۴۷۔

۲. وَ إِطْعَامَ الطَّعَامِ

کھانا کھلانا، بھوک کا خاتمہ اور ایثار کی معراج

دعا کا دوسرا فقرہ انسان کے اندر سخاوت اور ایثار کو ابھارنے کی التجا ہے: "اور مجھے (بھوکوں کو) کھانا کھلانے کا رزق عطا فرما"۔

انسانیت کی سب سے بنیادی اور فطری ضرورت بھوک مٹانا ہے۔ روزے کا فلسفہ بھی پیٹ کے خالی ہونے سے جڑا ہے۔ جب انسان خود بھوکا ہوتا ہے تو اسے دنیا کے ان کروڑوں انسانوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے جنہیں دو وقت کی روٹی میسر نہیں۔ "اطعامِ طعام" (کھانا کھلانا) عظیم ترین معاشرتی فرائض میں سے ایک ہے۔ قرآنِ مجید نے جہنمیوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ان کا ایک بڑا جرم یہ بتایا ہے کہ وہ نہ تو خود مسکین کو کھانا کھلاتے تھے اور نہ دوسروں کو اس کی ترغیب دیتے تھے: ﴿وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ﴾ "اور وہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا تھا"[1]۔

اس کے برعکس، قرآنِ مجید نے پاکیزہ ہستیوں کے اس عظیم الشان ایثار اور طعام کھلانے کے عمل کو سورہ الانسان (جسے سورہ الدہر بھی کہا جاتا ہے) میں رہتی دنیا تک کے لیے امر کر دیا ہے۔ جب اہلِ بیت علیہم السلام نے مسلسل تین دن روزے رکھے اور ہر دن افطار کے وقت اپنا کھانا باری باری ایک مسکین، ایک یتیم اور ایک قیدی کو دے دیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خالص عمل کی تعریف یوں فرمائی:

---

[1] قرآن مجید، سورہ الحاقہ، آیت ۳۴۔

﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا﴾ "اور وہ کھانے کی اپنی شدید ضرورت (اور اس سے محبت) کے باوجود اسے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔ (اور ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ دل میں کہتے ہیں) ہم تو تمہیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کسی بدلے کی خواہش رکھتے ہیں اور نہ ہی شکرگزاری کی"[۱]۔

امام جعفر صادق علیہ السلام مؤمن کو کھانا کھلانے کی بے پناہ فضیلت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «مَنْ أَطْعَمَ مُؤْمِناً حَتَّى يُشْبِعَهُ لَمْ يَدْرِ أَحَدٌ مِنْ خَلْقِ اللَّهِ مَا لَهُ مِنَ الْأَجْرِ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ» "جو شخص کسی مومن کو کھانا کھلائے یہاں تک کہ اس کا پیٹ بھر دے، تو اللہ کی مخلوق میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ اس کے لیے آخرت میں کتنا بڑا اجر ہے، سوائے اللہ کے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے"[۲]۔

یہ درحقیقت انسان کے اندر موجود کنجوسی اور بخل کی بیماری کا مؤثر روحانی علاج ہے۔

۳. وَإِفْشَاءَ السَّلَامِ

سلام کو عام کرنا، تکبر کا خاتمہ اور امن کا رواج

تیسرا تقاضا معاشرے میں محبت اور امن کے قیام سے متعلق ہے: "اور سلام کو عام کرنے

---

[۱] قرآن مجید، سورہ الانسان، آیت ۸-۹۔

[۲] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۲، صفحہ ۲۰۱۔

(پھیلانے) کا رزق عطا فرما"۔

اس فقرے میں "اِفْشَاء" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے کسی چیز کو اس حد تک پھیلانا اور عام کر دینا کہ وہ ہر طرف ظاہر ہو جائے، اور "سَلَام" کا مطلب ہے امن، سلامتی اور تحفظ کی ضمانت دینا۔ سلام کرنا محض ملاقات کا ایک رسمی کلمہ یا رواج نہیں ہے، بلکہ "السلام" اللہ تعالیٰ کے خوبصورت ناموں میں سے ایک ہے۔ جب ایک شخص دوسرے کو سلام کرتا ہے تو وہ دراصل اسے یہ ضمانت دے رہا ہوتا ہے کہ "تم میری زبان، میرے ہاتھوں اور میرے شر سے مکمل طور پر محفوظ ہو"۔ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے گھروں میں داخل ہوتے وقت سلام کرنے کا واضح حکم دیا ہے:
﴿فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً﴾
"پس جب تم گھروں میں داخل ہوا کرو تو اپنوں کو سلام کیا کرو، یہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ مبارک اور پاکیزہ دعا ہے"[۱]۔ افشائے سلام کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ معاشرے سے تکبر اور طبقاتی فرق کو ختم کر دیتا ہے۔ جب ایک امیر، کسی غریب مزدور کو پہل کر کے سلام کرتا ہے، تو اس کا غرور ٹوٹ جاتا ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام سلام کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ يُحِبُّ إِطْعَامَ الطَّعَامِ وَ إِفْشَاءَ السَّلَامِ» "یقیناً اللہ عَزَّوَجَلَّ کھانا کھلانے اور سلام کو عام کرنے (پھیلانے) سے بہت محبت کرتا ہے"[۲]۔ یہ عمل دلوں سے بغض اور کینے کو ختم کرنے کا ایک بے مثال ذریعہ ہے۔

---

[۱] قرآن مجید، سورہ النور، آیت ۶۱۔
[۲] محمد بن حسن حرّ عاملی، وسائل الشیعۃ، جلد ۱۲، صفحہ ۵۲۔

٤. وَصُحْبَةَ الْكِرَامِ

نیک لوگوں کی صحبت، کردار سازی اور روحانی تحفظ

چوتھا تقاضا انسان کی صحبت، دوستوں کے انتخاب اور کردار سازی سے متعلق ہے: "اور نیک (کریم) لوگوں کی صحبت کا رزق عطا فرما"۔

لغت میں "کِرَام" (کریم کی جمع) ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو انتہائی شریف، بااخلاق، سخی، اور اعلیٰ ظرف کے مالک ہوں، جن کے دل میں کسی کے لیے برائی نہ ہو اور جن کا ظاہر اور باطن پاکیزہ ہو۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ جس محفل اور جن لوگوں کی صحبت میں بیٹھتا ہے، آہستہ آہستہ انہی کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ انسان کا کردار اس کے دوستوں کی عکاسی کرتا ہے۔

قرآنِ مجید نے انسان کو واضح طور پر متقی اور سچے لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو، اور سچے لوگوں کی صحبت میں (ان کے ساتھ) رہا کرو"[1]۔

علمائے تفسیر کے نزدیک یہاں "صادقین" سے مراد وہ کامل ہستیاں ہیں جن کی زبان اور عمل میں کبھی تضاد نہیں ہوتا، اور ان کی کامل ترین صورت محمد وآلِ محمد علیہم السلام کی ذواتِ مقدسہ ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اپنے فرزند کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «قَارِنْ أَهْلَ الْخَيْرِ تَكُنْ مِنْهُمْ، وَبَايِنْ أَهْلَ الشَّرِّ تَبِنْ عَنْهُمْ» "نیک لوگوں کے قریب رہو تو تم بھی

---

[1] قرآن مجید، سورہ التوبہ، آیت ۱۱۹۔

انہی میں سے ہو جاؤ گے، اور شریر لوگوں سے دوری اختیار کرو تاکہ تم ان کی برائی سے محفوظ رہو"[1]۔

آٹھویں دن کی دعا میں جب ہم عبادات اور سلامتی کے اعلیٰ درجے پر پہنچنے کا ارادہ کرتے ہیں، تو ہم اللہ سے التجاء کرتے ہیں کہ اے رب، مجھے ان پاکیزہ اور کریم لوگوں کی صحبت عطا فرما جو مجھے نیکیوں کے اس راستے پر ثابت قدم رکھیں۔

٥. بِطَوْلِكَ يَا مَلْجَأَ الْآمِلِينَ

فضلِ الٰہی کا واسطہ اور امیدوں کی پناہ گاہ

دعا کا حتمی اختتام اللہ کے فضل، عطا اور اس کی پناہ گاہ ہونے کے نہایت دلکش واسطے پر ہوتا ہے:
"اپنے فضل و عطا کے واسطے، اے آرزومندوں کی پناہ گاہ"۔

لغت میں "طَوْل" کا مطلب ہے بے پناہ فضل، غلبہ، وسعت، اور ایسی عطا جس میں کوئی کمی نہ آئے۔ بندہ جانتا ہے کہ معاشرے میں یتیموں کی کفالت کرنا، بھوکوں کو کھانا کھلانا، انا کو مار کر سلام میں پہل کرنا اور اچھے لوگوں کی صحبت تلاش کرنا—یہ سب کام محض انسان کے اپنے ارادے سے مکمل نہیں ہو سکتے۔ ان بھاری ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے اللہ کے "طول" (اس کے وسیع فضل اور کرم) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور "مَلْجَأ" کا مطلب ہے وہ قلعہ، پناہ گاہ اور محفوظ مقام جہاں انسان ہر خطرے سے بچنے کے لیے پناہ لیتا ہے۔ انسان جب دنیا کے ٹھکرائے ہوئے یتیموں اور بھوکوں کی پناہ گاہ بننے کی کوشش کرتا ہے، تو وہ جانتا ہے کہ وہ خود بھی تو ایک پناہ کا محتاج ہے۔ وہ اللہ کو پکارتا ہے کہ

[1] سید رضی، نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱۔

اے خالق، جب تیرے در پر کوئی امید لے کر آتا ہے تو تو اسے مایوس نہیں کرتا۔ میری بھی یہی آرزو ہے کہ تو میرے دل کو معاشرے کے لیے نرم کر دے گا اور مجھے ان تمام اعلیٰ سماجی اور اخلاقی صفات سے آراستہ کر دے گا۔ الغرض، آٹھویں دن کی دعا محض مصلے پر بیٹھ کر پڑھی جانے والی ایک دعا نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مثالی اور فلاحی معاشرے کی تشکیل کا ایک مکمل منشور ہے۔ یہ دعا انسان کو خود غرضی سے نکال کر ایثار، محبت اور سماجی خدمت کی بلندیوں پر لا کھڑا کرتی ہے۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے آٹھویں دن کی دعا محض مصلے پر بیٹھ کر پڑھی جانے والی مناجات نہیں، بلکہ یہ ایک مثالی اور فلاحی معاشرے کی تشکیل کا مکمل منشور ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے: **یتیموں کی سرپرستی بطورِ رزق:** دعا کے آغاز میں یتیموں پر رحم کرنے کو 'رزق' کہا گیا ہے۔ یتیم وہ ہے جو باپ کے سائے سے محروم ہو کر معاشرے کی تیز دھوپ میں تنہا رہ جائے۔ اس دعا میں محض پیسے دینے کی نہیں، بلکہ دستِ شفقت رکھنے اور نفسیاتی سہارا بننے کی التجا کی گئی ہے۔ کسی دکھیارے کے کام آنا اللہ کی طرف سے وہ عظیم سعادت ہے جو انسان کے لیے جنت کا وجوب بنتی ہے۔ **ایثار اور کھانا کھلانے کی فضیلت:** روزے کی بھوک کا ایک اہم مقصد دوسروں کی بھوک کا احساس بیدار کرنا ہے۔ 'اطعامِ طعام' (کھانا کھلانا) انسانیت کی معراج اور اہلِ بیت علیہم السّلام کی وہ عظیم سنت ہے جس کی تعریف قرآن نے سورہ دہر (الانسان) میں کی ہے۔ یہ عمل انسان کو خود غرضی اور کنجوسی کی باطنی بیماری سے نجات دلاتا ہے۔ **افشائے سلام اور تکبر کا خاتمہ:** 'سلام' محض ملاقات کا ایک رسمی کلمہ نہیں، بلکہ سلامتی اور امن کی ضمانت ہے۔ معاشرے میں سلام کو عام کرنے (افشاء) سے دلوں کا کینہ مٹتا ہے۔ جب ایک امیر اور بااختیار شخص پہل کر کے غریب کو سلام کرتا ہے، تو اس کا طبقاتی غرور اور

تکبر خاک میں مل جاتا ہے۔ **کردار سازی کے لیے کریم لوگوں کی صحبت:** انسان کا کردار اور فطرت اس کی صحبت کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔ دعا میں التجا کی گئی ہے کہ اے اللہ! مجھے اعلیٰ ظرف، شریف اور پاکیزہ (کریم) لوگوں کی ہم نشینی عطا فرما تاکہ برائیوں سے میرا روحانی تحفظ ہو سکے اور میں نیکی کے راستے پر ثابت قدم رہوں۔ **وسعتِ فضل اور آرزوؤں کی پناہ گاہ:** دعا کا اختتام اللہ کے 'طَول' (لامحدود فضل اور عطا) کے واسطے پر ہوتا ہے۔ بندہ اقرار کرتا ہے کہ یتیموں کی کفالت اور معاشرتی حقوق کی ادائیگی محض انسانی ارادے سے ممکن نہیں، اس کے لیے اس پروردگار کی اعانت درکار ہے جو دنیا کے تمام آرزومندوں کی سب سے بڑی اور آخری پناہ گاہ (ملجأ) ہے۔

❖ رمضان المبارک کے آٹھویں دن کی یہ مناجات انسان کو خود غرضی کے اندھیرے سے نکال کر ایثار، محبت اور سماجی خدمت کی بلندیوں پر لا کھڑا کرتی ہے، اور یہ شعور دیتی ہے کہ خالق سے سچا تعلق اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک مخلوقِ خدا سے ہمدردی نہ کی جائے۔

نویں دن کی دعا



۞اَللَّهُمَّ اجْعَلْ لِي فِيهِ نَصِيباً مِنْ رَحْمَتِكَ الْوَاسِعَةِ، وَاهْدِنِي فِيهِ لِبَرَاهِينِكَ السَّاطِعَةِ، وَخُذْ بِنَاصِيَتِي إِلَى مَرْضَاتِكَ الْجَامِعَةِ، بِمَحَبَّتِكَ يَا أَمَلَ الْمُشْتَاقِينَ۞

اے اللہ! میرے لیے اس مہینے میں اپنی وسیع رحمت کا ایک حصہ قرار دے، اور مجھے اس میں اپنی روشن دلیلوں کی جانب ہدایت فرما، اور میری پیشانی کے بال پکڑ کر مجھے اپنی جامع رضا (مکمل خوشنودی) کی طرف لے چل، اپنی محبت کے واسطے، اے شوق رکھنے والوں (عاشقوں) کی آخری آرزو۔

نواں دن: وسعتِ رحمت اور بصیرتِ حق

ماہِ رمضان کے ابتدائی دنوں میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تطہیر کے بعد، نویں دن کا روحانی مسافر عرفان اور عشقِ الٰہی کے اس اعلیٰ ترین مقام پر پہنچ جاتا ہے، جہاں دنیوی آرزوئیں دم توڑ دیتی ہیں۔ یہ دعا شکوک و شبہات کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں حق کی پہچان اور ارادۂ الٰہی کے سامنے مکمل خود سپردگی کا ایک عظیم الشان نصاب ہے۔ اس میں سالک اللہ کی اس خاص رحمت کا طلبگار ہوتا ہے جو اسے روزِ قیامت کی رسوائی سے بچالے، اور شیطان کے پیدا کردہ فکری وسوسوں کو کاٹنے کے لیے خدا کی روشن اور چمکدار دلیلوں کی طرف رہنمائی مانگتا ہے۔ اس مناجات کا سب سے پُر جلال پہلو انسان کی اس التجا میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنی آزادی اور اختیار سے دستبردار ہو کر پروردگار سے عرض کرتا ہے کہ وہ اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر اسے زبردستی اپنی جامع خوشنودی کی طرف کھینچ لے۔ یہ دعا اعمال یا عبادات کے بجائے خالص "محبت" کو اپنا وسیلہ بناتی ہے، اور یہ شعور بخشتی ہے کہ دین کا اصل لبِ لباب محبت ہی ہے اور سچے عاشقوں کی آخری جستجو صرف اللہ کی ذات ہوتی ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے نویں دن کی دعا انسان کو انفرادی اور معاشرتی پاکیزگی کے بعد خالص عرفان اور عشقِ الٰہی کے اعلیٰ ترین مقام پر لے جاتی ہے۔ یہ مناجات سالک کی انا اور ذاتی ارادے کو پگھلا کر اسے اللہ کی مرضی کے سامنے مکمل طور پر سرنڈر (تسلیم) کرنے کا نام ہے۔ اس دعا کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ شکوک و شبہات کے اندھیروں سے نکلنے کے لیے پروردگار کی روشن دلیل درکار ہے، اور

نفسِ امارہ کی سرکشی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ خود بندے کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے۔

دعا کے اہم نکات

- **وسعِ رحمت میں سے خاص حصہ:** اللہ کی اس لامحدود رحمت میں سے اپنا دائمی اور محفوظ حصہ مانگنا جو کائنات کے ہر ذرے پر محیط ہے، تاکہ آخرت کی محرومیوں سے بچا جا سکے۔

- **روشن دلیلوں کی جانب ہدایت:** عقائد میں پیدا ہونے والے شیطانی وسوسوں اور شکوک و شبہات کی تاریکیوں کو دور کرنے کے لیے حق کی ان چمکدار اور واضح دلیلوں (براہین) کی طلب، جن پر کوئی پردہ نہ پڑ سکے۔

- **پیشانی پکڑ کر کامل رضا کی طرف کھینچنا:** اپنے کمزور ارادے اور نفس کی آزادی سے دستبردار ہو کر، اللہ کے سامنے یہ التجا کرنا کہ وہ مکمل غلبہ پاتے ہوئے (پیشانی کے بال پکڑ کر) زبردستی اپنی جامع خوشنودی کی طرف کھینچ لے۔

- **محبتِ الٰہی کا واسطہ:** اپنے اعمال یا عبادات کے بجائے خالص عشق اور محبت کو وسیلہ بنانا، کیونکہ سچا دین محبت ہی کا نام ہے اور اللہ ان مشتاقوں کی آخری آرزو ہے جو اس کی ملاقات کے لیے بے قرار رہتے ہیں۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

١. اَللَّهُمَّ اجْعَلْ لِي فِيهِ نَصِيباً مِنْ رَحْمَتِكَ الْوَاسِعَةِ

وسیع رحمت اور انسان کا حصہ

دعا کا پہلا فقرہ اللہ کی لامحدود رحمت میں سے اپنے حصے (نصیب) کی طلب ہے: "اے اللہ! میرے لیے اس مہینے میں اپنی وسیع رحمت کا ایک حصہ قرار دے"۔

اس فقرے میں اللہ کی رحمت کو "الْوَاسِعَة" (بہت زیادہ وسیع اور ہر چیز پر محیط) کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے رحمت وہ واحد صفت ہے جس نے کائنات کے ہر ذرے، ہر وجود اور ہر شے کو اپنے دامن میں سمیٹا ہوا ہے۔ قرآنِ مجید نے اس حقیقت کا اعلان نہایت واضح الفاظ میں فرمایا ہے: ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ "اور میری رحمت ہر چیز پر محیط ہے (ہر چیز میں وسعت پا چکی ہے)"[1]۔

جب اللہ کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ اس نے مؤمن، کافر، جمادات، نباتات اور حیوانات سب کو گھیر رکھا ہے، تو پھر اس دعا میں ہم "نَصِيباً" (ایک حصہ) کیوں مانگ رہے ہیں؟ کیا ہم اس وسیع رحمت سے باہر ہیں؟

یہاں علمِ کلام اور عرفان کا ایک انتہائی لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔ اللہ کی رحمت کی دو قسمیں ہیں:

---

[1] قرآن مجید، سورہ الاعراف، آیت ۱۵۶۔

ایک "رحمتِ عامہ" (رحمانیت) جو کائنات کی ہر شے کو اس کی تخلیق اور بقا کے لیے ملتی ہے، اور دوسری "رحمتِ خاصہ" (رحیمیت) جو صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو اپنی مرضی سے اللہ کے احکامات کے تابع ہو جائیں اور جو ان کی آخرت کو سنوارتی ہے۔ ہم دعا میں اس "رحمتِ خاصہ" میں سے ایک وافر حصے کے طلبگار ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام دعائے کمیل کا آغاز ہی اللہ کی اسی وسیع رحمت کے واسطے سے کرتے ہیں: «اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ بِرَحْمَتِكَ الَّتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ» "اے اللہ! بے شک میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیری اس رحمت کے واسطے سے جو ہر چیز پر محیط ہے"[1]۔

پس نویں دن ہم اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ اے رب! اس مہینے میں مجھے اس رحمتِ خاصہ کا وہ دائمی اور محفوظ حصہ عطا فرما جو مجھے روزِ قیامت کی محرومی سے بچا لے۔

۲. وَاهْدِنِي فِيهِ لِبَرَاهِينِكَ السَّاطِعَةِ

روشن دلائل کی جانب ہدایت اور اندھیروں کا خاتمہ

دعا کا دوسرا تقاضا فکری اور عقائدی پاکیزگی سے متعلق ہے: "اور مجھے اس میں اپنی روشن دلیلوں کی جانب ہدایت فرما"۔

لفظ "بَرَاهِين" (بُرهان کی جمع) کا مطلب ہے وہ ٹھوس، قطعی اور ناقابلِ تردید دلیل جو ہر قسم

---

[1] شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، دعائے کمیل۔

کے شک اور شبہے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے اور حق کو دن کی روشنی کی طرح واضح کر دے [1]۔ اور "السَّاطِعَة" کا مطلب ہے چمکدار اور روشن، یعنی ایسی دلیل جس پر تاریکی کا کوئی پردہ نہ پڑ سکے۔

انسان کی زندگی میں سب سے بڑی گمراہی تب آتی ہے جب وہ باطل کو حق سمجھنے لگتا ہے یا جب اسے عقائد میں شکوک و شبہات گھیر لیتے ہیں۔ شیطان انسان کے دل میں عقیدے، توحید، امامت اور روزِ جزا کے بارے میں وسوسے ڈالتا ہے۔ ان وسوسوں کی تاریکی کو دور کرنے کے لیے صرف اور صرف "روشن دلیل" کی ضرورت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا، بلکہ اس نے قدم قدم پر اپنی روشن دلیلیں قائم کی ہیں۔ یہ دلیلیں قرآن کی آیات کی صورت میں بھی ہیں اور معصومین علیہم السلام کے وجودِ مبارک کی صورت میں بھی۔ قرآنِ مجید فرماتا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا﴾ "اے لوگو! یقیناً تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل (برہان) آچکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایک واضح نور نازل کر دیا ہے" [2]۔

زیارتِ جامعہ کبیرہ، جو کہ ولایتِ اہلِ بیت علیہم السلام کا سب سے مستند اور عظیم الشان منشور ہے، میں ہم ائمہ علیہم السلام کو انہی کلمات سے مخاطب کرتے ہیں: «وَحُجَجِ اللّٰهِ عَلَى أَهْلِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَالْأُولَى، وَرِسَالَةِ مَقَاصِدِهِ، وَأَدِلَّائِهِ عَلَى صِرَاطِهِ» "اور آپ حضرات دنیا، آخرت اور ابتدا میں (تمام مخلوقات پر) اللہ کی حجتیں ہیں، اس کے مقاصد کا پیغام ہیں، اور اس

---

[1] راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، مادہ ب رہ ن۔

[2] قرآن مجید، سورہ النساء، آیت ۱۷۴۔

کے سیدھے راستے کی جانب رہنمائی کرنے والی دلیلیں ہیں"[۱]۔

۳. وَخُذْ بِنَاصِيَتِي إِلَى مَرْضَاتِكَ الْجَامِعَةِ

کامل تسلیم و رضا اور پیشانی سے پکڑنا

تیسرا تقاضا اس پوری دعا کا سب سے زیادہ پُر جلال اور روح پرور حصہ ہے: "اور میری پیشانی کے بال پکڑ کر مجھے اپنی جامع رضا (مکمل خوشنودی) کی طرف لے چل"۔

یہاں ایک انتہائی بلیغ اور استعاراتی لفظ "النَّاصِيَة" (پیشانی کے بال) استعمال ہوا ہے۔ عربی ثقافت اور قرآنی لغت میں پیشانی کے بال پکڑنے کا مطلب ہوتا ہے کسی کو مکمل طور پر اپنے کنٹرول میں لے لینا، اس پر مکمل غلبہ پالینا، اور اس کے اپنے ارادے کو ختم کر کے اسے اپنے ارادے کا تابع بنا لینا[۲]۔

انسان کا اپنا ارادہ (نفسِ امارہ) اکثر اسے برائی کی طرف کھینچتا ہے۔ جب انسان بار بار لغزشوں کا شکار ہوتا ہے تو وہ ایک وقت پر اپنے آپ سے تھک جاتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ اگر فیصلہ اس کے اپنے ارادے پر چھوڑا گیا تو وہ کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ لہٰذا وہ بارگاہِ الٰہی میں کھڑا ہو کر اپنی انا، اپنی آزادی اور اپنے اختیار کا مکمل سرنڈر کرتا ہے۔

قرآنِ پاک میں حضرت ہود علیہ السلام اپنے توکل کا اعلان انہی الفاظ میں کرتے ہیں: ﴿إِنِّي

---

[۱] شیخ صدوق، من لا یحضرہ الفقیہ، جلد ۲، صفحہ ۶۱۱۔

[۲] حسن مصطفوی، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، جلد ۱۲، صفحہ ۱۳۰۔

تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُم ۚ مَّا مِن دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ "یقیناً میں نے اپنے اور تمہارے رب، اللہ پر توکل کیا ہے۔ زمین پر چلنے والا کوئی جانور ایسا نہیں مگر یہ کہ وہ اس کی پیشانی کے بال پکڑے ہوئے ہے (یعنی مکمل اختیار رکھتا ہے)۔ یقیناً میرا رب سیدھے راستے پر ہے"[1]۔

بندہ التجا کر رہا ہے کہ "یا اللہ! مجھے میرے اپنے حال پر مت چھوڑ، بلکہ میرے ارادے کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے۔ میری پیشانی سے مجھے پکڑ اور کھینچ کر اس مقام تک لے جا جسے 'مَرْضَاتِكَ الْجَامِعَةِ' (تیری جامع اور مکمل رضا) کہتے ہیں۔"

٤ . بِمَحَبَّتِكَ يَا أَمَلَ الْمُشْتَاقِينَ

عشقِ الٰہی کا واسطہ اور عاشقوں کی آرزو

دعا کا اختتام انسان کے جذبات، محبت اور دل کی گہرائیوں کو چھو لینے والے واسطے پر ہوتا ہے: "اپنی محبت کے واسطے، اے شوق رکھنے والوں (عاشقوں) کی آخری آرزو"۔

جب انسان اللہ سے وسعتِ رحمت، روشن دلیلوں، اور پیشانی پکڑ کر کھینچنے کی التجا کرتا ہے، تو وہ ان مطالبات کو منوانے کے لیے اللہ کے غضب یا اپنے اعمال کا واسطہ نہیں دیتا، بلکہ وہ "محبت" (بِمَحَبَّتِكَ) کا واسطہ دیتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے دین کے خالص تصور کو بیان کرتے ہوئے فرمایا

---

[1] قرآن مجید، سورہ ہود، آیت ۵۶۔

تھا: «هَلِ الدِّينُ إِلَّا الْحُبُّ» "کیا دین محبت کے سوا کچھ اور ہے؟"[۱]۔

مشتاق وہ ہوتا ہے جو اپنے محبوب سے ملاقات کے لیے بے قرار ہو۔ جس کی راتیں کروٹیں بدلتے گزریں اور جس کے دل میں ایک ہی دھن سوار ہو۔ امام زین العابدین علیہ السلام اپنی پُر درد مناجات (مناجات المحبین) میں اسی اشتیاق کو اللہ کی بارگاہ میں یوں پیش کرتے ہیں: «إِلَهِي فَاجْعَلْنَا مِمَّنِ اصْطَفَيْتَهُ لِقُرْبِكَ وَوَلَايَتِكَ... وَشَوَّقْتَهُ إِلَى لِقَائِكَ... وَقُرَّةَ عَيْنِي فِي رُؤْيَتِكَ» "اے میرے معبود! پس ہمیں ان لوگوں میں سے قرار دے جنہیں تونے اپنے قرب اور اپنی ولایت کے لیے چن لیا ہے... اور جن کے دلوں میں اپنی ملاقات کا شوق بھر دیا ہے... اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک صرف تیرے دیدار میں ہے"[۲]۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے نویں دن کی دعا درحقیقت نظریاتی بصیرت کے حصول اور ارادۂ الٰہی کے سامنے خودسپردگی (تسلیم و رضا) کا ایک عظیم عرفانی نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے: **رحمتِ واسعہ اور رحمتِ خاصہ کا حصول:** دعا کا آغاز اللہ کی اس وسیع رحمت کی طلب سے ہوتا ہے جس نے کائنات کی ہر شے کو گھیر رکھا ہے۔ بندہ اس رحمتِ عامہ کے ساتھ ساتھ اس 'رحمتِ خاصہ' میں سے اپنا وافر حصہ (نصیب) مانگتا ہے جو صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو اپنی مرضی سے احکامِ الٰہی کے تابع ہو جاتے ہیں اور جو روزِ قیامت کی رسوائی سے بچاتی ہے۔

---

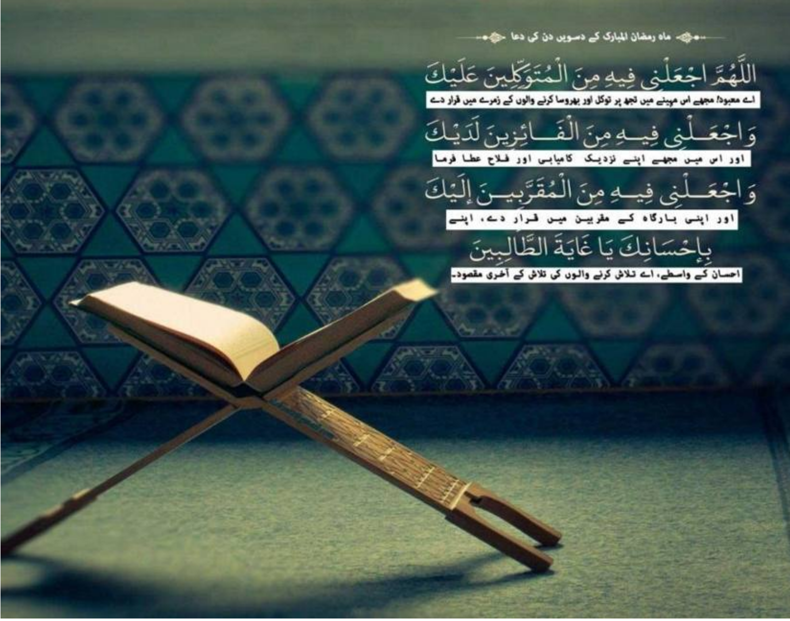
[۱] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۸، صفحہ ۸۰۔
[۲] شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، مناجاتِ محبین۔

- **اندھیروں میں حق کی پہچان:** عقائدی اور فکری پاکیزگی کے لیے دوسری التجا یہ ہے کہ اللہ اپنی روشن اور چمکدار دلیلوں (براہین ساطعہ) کی طرف ہدایت کرے۔ جب شیطان عقیدے، توحید اور امامت کے حوالے سے دل میں وسوسے ڈالتا ہے، تو صرف قرآنی آیات اور معصومین علیہم السلام جیسی روشن دلیلیں ہی ان تاریکیوں کا سینہ چاک کر کے صراطِ مستقیم دکھاتی ہیں۔

- **انا کی شکست اور کامل خود سپردگی:** دعا کا سب سے پُر جلال اور استعاراتی حصہ پیشانی کے بال پکڑنے (ناصیہ) کی التجا ہے۔ عربی ثقافت میں اس کا مطلب کسی پر مکمل غلبہ پانا ہے۔ بندہ جانتا ہے کہ اگر اسے اس کے اپنے ارادے اور نفسِ امارہ کے حوالے کر دیا گیا تو وہ بھٹک جائے گا۔ لہٰذا وہ اپنی انا کو مٹا کر التجا کرتا ہے کہ یارب! تو میری باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے اور مجھے کھینچ کر اپنی مکمل اور جامع رضا کی منزل تک لے جا۔ حضرت ہود علیہ السلام نے بھی قرآن میں اسی توکل کا اعلان کیا تھا۔ **عاشقوں کی آرزو اور دینِ محبت:** دعا کا اختتام غضب یا اعمال کے بجائے 'محبت' کے واسطے پر ہوتا ہے۔ دین کا خالص ترین تصور محبت ہی تو ہے۔ بندہ اس ذات کو پکارتا ہے جو مشتاقوں اور عاشقوں (جن کی راتیں محبوبِ حقیقی کی یاد میں بے قراری سے گزرتی ہیں) کی آخری اور واحد آرزو (امل المشتاقین) ہے۔

❖ رمضان المبارک کے نویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ بندگی کی معراج اپنے اختیار سے دستبردار ہو کر اللہ کی رضا پر راضی ہو جانے میں ہے۔ جب انسان عشق اور محبت کے واسطے سے پروردگار کی روشن دلیلوں اور وسیع رحمت کا طلبگار ہوتا ہے، تو اللہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے سیدھے راستے پر گامزن کر دیتا ہے۔

دسویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ اجْعَلْنِي فِيهِ مِنَ الْمُتَوَكِّلِينَ عَلَيْكَ، وَاجْعَلْنِي فِيهِ مِنَ الْفَائِزِينَ لَدَيْكَ، وَاجْعَلْنِي فِيهِ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ إِلَيْكَ، بِإِحْسَانِكَ يَا غَايَةَ الطَّالِبِينَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں تجھ پر توکل (بھروسہ) کرنے والوں میں سے قرار دے، اور مجھے اس میں تیرے ہاں کامیاب ہونے والوں (فائزین) میں سے قرار دے، اور مجھے اس میں اپنے مقربین (انتہائی قریب کیے گئے بندوں) میں سے قرار دے، اپنے احسان کے واسطے، اے طلب کرنے والوں کی آخری منزل۔

دسواں دن: مقامِ توکل اور فوز و فلاح

رمضان المبارک کا پہلا عشرہ، جو کہ کائنات پر رحمتوں کے نزول کا عشرہ ہے، اپنے اختتام پر انسان کو ایک ایسی نظریاتی اور روحانی بلندی پر لا کھڑا کرتا ہے جہاں مادی سہاروں کی حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ دسویں دن کی دعا درحقیقت تمام دنیوی اور طاغوتی قوتوں کے خوف سے آزاد ہو کر، خالصتاً ذاتِ حق پر بھروسہ (توکل) کرنے کا عظیم الشان اعلان ہے۔ یہ دن انسان کے زاویۂ نگاہ کو یکسر بدل دیتا ہے اور اسے سکھاتا ہے کہ حقیقی کامیابی (فوز) مال و دولت یا دنیا والوں کی نظر میں جیتنا نہیں ہے، بلکہ اصل فائز وہ ہے جو اپنے پروردگار کی نگاہ میں سرخرو ہو جائے۔ جب انسان کا توکل کامل ہو جاتا ہے اور وہ اللہ کی بارگاہ میں اپنا امتحان پاس کر لیتا ہے، تو اسے جنت کی عام نعمتوں سے بلند تر ہو کر اللہ کے مقربین (انتہائی قریب کیے گئے رازداروں) میں شامل ہونے کا شرف ملتا ہے۔ عشرۂ رحمت کا اختتام اسی اعتراف پر ہوتا ہے کہ انسان اپنی ٹوٹی پھوٹی عبادتوں کے بل بوتے پر یہ عظیم مقامات ہرگز حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ یہ سب صرف اور صرف پروردگار کے احسان کا نتیجہ ہے، جو ہر طلب کرنے والے کی آخری اور حتمی منزل ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے دسویں دن کی دعا، جو کہ 'عشرۂ رحمت' کا اختتام ہے، انسان کو مادی سہاروں سے آزاد کر کے خالصتاً ذاتِ الٰہی پر بھروسہ کرنے کا درس دیتی ہے۔ یہ مناجات بندگی کے تین انتہائی کٹھن اور بلند ترین کمالات — 'توکل'، 'فوز' (کامیابی)، اور 'قرب' — کا مجموعہ ہے۔ اس کا

بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ جب انسان دنیوی طاقتوں کے خوف سے آزاد ہو کر صرف اللہ پر توکل کرتا ہے، تو وہ دنیا والوں کے بجائے اللہ کی نگاہ میں حقیقی کامیابی (فوز) پا لیتا ہے اور بارگاہِ صمدیت کا مقرب بن جاتا ہے۔

دعا کے اہم نکات

مقامِ توکل کا حصول: ظاہری اسباب کو ترک کیے بغیر، نتائج کے لیے صرف مسبب الاسباب (اللہ) پر مکمل بھروسہ کرنا اور اللہ کے ہوتے ہوئے کسی بھی دنیوی طاقت سے خوفزدہ نہ ہونا۔ **اللہ کے نزدیک کامیابی (فائزین):** دنیا کے سطحی اور مادی معیارِ کامیابی (دولت، اقتدار) کو رد کر کے، اس حقیقی کامیابی (فوز) کی طلب جو انسان کو جہنم سے بچا کر اللہ کی نگاہ میں سرخرو کر دے۔ **بندگی کی معراج اور قربِ الٰہی:** توکل اور کامیابی کے امتحانات پاس کرنے کے بعد، عام جنتیوں کے درجے سے بلند ہو کر اللہ کے 'مقربین' (انتہائی قریب کیے گئے رازداروں) میں شامل ہونے کی التجا۔ **احسانِ پروردگار پر انحصار:** ان عظیم روحانی منازل کو اپنے ناقص اعمال کی قیمت پر پانے کی بجائے، اللہ کے 'احسان' کا واسطہ دینا اور اسے ہی اپنی تمام جستجو کی آخری منزل (غایۃ الطالبین) تسلیم کرنا۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

۱. اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي فِيهِ مِنَ الْمُتَوَكِّلِينَ عَلَيْكَ

توکل کا فلسفہ اور اسباب سے بے نیازی

دعا کا پہلا فقرہ انسان کے عقیدے اور ایمان کی سب سے بڑی آزمائش یعنی "توکل" کے

حصول پر مبنی ہے: "اے اللہ! مجھے اس مہینے میں تجھ پر توکل (بھروسہ) کرنے والوں میں سے قرار دے"۔ توکل کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے اور اسباب کو ترک کر دے، بلکہ توکل کا اصل مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی پوری طبعی اور فکری کوشش بروئے کار لائے، لیکن اس کا بھروسہ اپنی کوشش، مال، یا دنیوی اسباب پر نہ ہو، بلکہ صرف اور صرف مسبب الاسباب (اللہ) کی ذات پر ہو۔ قرآنِ مجید نے توکل کو ایمان کی شرط قرار دیا ہے اور توکل کرنے والوں کے لیے اللہ کی کفالت کا عظیم وعدہ فرمایا ہے: ﴿وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ ۚ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ "اور جو شخص اللہ پر توکل (بھروسہ) کرتا ہے تو وہ اسے کافی ہے۔ یقیناً اللہ اپنا کام پورا کر کے ہی رہتا ہے، بے شک اللہ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے"[1]۔ توکل کا معیار یہ ہے کہ انسان دنیا کی شدید ترین آزمائشوں، کٹھن حالات اور دشواریوں میں بھی خوفزدہ یا مایوس نہ ہو۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے آپ کے ایک صحابی نے پوچھا کہ توکل کی حد اور معیار کیا ہے؟ تو آپؑ نے ایک انتہائی جامع اور روح پرور جواب دیا: «أَنْ لَا تَخَافَ مَعَ اللَّهِ شَيْئاً» "یہ کہ اللہ کے ہوتے ہوئے تم کسی بھی شے سے خوفزدہ نہ ہو"[2]۔

٢. وَاجْعَلْنِي فِيهِ مِنَ الْفَائِزِينَ لَدَيْكَ

حقیقی کامیابی (فوز) اور زاویۂ نگاہ

دعا کا دوسرا تقاضا کامیابی کے اصل معیار کو سمجھنے اور اسے پانے سے متعلق ہے: "اور مجھے اس

---

[1] قرآن مجید، سورہ الطلاق، آیت ۳۔

[2] شیخ صدوق، معانی الأخبار، صفحہ ۲۶۱۔

میں تیرے ہاں کامیاب ہونے والوں (فائزین) میں سے قرار دے"۔ اس فقرے میں دو لفظ انتہائی غور طلب ہیں: "الْفَائِزِينَ" (کامیاب لوگ) اور "لَدَيْكَ" (تیرے ہاں/تیرے نزدیک)۔ دنیا کا تصورِ کامیابی بہت سطحی ہے۔ دنیوی نگاہ میں کامیاب وہ ہے جس کے پاس دولت ہو، اقتدار ہو، اور جو دنیوی مقابلوں میں جیت جائے۔ لیکن قرآنِ مجید اس مادی کامیابی کو سراب قرار دیتا ہے اور حقیقی فوز (کامیابی) کا معیار یوں بیان کرتا ہے: ﴿فَمَن زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾ "پس جو جہنم کی آگ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا، تو یقیناً وہی کامیاب (فائز) ہوا، اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ بھی نہیں"[1]۔ لفظ "لَدَيْكَ" انسان کے زاویۂ نگاہ کو بدل دیتا ہے۔ ہم اللہ سے یہ نہیں مانگ رہے کہ مجھے لوگوں کی نظر میں کامیاب کر دے، بلکہ التجا یہ ہے کہ "تیرے ہاں" کامیاب قرار دے۔ بسا اوقات انسان دنیا والوں کی نظر میں ہار جاتا ہے اور اس کا سب کچھ چھن جاتا ہے، لیکن اللہ کی نگاہ میں وہ سب سے بڑا "فائز" اور کامیاب ہوتا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام کی زبان سے مسجدِ کوفہ کے محراب میں نکلنے والے تاریخی کلمات اسی کامیابی کی گواہی ہیں: «فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ» "ربِ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا"[2]۔

---

[1] قرآن مجید، سورہ آل عمران، آیت ۱۸۵۔

[2] ابن شہر آشوب، مناقب آل أبی طالب، جلد ۳، صفحہ ۳۱۲۔

۳. وَاجْعَلْنِي فِيهِ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ إِلَيْكَ

مقربین کا مقام اور عبادات کا حتمی ثمر

تیسرا تقاضا بندگی کی معراج اور طریقت کی آخری منزل ہے: "اور مجھے اس میں اپنے مقربین (انتہائی قریب کیے گئے بندوں) میں سے قرار دے"۔ جب انسان کا توکل کامل ہو جائے اور وہ اللہ کی بارگاہ میں امتحان پاس کر کے کامیاب ہو جائے، تو اس کا حتمی نتیجہ "قربِ الٰہی" ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے مقربین کا مقام عام جنتیوں سے بہت بلند ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں ان کے اس عظیم مقام کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے: ﴿وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ۞ أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ ۞ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ﴾ "اور جو (نیکیوں میں) سبقت لے جانے والے ہیں، وہی تو آگے بڑھنے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو (اللہ کے) مقرب ہیں، جو نعمتوں والی جنتوں میں ہوں گے"[1]۔ روزہ در حقیقت اسی قربت کا سب سے مؤثر اور تیز ترین ذریعہ ہے۔ دیگر تمام عبادات میں ریاکاری کا خطرہ موجود رہتا ہے، لیکن روزہ ایک ایسا پوشیدہ عمل ہے جو صرف اللہ اور بندے کے درمیان ہوتا ہے۔ اسی لیے حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ نے روزے دار کے قرب کو یوں بیان فرمایا ہے: «الصَّوْمُ لِي وَأَنَا أُجْزَى بِهِ» "روزہ خالصتاً میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا دوں گا (یا ایک قراءت کے مطابق: میں خود ہی اس کی جزا بن جاؤں گا)"[2]۔

---

[1] قرآن مجید، سورہ الواقعہ، آیت ۱۰-۱۲۔

[2] محمد بن حسن حر عاملی، وسائل الشیعہ، جلد ۱۰، صفحہ ۴۰۰۔

٤ . بِإِحْسَانِكَ يَا غَايَةَ الطَّالِبِينَ

احسانِ پروردگار اور جستجو کی آخری منزل

دعا کا اختتام انسان کی عاجزی اور اللہ کی عظمت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے ایک نہایت خوبصورت واسطے پر ہوتا ہے: "اپنے احسان کے واسطے، اے طلب کرنے والوں کی آخری منزل"۔ بندہ جانتا ہے کہ توکل، کامیابی اور اللہ کا قرب — یہ اتنے بلند مقامات ہیں کہ انسان اپنے چند دن کے روزوں اور ٹوٹی پھوٹی عبادتوں کی قیمت پر انہیں ہرگز نہیں خرید سکتا۔ لہٰذا وہ فوراً اپنے عمل سے نظر ہٹا کر اللہ کے "احسان" کا واسطہ دیتا ہے۔ اور "غَايَةَ الطَّالِبِينَ" کا مطلب ہے انتہا، آخری نقطہ، یا وہ منزل جس کے بعد کوئی اور منزل باقی نہ رہے۔ دنیا میں انسان جس چیز کو بھی طلب کرتا ہے، اسے پا لینے کے بعد اس کی طلب ختم نہیں ہوتی، لیکن جب انسان خدا کو طلب کرتا ہے، تو خدا کی ذات چونکہ لامحدود ہے، اس لیے وہ انسان کی طلب کی آخری منزل بن جاتی ہے۔ رمضان المبارک کے پہلے عشرے کا اختتام اس عظیم دعا پر ہوتا ہے جو انسان کو مادی آرزوؤں کی پستی سے نکال کر، توکل اور رضائے الٰہی کی اس بلندی پر لا بٹھاتی ہے جہاں فرشتے بھی اس کے مقام پر رشک کرتے ہیں۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے دسویں دن کی دعا درحقیقت انسانی ارتقاء کی اس عظیم منزل کی نشاندہی کرتی ہے جہاں مادی آرزوئیں ختم ہو جاتی ہیں اور انسان کا زاویۂ نگاہ مکمل طور پر بدل جاتا ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے: **توکل کا فلسفہ اور اسباب سے بے نیازی:** دعا کا آغاز 'متوکلین' کی صف میں شامل ہونے کی التجا سے ہوتا ہے۔ توکل ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کا نام نہیں، بلکہ

اپنی پوری کوشش کرنے کے بعد دل کا صرف اللہ کی ذات پر مطمئن ہو جانا ہے۔ امام صادق علیہ السلام کے فرمان کے مطابق، توکل کا معیار یہ ہے کہ انسان اللہ پر یقین رکھتے ہوئے دنیا کی کسی بھی شے یا کٹھن حالات سے خوفزدہ نہ ہو۔ **فوزِ عظیم اور زاویۂ نگاہ کی تبدیلی:** دعا میں 'فائزین' (کامیاب لوگ) بننے کی التجا کے ساتھ لفظ 'لَدَیکَ' (تیرے نزدیک) کا اضافہ انسان کی سوچ بدل دیتا ہے۔ دنیوی نگاہ میں ہار جانے والا یا مظلوم شخص، اگر اللہ کی نگاہ میں سرخرو ہے تو وہی سب سے بڑا فائز ہے۔ امیر المومنین علی علیہ السلام کی محرابِ کوفہ میں ادا کی گئی تاریخی قسم "فُزتُ وربِّ الکعبہ" اسی حقیقی اور ابدی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ **مقربین کا بلند ترین مقام:** جب انسان کا توکل کامل ہو جاتا ہے اور وہ اللہ کی بارگاہ میں کامیاب ٹھہرتا ہے، تو اسے 'قربِ الٰہی' نصیب ہوتا ہے۔ مقربین کا درجہ جنت کی عام نعمتوں سے بہت بلند ہے۔ چونکہ روزہ ایک خالص اور پوشیدہ عمل ہے جس میں ریاکاری کا دخل نہیں، اس لیے حدیثِ قدسی کے مطابق یہ انسان کو اللہ کے سب سے زیادہ قریب کر دیتا ہے، یہاں تک کہ اللہ خود اس کی جزا بن جاتا ہے۔ **احسان اور جستجو کی آخری منزل:** چونکہ توکل، فوز اور قرب جیسے عظیم مقامات انسان کی ٹوٹی پھوٹی عبادتوں سے حاصل نہیں ہو سکتے، اس لیے دعا کا اختتام اللہ کے 'احسان' کے واسطے پر ہوتا ہے۔ بندہ اقرار کرتا ہے کہ دنیا کی ہر طلب فانی ہے، لیکن جب وہ اللہ کو پکارتا ہے تو وہ لامحدود ذات اس کی تمام تمناؤں اور جستجو کی آخری منزل (غایۃ الطالبین) بن جاتی ہے۔

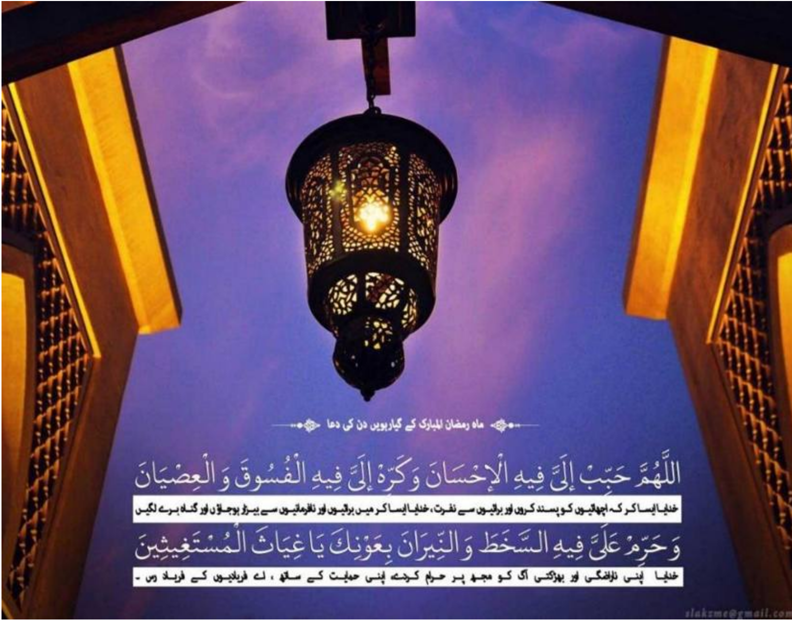
❖ رمضان المبارک کے پہلے عشرے کا اختتام اس عظیم دعا پر ہوتا ہے جو انسان کو دنیوی خوف اور مادی سہاروں کی پستی سے نکال کر، توکل اور رضائے الٰہی کی اس بلندی پر لا بٹھاتی ہے جہاں فرشتے بھی اس کے مقام پر رشک کرتے ہیں۔

دوسراباب

دوسرا عشرہ: عشرۂ مغفرت، باطنی جراحی اور تزکیہ



گیارہویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ حَبِّبْ إِلَيَّ فِيهِ الْإِحْسَانَ، وَكَرِّهْ إِلَيَّ فِيهِ الْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ، وَحَرِّمْ عَلَيَّ فِيهِ السَّخَطَ وَالنِّيرَانَ، بِعَوْنِكَ يَا غِيَاثَ الْمُسْتَغِيثِينَ﴾

اے اللہ! میرے لیے اس مہینے میں احسان (نیکی) کو محبوب بنادے، اور اس میں مجھ پر فسق اور نافرمانی کو ناپسندیدہ کر دے، اور اس میں مجھ پر اپنی ناراضگی اور جہنم کی آگ کو حرام قرار دے، اپنی نصرت کے واسطے، اے فریاد کرنے والوں کے فریادرس۔

گیارہواں دن: باطنی جراحی اور قلب کی ماہیت کا ارتقاء

ماہِ رمضان کے پہلے عشرے (عشرۂ رحمت) کی تکمیل کے بعد، گیارہویں دن کی دعا سے انسان کی باطنی جراحی اور نفس کے کیمیائی ارتقاء کا ایک نیا اور انتہائی حساس مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ مناجات محض ظاہری اعمال کی بجاآوری یا گناہوں سے وقتی پرہیز کا نام نہیں، بلکہ یہ شریعت کو انسان کی فطرت میں گوندھ دینے کی ایک عظیم الشان التجا ہے۔ اس دن کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ جب تک انسان کے دل میں نیکی انجام دینے کے حوالے سے طبعی محبت پیدا نہ ہو، اور گناہ سے قدرتی کراہت اور وحشت محسوس نہ ہو، تب تک اس کی بندگی مکمل نہیں ہوتی۔ ایک شخص خوف کی وجہ سے گناہ چھوڑتا ہے، جبکہ دوسرا گناہ کو اس کے اصلی اور غلیظ روپ میں دیکھ کر اس سے نفرت کرتا ہے؛ یہ دعا انسان کو اسی دوسری اور اعلیٰ ترین معرفت کی منزل پر لے جاتی ہے۔ جب سالک اللہ کی بارگاہ میں اپنے وجود کے اس انقلاب کی دعا کرتا ہے تو دراصل وہ اپنے دل کا ذائقہ بدلنے کا تقاضا کر رہا ہوتا ہے، تاکہ احسان (نیکی) اس کا عشق بن جائے، نافرمانی اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے، اور وہ پروردگار کے غضب اور جہنم کی آگ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو کر اس ذات کی پناہ میں آ جائے جو ہر فریاد کرنے والے کی آخری فریادرس ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے گیارہویں دن کی دعا انسان کے قلب کی ماہیت اور اس کے طبعی رجحانات کو تبدیل کرنے پر مرکوز ہے۔ یہ مناجات سالک کو اس مقام پر لے جاتی ہے جہاں احکامِ شریعت اس کے لیے بوجھ کے بجائے محبت اور کشش کا باعث بن جاتے ہیں، اور گناہ اپنی تمام تر ظاہری

دلفریبی کے باوجود اس کے لیے باعثِ نفرت ہو جاتے ہیں۔ یہ دعا دراصل اللہ کی مدد (نصرت) کے ذریعے انسان کی سوچ، پسند اور ناپسند کو خالصتاً الٰہی سانچے میں ڈھالنے، اور اسے ابدی قہر اور جہنم سے محفوظ رکھنے کا ایک عظیم روحانی لائحہ عمل ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **احسان کی فطری محبت:** محض نیکی کی توفیق نہیں، بلکہ دل میں نیکی اور احسان (خصوصاً بندگانِ خدا اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک) کا ایسا عشق مانگنا جو اسے انسان کی فطرت اور لذت بنا دے۔
- **گناہوں سے قلبی کراہت:** عذاب کے ڈر سے گناہ چھوڑنے کے بجائے، معرفت کے اس درجے پر پہنچنا جہاں نافرمانی اور فسق انسان کو اپنے اصلی، غلیظ اور مکروہ روپ میں نظر آئیں اور وہ طبعاً ان سے نفرت کرنے لگے۔
- **غضب اور آگ کی حرمت:** اپنے اعمال کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے، خدا کی ناراضگی (سخط) اور روزِ قیامت کے اس ہولناک عذاب (آگ) سے بچنے کی التجا جسے برداشت کرنے کی انسان میں رتی برابر طاقت نہیں۔
- **فریاد رس کی نصرت کا واسطہ:** نفس کے اس انقلاب اور باطنی جراحی کے لیے اپنی قوت کے بجائے اللہ کی اُس مدد (عون) کو پکارنا، جو ہر بے بس اور فریاد کرنے والے (مستغیث) کی دادرسی کرتی ہے۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

۱. اَللَّهُمَّ حَبِّبْ إِلَيَّ فِيهِ الْإِحْسَانَ

احسان کی محبت اور قلبی رجحان

زندگی ایک وقفے کا نام ہے، جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں اذان دی جاتی ہے اور جب مرتا ہے تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی جاتی ہے، گویا اس اذان سے نماز تک کے وقفے کا نام زندگی ہے۔ پروردگار انسان کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اس وقفے کا دورانیہ کس طرح گزارتا ہے اور وہ زندگی گزارنے کے لیے کون سی راہ اختیار کرتا ہے، نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے یا برائی کی۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾ "یقیناً ہم نے اسے راستہ دکھادیا ہے، اب چاہے وہ شکر گزار بنے یا ناشکرا"[1]۔

اس دعائیہ فقرے میں ہم نیکی کی توفیق نہیں، بلکہ "نیکی کی محبت" (حبّب) مانگ رہے ہیں۔ جب دل میں کسی چیز کی محبت بس جاتی ہے، تو اسے انجام دینا بوجھ نہیں بلکہ لذت بن جاتا ہے۔ اسلامی اور انسانی اخلاق کا تقاضا ہے کہ ہم کام بنانے والے بنیں بگاڑنے والے نہیں؛ لوگوں کی مشکلات حل کریں، کیونکہ یہ کہنا کہ ہمارا رہنما اور رہبر مشکل کشا ہے لیکن عملی زندگی میں اگر ہم اس مشکل کشا کی سیرت پر عمل نہ کریں تو ہمیں کس منھ سے حق پہنچتا ہے کہ ہم کہیں کہ ہم ان کے ماننے والے ہیں۔

قرآنِ مجید میں احسان کرنے والوں کی تعریف یوں کی گئی ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ

---

[1] قرآن مجید، سورہ الانسان، آیت ۳۔

وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ "بیشک اللہ عدل، احسان اور قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے اور بدکاری، ناشائستہ حرکات اور ظلم سے منع کرتا ہے، وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ شاید تم اسی طرح نصیحت حاصل کرلو"[۱]۔ احسان اور نیکی کے بہترین مصادیق میں سے ایک والدین کے ساتھ نیکی اور اچھابرتاؤ ہے: ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ "اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا"[۲]۔

۲. وَكَرِّهْ إِلَيَّ فِيهِ الْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ

گناہ سے قلبی کراہت اور نفسانی طہارت

لوگوں کی دو قسمیں ہیں: کچھ لوگ گناہ سے لگاؤ تو رکھتے ہیں لیکن خوفِ خدا کی وجہ سے گناہ نہیں کرتے؛ جبکہ دوسری قسم کے لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں گناہوں سے قلبی نفرت ہوتی ہے، وہ گناہ کو کراہت بھری نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ مرحلہ انسان کی معرفت سے مرتبط ہے؛ جیسی جس کی معرفت ہوگی ویسے ہی وہ چیزوں کو دیکھے گا۔ جنابِ یوسف علیہ السلام کا واقعہ دیکھ لیجیے، انہوں نے گناہ کی آلودگی میں گرنے کے بجائے قید خانے میں رہنے کو ترجیح دی: ﴿قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ﴾ "یوسف نے دعا کی کہ پروردگار! جس کام کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں اس کی نسبت مجھے قید پسند ہے"[۳]۔

---

[۱] قرآن مجید، سورہ النحل، آیت ۹۰۔

[۲] قرآن مجید، سورہ البقرہ، آیت ۸۳۔

[۳] قرآن مجید، سورہ یوسف، آیت ۳۳۔

یعنی انسان اس منزل پر پہنچ جائے کہ وہ گناہ کو اس کے اصلی اور مکروہ روپ میں دیکھنے لگے، جیسے مالِ حرام کھانے کو آگ کی صورت میں دیکھنے لگے۔ مشہور تابعی ابن سیرین کا واقعہ عبرت انگیز ہے کہ جب وہ ایک بدکار عورت کے گھر میں گرفتار ہو گئے تو انہوں نے گناہ سے نجات کے لیے گھر میں موجود نجاست اور گندگی کو اپنے اوپر ڈال لیا تاکہ جسم آلودہ ہو جائے مگر روح پاک رہے[1]۔ گناہ اور معصیت کی طرف جانے کا اصل سبب بظاہر اس میں نظر آنے والی رنگینی ہے جو انسان کو کھینچتی ہے، لیکن شیطان کی اس ملمع سازی سے بچنے کے لیے گناہ سے نفرت مانگنا انتہائی ضروری ہے۔

۳. وَحَرِّمْ عَلَيَّ فِيهِ السَّخَطَ وَالنِّيرَانَ، بِعَوْنِكَ يَا غِيَاثَ الْمُسْتَغِيثِينَ

قہرِ الٰہی سے پناہ اور مدد کی التجا

غیض و غضبِ پروردگار اور آتشِ جہنم کی سوزش معادِ جسمانی کی یاد دلاتی ہے، جب ہم اپنے جسموں کے ساتھ روزِ معاد حاضر ہوں گے: ﴿وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ﴾ "اور ہمارے لیے مثل بیان کرتا ہے اور اپنی خلقت کو بھول گیا ہے، کہتا ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے؟ آپ کہہ دیجیے کہ جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہی زندہ بھی کرے گا اور وہ ہر مخلوق کا بہتر جاننے والا ہے"[2]۔

ہم جب دنیا کی آگ کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تو کس طرح آتشِ دوزخ کو برداشت

---

[1] قاضی نور اللہ شوشتری، مجالس المؤمنین، جلد ۱، صفحہ ۲۴۔

[2] قرآن مجید، سورہ یس، آیت ۷۸-۷۹۔

کریں گے؟ آئمہ معصومین علیہم السّلام خوفِ خدا سے اتنا گریہ کیا کرتے تھے کہ بیہوش ہو جایا کرتے تھے۔ دوسری جانب ہمیں رحمتِ خدا سے مایوس بھی نہیں ہونا چاہیے اور بندگی کا حق ادا کرتے رہنا چاہیے، جب تک دنیا میں ہیں توبہ کرنے کی فرصت ہے۔ سورۂ قیامہ میں ارشاد ہے: ﴿بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ﴾ "بلکہ انسان خود بھی اپنے نفس کے حالات سے خوب باخبر ہے۔ چاہے وہ کتنے ہی عذر کیوں نہ پیش کرے"[1]۔

ہر کوئی اپنے آپ کو دوسرے سے بہتر جانتا ہے کہ اس کے حالات کیا ہیں۔ لہٰذا، ہم اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ "اے فریاد کرنے والوں کے فریاد رس" ہمیں اپنی مدد کے ذریعے اس عذاب اور ناراضگی سے محفوظ فرما۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے گیارہویں دن کی دعا درحقیقت نفس کی کیمیائی تبدیلی اور معرفت کے اعلیٰ درجے کے حصول کا نام ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

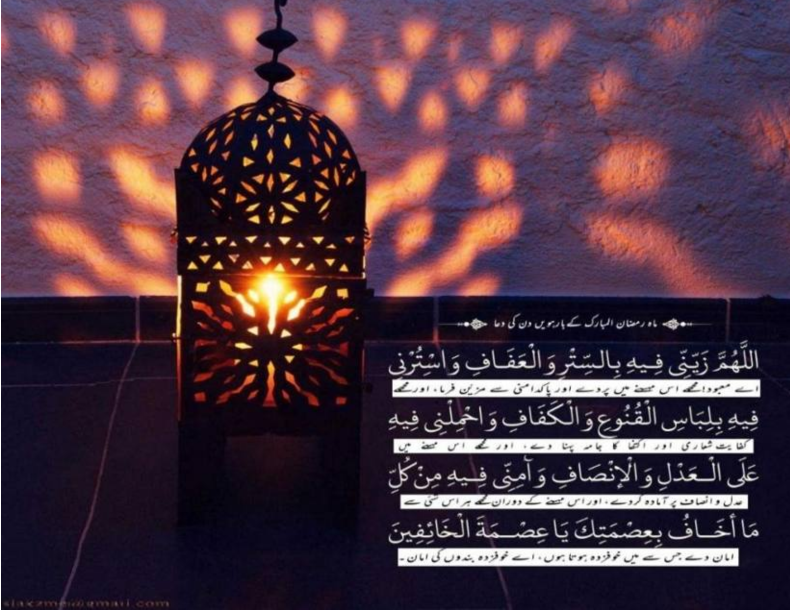
احسان اور نیکی سے قلبی لگاؤ: دعا کا آغاز 'احسان' (نیکی) کو محبوب بنانے کی التجا سے ہوتا ہے۔ زندگی اذان سے جنازے تک کے مختصر وقفے کا نام ہے، اور اللہ نے انسان کو شکر گزاری (نیکی) یا ناشکری کے راستے کے انتخاب کا اختیار دیا ہے۔ اس دعا میں نیکی کی محض طاقت نہیں بلکہ اس کی 'محبت' مانگی گئی ہے۔ جب نیکی سے محبت ہو جائے تو دوسروں کی مشکل کشائی، عدل، اور بالخصوص والدین سے حسنِ سلوک انسان کی فطرت بن جاتا ہے اور بندگی بوجھ نہیں رہتی۔ **فسق و فجور سے طبعی وحشت:** بندگی کی

[1] قرآن مجید، سورہ القیامہ، آیت ۱۴-۱۵۔

معراج یہ نہیں کہ انسان دل میں گناہ کی خواہش رکھے مگر خوف سے رکا رہے، بلکہ معراج یہ ہے کہ انسان کا دل ہی گناہ سے کراہت کرنے لگے۔ یہ معرفت کا وہ درجہ ہے جہاں انسان گناہ (جیسے حرام مال یا بدکاری) کو اس کی اصلی اور غلیظ شکل (آگ اور نجاست) میں دیکھتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا گناہ کے آلودہ ماحول پر قید خانے کی تکالیف کو ترجیح دینا اسی باطنی طہارت اور قلبی نفرت کی شاندار مثال ہے۔ **قہرِ الٰہی اور آتشِ جہنم سے پناہ:** دعا کے تیسرے فقرے میں اللہ کے غضب اور جہنم کی آگ کو خود پر حرام کرنے کی التجا کی گئی ہے۔ یہ معاد (قیامت) پر کامل یقین کی عکاسی ہے۔ انسان، جو دنیا کی معمولی آگ کی تپش برداشت نہیں کر سکتا، وہ آخرت کے عذاب کا کیسے متحمل ہو سکتا ہے؟ یہ فقرہ انسان کو احساس دلاتا ہے کہ وہ اپنے باطن کا خود سب سے بڑا محاسب (بصیرہ) ہے، لہٰذا وہ بہانے تراشنے کے بجائے وقت رہتے اللہ کی پناہ طلب کرے۔ **غیاث المستغیثین کی نصرت:** چونکہ نفس کی پسند اور ناپسند کو بدلنا اور آخرت کے عذاب سے بچنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، اس لیے دعا کا اختتام ایک عظیم واسطے پر ہوتا ہے۔ بندہ اللہ کی نصرت (عَون) کا سہارا لیتے ہوئے اسے 'غیاث المستغیثین' کہہ کر پکارتا ہے، یعنی اے وہ ذات جو اس وقت فریاد سنتی اور مدد کو پہنچتی ہے جب کائنات کا ہر دروازہ بند ہو چکا ہو۔

- رمضان المبارک کے گیارہویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ جب تک احکامِ الٰہی انسان کی پسند نہ بن جائیں اور گناہ سے اسے قدرتی وحشت نہ ہونے لگے، اس کی باطنی جراحی مکمل نہیں ہوتی۔ جب انسان سچے دل سے اللہ کو اپنا فریاد رس مان لیتا ہے، تو اللہ اس کے دل کا ذائقہ بدل کر نیکی کو اس کا عشق بنا دیتا ہے۔

بارہویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ زَيِّنِّي فِيهِ بِالسِّتْرِ وَالْعَفَافِ، وَاسْتُرْنِي فِيهِ بِلِبَاسِ الْقُنُوعِ وَالْكَفَافِ، وَاحْمِلْنِي فِيهِ عَلَى الْعَدْلِ وَالْإِنْصَافِ، وَآمِنِّي فِيهِ مِنْ كُلِّ مَا أَخَافُ، بِعِصْمَتِكَ يَا عِصْمَةَ الْخَائِفِينَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں پردہ پوشی اور پاکدامنی سے مزین فرما، اور مجھے اس میں قناعت اور کفایت شعاری کا لباس پہنا دے، اور مجھے اس میں عدل و انصاف پر آمادہ کر، اور مجھے اس میں ہر اس چیز سے امان دے جس سے میں ڈرتا ہوں، اپنی عصمت (حفاظت) کے واسطے، اے ڈرنے والوں کو پناہ دینے والے۔

بارہویں دن: اخلاقِ حسن، قناعت اور باطنی طمانیت

ماہِ صیام کے دوسرے عشرے (عشرۂ مغفرت) کے آغاز میں، بارہویں دن کی دعا انسان کے اخلاقِ حسن، نفسیاتی سکون اور معاشرتی توازن کا ایک انتہائی خوبصورت اور جامع خاکہ پیش کرتی ہے۔ یہ مناجات ہمیں سکھاتی ہے کہ انسان کی حقیقی زینت قیمتی لباس یا مادی آرائش میں نہیں، بلکہ عیوب کی پردہ پوشی (ستر) اور پاکدامنی (عفاف) میں پوشیدہ ہے۔ جب انسان دوسروں کی خامیاں تلاش کرنے کے بجائے اپنے عیوب کی اصلاح میں لگ جاتا ہے، تو معاشرے میں امن اور پاکیزگی پروان چڑھتی ہے۔ اس دعا کا دوسرا اور انتہائی اہم پہلو انسان کو حرص، لالچ اور مادی ہوس کے گرداب سے نکال کر 'قناعت' اور 'کفاف' (حسبِ ضرورت رزق پر راضی رہنے) کا لباس پہنانا ہے۔ یہ لباس انسان کو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ذلت اور دولت کے انبار جمع کرنے کی ہلاکت خیز محنت سے بچا کر اطمینانِ قلب کی وہ دولت عطا کرتا ہے جس کا کوئی متبادل نہیں۔ مزید برآں، یہ دعا زندگی کے ہر معاملے میں عدل و انصاف اور میانہ روی کا درس دیتی ہے، جو ایک مستحکم اور پر سکون زندگی کی بنیاد ہے۔ اس بیان کا لبِ لباب یہ ہے کہ جب انسان پاکدامنی، قناعت اور عدل کو اپنا لیتا ہے، تو اس کے دل سے دنیا کا ہر خوف اور وسوسہ ختم ہو جاتا ہے، اور وہ اس پروردگار کی مضبوط پناہ (عصمت) میں آ جاتا ہے جو ڈرنے والوں کی واحد اور آخری جائے پناہ ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے بارہویں دن کی دعا انسان کو باطنی اور اخلاقی کمال کی طرف بلاتی ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ سچی عزت اور خوبصورتی ظاہری نمود و نمائش کے بجائے پردہ پوشی اور پاکدامنی میں ہے۔ یہ دعا انسان کو کثرتِ مال کی ہوس (تکاثر) سے نکال کر قناعت کے ذریعے بادشاہی عطا کرتی ہے، معاملات میں اعتدال اور عدل کا راستہ دکھاتی ہے، اور تمام مادی اور دنیوی خوف سے آزاد کر کے خالقِ کائنات کے پُرامن حصار میں لے آتی ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **عیوب کی پردہ پوشی اور عفاف:** دوسروں کی ٹوہ میں لگنے کے بجائے اپنے عیوب پر نظر رکھنا، اور خود کو ہر قسم کی اخلاقی اور باطنی آلودگی سے پاک رکھ کر حقیقی زینت پانا۔
- **قناعت اور کفاف کا لباس:** بے جا خواہشات اور لالچ کے ناسور سے بچ کر، اللہ کے دیے ہوئے بقدرِ ضرورت (کفاف) رزق پر راضی رہنا اور اسے اپنا لباسِ عزت بنانا۔
- **عدل و انصاف پر استقامت:** زندگی کے تمام معاملات، بالخصوص معاشی اور اقتصادی امور میں افراط و تفریط سے بچ کر میانہ روی اور اعتدال کا راستہ اختیار کرنا۔
- **دنیوی خوف سے نجات:** مال چھن جانے، جان جانے یا دنیوی ناکامیوں کے وسوسوں سے آزاد ہو کر، ڈرنے والوں کو پناہ دینے والے رب کی حفاظت (عصمت) میں آجانا۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

١. اَللَّهُمَّ زَيِّنِّي فِيهِ بِالسِّتْرِ وَالْعَفَافِ

عیوب کی پردہ پوشی اور پاکدامنی کی زینت

حجاب اور ستر کا مطلب صرف ظاہری پردہ نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک اہم پہلو لوگوں کے گناہوں کی پردہ پوشی اور اسے مخفی کرنا ہے۔ خوش قسمت ہے وہ بندہ جو اپنے عیب تلاش کرتا ہے اور دوسروں کے عیب کی پروا نہیں کرتا۔ اگر ہم دوسروں کی اچھائی اور اپنے عیبوں پر نظر رکھیں تو پورا معاشرہ سدھر جائے۔ اگر انسان اپنے عیوب کی جانب توجہ دے اور ان کی اصلاح کی کوشش کرے، تو دوسروں کے عیوب و نقائص کی جانب متوجہ ہی نہیں ہوگا۔

رسولِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی باطنی طہارت اور ستر کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: «طُوبَى لِمَنْ شَغَلَهُ عَيْبُهُ عَنْ عُيُوبِ النَّاسِ» "خوش نصیب ہے وہ شخص جس کے اپنے عیوب اسے دوسروں کے عیوب تلاش کرنے سے روکے رکھیں"[1]۔

دعا کے تسلسل میں "عفاف" (پاکدامنی) آیا ہے۔ عفاف یعنی گناہ نہ کرے اور اپنے نفس کو آلودگی سے پاک رکھے۔ دوسروں کے گناہ بیان نہ کرنا بھی عفاف و پاکدامنی کا حصہ ہے۔

---

[1] محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، جلد ۷۲، صفحہ ۴۱۹۔

۲. وَاسْتُرْنِي فِيهِ بِلِبَاسِ الْقُنُوعِ وَالْكَفَافِ

قناعت اور کفاف، اطمینانِ قلب کا لباس

"کفاف" کا مطلب یہ ہے کہ انسان سادہ زندگی گزارے اور جتنی چادر ہو اتنے ہی پیر پھیلائے۔ اگر مال و ثروت حد سے زیادہ ہو، تو اسیر و گرفتار ہونے کا خطرہ ہے، اور اگر کم ہو تو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ذلت کا اندیشہ ہے۔ اس لیے ہم خدا سے "کفاف" مانگتے ہیں کہ بس اتنا ہو جو ہماری ضرورت کو پورا کر دے۔

قناعت سے انسان عزتمند ہوتا ہے۔ قناعت کا مطلب ہے جو میسر ہے اس پر راضی رہنا اور طمع و لالچ کو اکھاڑ پھینکنا۔ اگر بے جا خواہشات کو اہمیت دی جائے تو انسان حرص کے چنگل میں پھنس کر بدبودار دنیا میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ نفس کی آرزوئیں ایسے کنویں کی طرح ہیں جو کبھی نہیں بھرتا۔ "تکاثر" (کثرت طلبی) ایک ایسا درد ہے جو بشریت کے لیے ناسور ہے اور اس کا تنہا مرہم "قناعت" ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: «مَنْ قَنِعَ بِمَا قُسِمَ لَهُ اسْتَرَاحَ مِنَ الْهَمِّ وَالْكَرْبِ وَالتَّعَبِ» "جو شخص اللہ کی دی ہوئی روزی (اور نعمتوں) پر قانع ہو جائے، تو وہ غم، مصیبت اور تھکاوٹ سے نجات پا جاتا ہے"[1]۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: «لَا أَعَزَّ مِنْ قَانِعٍ» "قناعت کرنے والے (کفایت شعار) سے بڑھ کر کوئی شخص عزت دار نہیں ہے"[2]۔

---

[1] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۲، صفحہ ۱۳۹۔

[2] سید رضی، نہج البلاغہ، حکمت ۱۱۳۔

۳. وَاحْمِلْنِي فِيهِ عَلَى الْعَدْلِ وَالْإِنْصَافِ

عدل و انصاف کی راہ پر استقامت

دعا کے اس حصے کی روشنی میں عدل کا ایک وسیع مفہوم "میانہ روی" ہے۔ جو کوئی اپنی زندگی کو افراط و تفریط سے بچائے رکھے، وہ خطِّ عدل پر ہے۔ زندگی کے تمام معاملات، بالخصوص اقتصادی معاملات میں ہمیں میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔ اگر مسلسل سعی و کوشش کے بعد بھی آمدنی زیادہ نہ ہو تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ اپنی مختصر آمدنی عقلمندی سے خرچ کی جائے اور ضرورتوں کو محدود کیا جائے۔ اکثر پریشانیاں بلند و بالا آرزوؤں اور اقتصادی شعور نہ ہونے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: «مَا مِنْ عَبْدٍ إِلَّا وَفِيهِ خَيْرٌ وَشَرٌّ إِلَّا مَنْ أَلْهَمَهُ اللّٰهُ الاِقْتِصَادَ فِي مَعِيشَتِهِ» "معاشی زندگی میں نظم و ضبط اور اعتدال، انسانی زندگی کی تکمیل کا حصہ ہے (جو اس سے خالی ہو، وہ فلاح نہیں پا سکتا)"[1]۔

انسان کو عدل اور انصاف کو صرف دوسروں کے لیے نہیں، بلکہ اپنی ذات کے لیے بھی نافذ کرنا چاہیے اور میانہ روی کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔

[1] حسن بن علی ابن شعبہ حرانی، تحف العقول، صفحہ ۲۹۲۔

٤. وَآمِنِّي فِيهِ مِنْ كُلِّ مَا أَخَافُ، بِعِصْمَتِكَ يَا عِصْمَةَ الْخَائِفِينَ

خوفِ دنیا سے نجات اور حصارِ الٰہی

اگر انسانی رویوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہمارے خوف کا سارا دار و مدار اس دنیائے فانی کے نفع و نقصان پر ہی ہے۔ دنیا کی ناکامی کا خوف، جان جانے کا خوف، دولت چھن جانے کا خوف اور دشمن کا خوف؛ یہ سب انسان کے ذہن میں وسوسے پیدا کرتے ہیں۔ مادی وسائل اور دنیوی آسائشوں کے حصول کے باوجود ہر انسان دکھی ہے، آپس میں محبت ختم ہوتی جا رہی ہے اور رشتے ٹوٹ رہے ہیں۔ اس کا سیدھا سا جواب یہی ہے کہ ہم نے رب العزت کی ذات کو بھلا دیا ہے۔ خوفِ خدا اور اللہ کی رحمت کی امید، یہ دونوں شاملِ حال ہوں تو راحت و اطمینان والی زندگی میسر آ سکتی ہے۔ ہم اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑاتے ہیں کہ "اپنی عصمت و حفاظت میں رکھ اسے جو ڈرتا ہے"، یعنی اے پروردگار، ہماری حفاظت فرما اور ہمیں ہر اس باطنی اور ظاہری خوف سے نجات دے جو تیرے علاوہ کسی اور سے پیدا ہوتا ہے۔

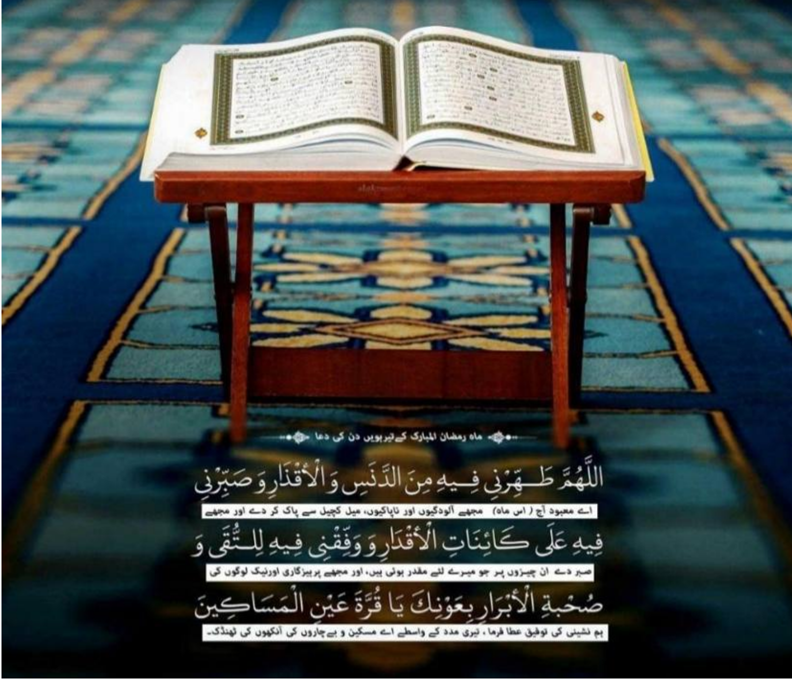
خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے بارہویں دن کی دعا در حقیقت نفس کی تربیت، اخلاقِ حسن اور باطنی طمانیت کے حصول کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے: **پردہ پوشی اور پاکدامنی کی حقیقی زینت:** دعا کا آغاز 'ستر' اور 'عفاف' سے مزین ہونے کی التجا سے ہوتا ہے۔ حجاب اور ستر محض ظاہری لباس کا نام نہیں، بلکہ اس کا عظیم پہلو لوگوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا اور اپنی خامیوں کی اصلاح کرنا ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق، سب سے خوش نصیب وہ ہے جسے اپنے عیوب

دوسروں کی خامیاں تلاش کرنے سے روکے رکھیں۔ اس کے ساتھ پاکدامنی (عفاف) انسان کو گناہوں کی آلودگی سے بچا کر معاشرے کو پاکیزہ بناتی ہے۔ **قناعت اور کفاف، اطمینانِ قلب کا لباس:** انسان کی آرزوئیں ایک نہ بھرنے والے کنویں کی طرح ہیں، اور 'تکاثر' (کثرت طلبی) بشریت کا وہ ناسور ہے جس کا واحد مرہم 'قناعت' ہے۔ دعا میں التجا کی گئی ہے کہ اے اللہ، مجھے 'کفاف' (بقدرِ ضرورت رزق) کا لباس پہنا دے۔ کثرتِ مال انسان کو اسیر بنا دیتی ہے اور کمی اسے ذلیل کرتی ہے۔ قناعت وہ لباس ہے جو انسان کو حرص کی بدبودار دنیا سے نکال کر عزت اور دلی سکون عطا کرتا ہے۔ **عدل و انصاف اور معاشی میانہ روی:** دعا کے تیسرے فقرے میں عدل و انصاف پر کاربند رہنے کی التجا کی گئی ہے۔ یہاں عدل کا ایک وسیع مفہوم 'میانہ روی' (اعتدال) ہے۔ اکثر ذہنی پریشانیاں بلند و بالا آرزوؤں اور معاشی معاملات میں بے اعتدالی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ امام باقرؑ کے فرمان کی روشنی میں، معاشی زندگی میں نظم و ضبط اور میانہ روی، انسانی تکمیل کا لازمی حصہ ہے جو اسے افراط و تفریط کی تباہی سے بچاتا ہے۔ **خوفِ دنیا سے نجات اور حصارِ الٰہی:** آج کے دور میں انسان کا ہر خوف (ناکامی، بیماری، فقیری) دنیا کے نفع و نقصان سے جڑا ہے۔ اس کا بنیادی سبب رب العزت کی ذات کو بھلا دینا ہے۔ دعا کا اختتام اس پُر امید التجا پر ہوتا ہے کہ اے ڈرنے والوں کو پناہ دینے والے رب، مجھے اپنی عصمت (حفاظت) کے ذریعے ہر اس مادی وسوسے اور خوف سے امان عطا فرما جو تیرے علاوہ کسی اور شے سے پیدا ہوتا ہے۔

❖ رمضان المبارک کے بارہویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ جب انسان پاکدامنی کو اپنی زینت بناتا ہے، قناعت کا لباس پہنتا ہے، اور اپنی زندگی کو عدل و اعتدال کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے، تو دنیا کا کوئی خوف اسے پریشان نہیں کر سکتا اور وہ خدا کی محفوظ ترین پناہ گاہ میں آجاتا ہے۔

تیرہویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ طَهِّرْنِي فِيهِ مِنَ الدَّنَسِ وَالْأَقْذَارِ، وَصَبِّرْنِي فِيهِ عَلَىٰ كَائِنَاتِ الْأَقْدَارِ، وَوَفِّقْنِي فِيهِ لِلتُّقَىٰ وَصُحْبَةِ الْأَبْرَارِ، بِعَوْنِكَ يَا قُرَّةَ عَيْنِ الْمَسَاكِينِ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں میل کچیل اور گندگیوں سے پاک کر دے، اور مجھے اس میں مقدر شدہ حوادث (فیصلوں) پر صبر عطا فرما، اور مجھے اس میں تقویٰ اور نیکوکاروں کی صحبت کی توفیق دے، اپنی مدد کے واسطے، اے مسکینوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک۔

تیرھواں دن: باطنی طہارت، صبرِ جمیل اور نیکوں کی ہم نشینی

ماہِ رمضان کے دوسرے عشرے میں، جب انسان اپنی ظاہری اور معاشرتی اصلاح کے مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے، تیرہویں دن کی دعا اس کی توجہ دوبارہ اس کے باطن کی گہرائیوں کی طرف موڑ دیتی ہے۔ یہ مناجات درحقیقت دل کے آئینے پر جمے ہوئے گناہوں اور روحانی غلاظتوں کے اس زنگ کو کھرچنے کی التجا ہے جو انسان کو حق قبول کرنے سے روکتا ہے۔ اس دعا کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ جسمانی طہارت کے لیے پانی کافی ہے، لیکن روح کی آلودگیوں (کینہ، حسد، ریاکاری) کو صرف اللہ کا فضل اور سچی توبہ ہی دھو سکتی ہے۔ باطنی صفائی کے بعد، یہ دن انسان کو بندگی کی سب سے کٹھن آزمائش، یعنی 'مقامِ رضا' کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے۔ یہ اس بات کا شعور ہے کہ زندگی میں آنے والے مصائب، بیماریاں اور نقصانات اللہ کے طے شدہ فیصلے (قضا و قدر) ہیں، اور ان پر شکوہ کرنے کے بجائے صبر کرنا ہی ایمان کی معراج ہے۔ مزید برآں، یہ دعا انسان کو بتاتی ہے کہ تقویٰ کے حصول اور اس کی حفاظت کے لیے پاکیزہ کردار والے انسانوں (ابرار) کی صحبت ناگزیر ہے، کیونکہ انسان کی شخصیت اس کے ہم نشینوں کے رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ ان تمام کٹھن منازل کو طے کرنے کے لیے انسان اپنی طاقت کے بجائے اس پروردگار کی مدد (عَون) کا محتاج ہے جو درگاہِ الٰہی کے سچے مسکینوں کی آنکھوں کی واحد ٹھنڈک ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے تیرھویں دن کی دعا انسان کو باطنی آلودگیوں سے نجات دلانے اور اللہ کے فیصلوں پر راضی رہنے کا درس دیتی ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ روح کے زنگ کو دور کیے بغیر معرفت حاصل نہیں ہو سکتی، اور مقدر کی سختیوں پر صبر ہی ایمان کی پختگی کی دلیل ہے۔ یہ دعا تقویٰ کو اپنانے، پاکیزہ کردار والے انسانوں کی صحبت اختیار کرنے اور اپنی انا کو مٹا کر اللہ کے حضور سچا مسکین بننے کا ایک عظیم روحانی لائحہ عمل ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **روح کی گندگیوں سے طہارت:** جسمانی صفائی کے برعکس، دل کو گناہوں، حسد، تکبر اور ریاکاری کی ان باطنی نجاستوں (دنس اور اقذار) سے پاک کرنے کی التجا جو دل کے آئینے کو زنگ آلود کر دیتی ہیں۔ **مقدر کے فیصلوں پر صبر و رضا:** دنیا کی آزمائشوں، بیماریوں اور نقصانات (کائنات الاقدار) پر واویلا کرنے کے بجائے اللہ کی مشیت پر راضی رہنا اور صبر کا دامن تھامے رکھنا۔ **تقویٰ اور ابرار کی صحبت:** روزے کے حتمی ہدف (تقویٰ) کے حصول کی توفیق مانگنا، اور اس روحانی حالت کو محفوظ رکھنے کے لیے برے دوستوں کے بجائے نیک اور پاکیزہ ہستیوں (ابرار) کی ہم نشینی طلب کرنا۔ **اللہ کے حضور سچی مسکینی:** دولت کی کمی کے بجائے، عرفانی مسکینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بے بسی اور فقر کا اعتراف کرنا، اور اللہ کی اس مدد (عون) کو پکارنا جو بے قرار آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتی ہے۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

١. اَللَّهُمَّ طَهِّرْنِي فِيهِ مِنَ الدَّنَسِ وَالْأَقْذَارِ:

باطنی آلودگیوں سے نجات اور قلب کی طہارت

دعا کا پہلا فقرہ انسان کے ظاہر سے زیادہ اس کے باطن کی صفائی کا تقاضا کرتا ہے: "اے اللہ! مجھے اس مہینے میں میل کچیل اور گندگیوں سے پاک کر دے"۔

عربی لغت میں "دَنَس" اور "أَقْذار" ان نجاستوں اور گندگیوں کو کہا جاتا ہے جو انسان کے لباس یا جسم کو آلودہ کر دیتی ہیں۔ لیکن عرفانی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے، یہاں مراد جسمانی یا ظاہری گندگی نہیں ہے، کیونکہ اس کے لیے تو وضو اور غسل ہی کافی ہیں۔ یہاں مراد "روح کی گندگی" اور "قلب کی آلودگی" ہے جو گناہوں، حسد، کینہ، تکبر، اور ریاکاری کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔

انسان کا دل ایک شفاف آئینے کی مانند ہوتا ہے۔ جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس آئینے پر ایک سیاہ دھبہ (زنگ) پڑ جاتا ہے۔ مسلسل گناہوں سے یہ زنگ اتنا گہرا ہو جاتا ہے کہ دل حق کو قبول کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ قرآنِ مجید نے اس باطنی زنگ اور آلودگی کو نہایت بلیغ انداز میں بیان فرمایا ہے: ﴿كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ "ہرگز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال (گناہوں) کی وجہ سے زنگ چڑھ گیا ہے"[1]۔

---

[1] قرآن مجید، سورہ المطففین، آیت ۱۴۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام اسی باطنی طہارت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«طَهِّرُوا قُلُوبَكُمْ مِنْ دَرَنِ السَّيِّئَاتِ، تُضَاعَفْ لَكُمُ الْحَسَنَاتُ» "اپنے دلوں کو گناہوں کی آلودگی (اور میل کچیل) سے پاک کرو، تمہاری نیکیاں دوگنی کر دی جائیں گی"[1]۔

رمضان کے روزے دراصل اسی باطنی غلاظت کو جلانے اور دھونے کا نام ہیں۔ اس فقرے میں ہم عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ! جس طرح تو نے پانی کو ظاہری نجاستیں دور کرنے کا ذریعہ بنایا ہے، اسی طرح اپنے فضل اور مغفرت کی برسات سے میری روح کے ان داغوں کو دھو دے جو میری بندگی کی راہ میں رکاوٹ بن چکے ہیں۔

۲. وَصَبِّرْنِي فِيهِ عَلَىٰ كَائِنَاتِ الْأَقْدَارِ

مقدر شدہ حوادث پر صبر اور مقامِ رضا

دعا کا دوسرا تقاضا انسان کی قوتِ برداشت اور عقیدے کے امتحان سے متعلق ہے: "اور مجھے اس میں مقدر شدہ حوادث پر صبر عطا فرما"۔

"كَائِنَاتِ الْأَقْدَارِ" سے مراد وہ واقعات، مصائب اور آزمائشیں ہیں جو اللہ کی مشیت اور قضا و قدر کے تحت انسان کی زندگی میں رونما ہوتی ہیں۔ دنیا آزمائش کی جگہ ہے، اور یہاں ہر انسان کو بیماری، مالی نقصان، یا عزیزوں کی جدائی جیسے کٹھن اور دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان ناموافق حالات میں واویلا کرنا، شکوہ کرنا یا مایوس ہو جانا انسان کے ایمان کو کمزور کر دیتا ہے۔

---

[1] عبد الواحد آمدی، غرر الحکم و درر الکلم، صفحہ ۴۳۲۔

قرآنِ مجید انسان کی اس حتمی آزمائش اور اس پر درکار صبر کا اعلان یوں کرتا ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ﴾ "اور ہم یقیناً تمہیں تھوڑے سے خوف، بھوک، اور مالوں، جانوں اور پھلوں کے نقصان کے ذریعے آزمائیں گے، اور (ان حالات میں) صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجیے"[۱]۔

مقدر کے فیصلوں پر راضی رہنا بندگی کی معراج ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام صبر اور رضا کے اس بلند مقام کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «رَأْسُ طَاعَةِ اللَّهِ الرِّضَا بِمَا صَنَعَ اللَّهُ فِيمَا أَحَبَّ الْعَبْدُ وَفِيمَا كَرِهَ» "اللہ کی اطاعت کا سب سے بلند درجہ یہ ہے کہ اللہ نے جو بھی فیصلہ کیا ہے، بندہ اس پر راضی رہے، چاہے وہ فیصلہ بندے کو پسند ہو یا ناپسند"[۲]۔

اس فقرے کے ذریعے ہم اللہ سے وہ روحانی استقامت مانگتے ہیں کہ جب حالات ہماری مرضی کے خلاف ہوں، تب بھی ہماری زبان پر شکوے کے بجائے شکر ہو۔

۳. وَوَفِّقْنِي فِيهِ لِلتُّقَىٰ وَصُحْبَةِ الْأَبْرَارِ

تقویٰ کی توفیق اور ابرار (نیکوکاروں) کی ہم نشینی

تیسرا فقرہ انسان کی عملی زندگی، کردار سازی اور سماجی روابط کی سمت متعیّن کرتا ہے: "اور مجھے اس میں تقویٰ اور نیکوکاروں کی صحبت کی توفیق دے"۔

---

[۱] قرآن مجید، سورہ البقرہ، آیت ۱۵۵۔

[۲] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۲، صفحہ ۶۰۔

الف) اَلتُّقَى **(تقویٰ):** روزے کا حتمی ہدف ہی تقویٰ کا حصول ہے۔ تقویٰ انسان کے اندر کا وہ روحانی الارم ہے جو اسے ہر لغزش اور گناہ سے پہلے خبردار کر دیتا ہے۔ تقویٰ کا مطلب صرف عبادات کی کثرت نہیں، بلکہ یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جہاں انسان کا ہر عمل اللہ کی نگرانی کے احساس کے ماتحت آجائے۔

ب) صُحْبَةِ الْأَبْرَارِ **(نیکوکاروں کی صحبت):** تقویٰ کو محفوظ رکھنے کے لیے نیک اور صالح انسانوں کی صحبت ناگزیر ہے۔ "ابرار" وہ پاکیزہ ہستیاں ہیں جن کے دلوں میں برائی کا شائبہ تک نہیں ہوتا اور جو ہر لمحہ اللہ کی اطاعت میں غرق رہتے ہیں۔ انسان جس کی صحبت اختیار کرتا ہے، لاشعوری طور پر اسی کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔

قرآنِ مجید میں ابرار کے مقام کو یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ﴾ "یقیناً ابرار (نیکوکار لوگ) بہت بڑی نعمتوں میں ہوں گے"[۱]۔

امیر المومنین علیہ السلام بری صحبت سے بچنے اور نیکوں کی محفل اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «صُحْبَةُ الْأَشْرَارِ تُكْسِبُ الشَّرَّ كَالرِّيحِ إِذَا مَرَّتْ بِالنَّتْنِ حَمَلَتْ نَتْناً» "برے لوگوں کی صحبت انسان کے اندر برائی پیدا کر دیتی ہے، بالکل اس ہوا کی طرح جو جب کسی بدبودار چیز پر سے گزرتی ہے تو اپنے ساتھ بدبو لے کر آتی ہے"[۲]۔

لہٰذا، ہم اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں تقویٰ کی منزل پر قائم رہنے کے لیے ان ابرار (جس

---

[۱] قرآن مجید، سورہ المطففین، آیت ۲۲۔

[۲] عبد الواحد آمدی، غرر الحکم ودرر الکلم، صفحہ ۴۳۲۔

کے کامل ترین مصداق محمد و آلِ محمد علیہم السلام ہیں) کی معنوی اور روحانی صحبت نصیب فرما۔

٤. بِعَوْنِكَ يَا قُرَّةَ عَيْنِ الْمَسَاكِينِ

نصرتِ الٰہی اور مسکینوں کی چشمِ بینا کی ٹھنڈک

دعا کا حتمی اختتام اللہ کی نصرت کی طلب اور ایک نہایت ہی رقت انگیز عاشقانہ واسطے پر ہوتا ہے: "اپنی مدد کے واسطے، اے مسکینوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک"۔

یہاں "مسکین" سے مراد وہ شخص نہیں ہے جس کے پاس دولت نہ ہو، بلکہ عرفان کی زبان میں مسکین وہ ہے جسے اللہ کے سامنے اپنی بے بسی، محتاجی اور قطعی فقر کا مکمل ادراک ہو جائے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر اللہ کی مدد (عَوْن) شاملِ حال نہ ہو، تو وہ تنہا اپنے نفس کے بوجھ کو نہیں اٹھا سکتا۔ جب انسان اللہ کی بارگاہ میں مسکین بن کر، یعنی اپنی انا کو مکمل طور پر ختم کر کے کھڑا ہوتا ہے، تو اللہ اسے اپنے لطف کا وہ جلوہ دکھاتا ہے جو اس کی بے قرار آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکون بخش دیتا ہے۔ اس دعا کا نچوڑ یہی ہے کہ سچی بندگی دراصل بارگاہِ صمدیت میں مکمل انکساری اور فقر کے اظہار کا نام ہے۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے تیرہویں دن کی دعا در حقیقت باطنی تزکیہ، استقامت اور سماجی روابط کی درستی کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

- **باطنی نجاستوں سے قلب کی صفائی:** دعا کا آغاز روح کی غلاظت (دنس اور اقذار) کو دھونے

کی التجا سے ہوتا ہے۔ عربی لغت میں یہ الفاظ جسمانی میل کچیل کے لیے استعمال ہوتے ہیں، لیکن عرفان میں اس سے مراد گناہوں کا وہ کالا زنگ ہے جو دل پر چڑھ کر اسے اندھا کر دیتا ہے۔ رمضان کے روزے کا مقصد ہی اسی باطنی غلاظت کو جلانا اور اللہ کے فضل سے روح کے ان داغوں کو دھونا ہے جو بندگی کے راستے کی رکاوٹ ہیں۔

- **قضا و قدر پر صبر اور مقامِ رضا:** انسان کی زندگی میں پیش آنے والے مصائب اور کٹھن حالات اللہ کی مشیت اور مقدر (کائنات الاقدار) کا حصہ ہیں۔ دعا کے اس فقرے میں ان ناموافق حالات میں روحانی استقامت اور صبر مانگا گیا ہے۔ امام صادق علیہ السلام کے فرمان کی روشنی میں، بندگی کا بلند ترین درجہ یہ ہے کہ اللہ کے ہر فیصلے پر—چاہے وہ تلخ ہو یا میٹھا—شکوہ کرنے کے بجائے دلی رضامندی کا اظہار کیا جائے۔

- **حصولِ تقویٰ اور نیک لوگوں کی ہم نشینی:** دعا کا تیسرا تقاضا انسان کی عملی زندگی اور کردار کی حفاظت سے متعلق ہے۔ روزے کا اصل مقصد 'تقویٰ' (روحانی الارم جو گناہ سے پہلے خبردار کر دے) حاصل کرنا ہے۔ اور اس تقویٰ کی حفاظت کے لیے 'ابرار' (جن کے دل برائی سے پاک ہوں) کی صحبت ناگزیر ہے۔ امیر المومنین علی علیہ السلام کی تنبیہ کے مطابق، بری صحبت بدبودار ہوا کی طرح انسان کو آلودہ کر دیتی ہے، لہٰذا نیکوں کی محفل تقویٰ کی بقا کے لیے شرط ہے۔

- **نصرتِ الٰہی اور آنکھوں کی ٹھنڈک:** چونکہ نفس کی طہارت، صبر اور تقویٰ کا حصول انسانی طاقت سے باہر ہے، اس لیے دعا کا اختتام اللہ کی نصرت (عَون) کی التجا پر ہوتا ہے۔ بندہ اللہ کے حضور اپنی انا کو مکمل ختم کر کے ایک سچا 'مسکین' بن کر کھڑا ہوتا ہے (وہ مسکین جسے

اپنے قطعی فقر کا ادراک ہو)۔ جب انسان اس عاجزی کے ساتھ اللہ کو پکارتا ہے تو پروردگار کی مدد ہی اس کی بے قرار آنکھوں کی ٹھنڈک بنتی ہے۔

❖ رمضان المبارک کے تیرہویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ جب تک دل گناہوں کے زنگ سے پاک نہ ہو اور انسان مقدر کے فیصلوں پر صبر کرنا نہ سیکھے، بندگی نامکمل رہتی ہے۔ اور ان تمام کٹھن منازل کو طے کرنے کے لیے نیک لوگوں کی صحبت اور درگاہِ الٰہی میں سچی مسکینی کا اظہار سب سے بڑا زادِ راہ ہے۔

چودھویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ لَا تُؤَاخِذْنِي فِيهِ بِالْعَثَرَاتِ، وَأَقِلْنِي فِيهِ مِنَ الْخَطَايَا وَالْهَفَوَاتِ، وَلَا تَجْعَلْنِي فِيهِ غَرَضاً لِلْبَلَايَا وَالْآفَاتِ، بِعِزَّتِكَ يَا عِزَّ الْمُسْلِمِينَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں لغزشوں پر نہ پکڑ (میرا مؤاخذہ نہ کر)، اور اس میں میری خطاؤں اور غلطیوں کو معاف فرمادے، اور مجھے اس میں بلاؤں اور آفتوں کا نشانہ نہ بنا، اپنی عزت کے واسطے، اے مسلمانوں (تسلیم ہونے والوں) کی عزت۔

چودھواں دن: حلمِ الٰہی، اقالۂ گناہ اور تحفظِ عزت

ماہِ صیام کا چودھواں دن، جو کہ مغفرت کے عشرے کے عین وسط کی علامت ہے، بندگی کے سفر میں ایک ایسا مقام ہے جہاں سالک خوف اور امید کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ اپنے نامۂ اعمال کا جائزہ لیتا ہے۔ یہ دعا در حقیقت انسان کی فطری کمزوریوں کے اعتراف اور پروردگار کی صفتِ "حلم" کو پکارنے کا ایک عظیم الشان شاہکار ہے۔ اس مناجات کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ انسان کا مٹی سے بنا وجود قدم قدم پر لغزشوں کا شکار ہوتا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ ہر ٹھوکر پر مؤاخذہ شروع کر دے تو روئے زمین پر کوئی متنفس نہ بچے۔ یہ دعا ہمیں اسلامی عرفان کی ایک انتہائی خوبصورت اور انوکھی اصطلاح "اقالہ" سے روشناس کرواتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ نادانی میں شیطان کے ساتھ گناہوں کا گھاٹے والا سودا کر بیٹھتا ہے اور پھر سچے دل سے پچھتاتا ہے، تو وہ بارگاہِ الٰہی میں التجا کرتا ہے کہ اس کے نامۂ اعمال سے اس سودے کو منسوخ ہی کر دیا جائے۔ مزید برآں، یہ دن ہمیں اس کائناتی اصول سے آگاہ کرتا ہے کہ گناہ صرف آخرت کا عذاب نہیں لاتے، بلکہ وہ دنیا میں بھی انسان کو بلاؤں اور آفتوں کا ہدف بنا دیتے ہیں۔ جب انسان اپنے گناہوں کی منسوخی اور آفتوں سے پناہ مانگ لیتا ہے، تو وہ دراصل معاشرے میں اپنی عزت اور وقار کی حفاظت کی التجا کر رہا ہوتا ہے، کیونکہ حقیقی سرفرازی اور عزت صرف اسی ذات کے پاس ہے جو تمام مسلمانوں کی عزتوں کا واحد محافظ ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے چودھویں دن کی دعا انسان کو اس کی فطری کمزوریوں کا احساس دلاتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں عاجزی کا درس دیتی ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ گناہوں اور لغزشوں کی فوری سزا سے بچنے کے لیے اللہ کی بردباری (حلم) کا سہارا لیا جائے۔ یہ دعا دراصل گناہوں کے گھاٹے والے سودے کو منسوخ کروانے، زمینی اور آسمانی آفتوں کا نشانہ بننے سے بچنے، اور معاشرے میں اپنی عزت و آبرو کو محفوظ رکھنے کے لیے ذاتِ پروردگار پر کامل بھروسے کا نام ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **لغزشوں پر مؤاخذے سے معافی:** شریعت کے راستے پر چلتے ہوئے غفلت یا نفسانی خواہشات کے وقتی غلبے کی وجہ سے کھائی جانے والی ٹھوکروں (عثرات) پر فوری گرفت اور سزا سے بچنے کی التجا۔ **خطاؤں اور غلطیوں کا اقالہ:** اسلامی فقہِ تجارت کی اصطلاح 'اقالہ' کو روحانیت میں استعمال کرتے ہوئے، نادانی میں کیے گئے گناہوں کے سودے کو ندامت کی بنیاد پر مکمل طور پر منسوخ کروانے کی طلب۔
- **بلاؤں اور آفتوں کے نشانے سے پناہ:** گناہوں کے ہولناک دنیوی نتائج (بیماریوں، حادثات اور مصیبتوں) کا ہدف اور نشانہ (غرض) بننے سے بچنے کی دردمندانہ پکار۔
- **عزتِ الٰہی کا واسطہ اور سرفرازی:** دنیا کے مال اور منصب میں عزت تلاش کرنے کے بجائے، اس پروردگار کی عزت کو واسطہ بنانا جو اسلام لانے والوں (مسلمانوں) کی عزتوں کا حقیقی اور واحد سرچشمہ ہے۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

۱. اَللّٰهُمَّ لَا تُؤَاخِذْنِي فِيهِ بِالْعَثَرَاتِ

لغزشوں پر گرفت نہ ہونے کی التجا اور حلمِ الٰہی

دعا کا پہلا فقرہ انسان کی کمزوریوں کے اعتراف اور اللہ کی بردباری کی طلب پر مبنی ہے: "اے اللہ! مجھے اس مہینے میں لغزشوں پر نہ پکڑ"۔

"عَثَرَات" (عثرۃ کی جمع) کا مطلب ہے چلتے چلتے ٹھوکر لگ جانا، گر پڑنا یا پھسل جانا۔ اخلاقی اور روحانی مفہوم میں، یہ ان لغزشوں کی جانب اشارہ ہے جو انسان شریعت کے سیدھے راستے پر چلتے ہوئے نادانی، غفلت یا نفسانی خواہشات کے وقتی غلبے کی وجہ سے کر بیٹھتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کی ہر ٹھوکر اور ہر لغزش پر اس کا مؤاخذہ (پکڑ) شروع کر دے، تو روئے زمین پر کوئی انسان بھی بچ نہ پائے۔

قرآنِ مجید اللہ کے اسی عظیم حلم اور عفو و درگزر کی صفت کو یوں بیان فرماتا ہے: ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِن دَابَّةٍ وَلَٰكِن يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ "اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے اعمال (گناہوں) کے سبب فوراً پکڑنے (مؤاخذہ کرنے) پر آجائے، تو زمین کی پشت پر چلنے والے کسی جاندار کو بھی باقی نہ چھوڑے، لیکن وہ انہیں ایک مقررہ

وقت تک کی مہلت دیتا ہے"[۱]۔

انسان کی فطرت کمزور ہے اور وہ بار بار پھسلتا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام دعائے کمیل میں اللہ سے اسی مؤاخذے سے بچنے کے لیے گڑگڑاتے ہیں: «وَاَقِلْ عَثْرَتِي، وَاغْفِرْ زَلَّتِي، فَاِنَّكَ قَضَيْتَ عَلى عِبادِكَ بِعِبادَتِكَ» "اور میری لغزشوں کو معاف کر دے، اور میری خطاؤں کو بخش دے، کیونکہ تونے ہی اپنے بندوں پر اپنی عبادت فرض کی ہے"[۲]۔

اس فقرے کے ذریعے ہم اللہ کی رحمت کا دامن پکڑ کر عرض کرتے ہیں کہ اے رب! ہماری ان روحانی ٹھوکروں پر قہر نازل کرنے کے بجائے، ہمیں سنبھلنے کی مہلت عطا فرما۔

۲. وَأَقِلْنِي فِيهِ مِنَ الْخَطَايَا وَالْهَفَوَاتِ

خطاؤں کا اقالہ اور گناہوں کی منسوخی

دعا کا دوسرا تقاضا ایک انتہائی خوبصورت فقہی اور عرفانی اصطلاح کا حامل ہے: "اور اس میں میری خطاؤں اور غلطیوں کو معاف (اقالہ) فرما دے"۔

اس فقرے میں لفظ "أَقِلْنِي" (مجھے اقالہ دے) استعمال ہوا ہے۔ اسلامی فقہِ تجارت میں "اقالہ" اس عمل کو کہتے ہیں جب ایک خریدار کوئی چیز خرید لے، لیکن بعد میں پچھتائے اور بیچنے والے سے کہے کہ مہربانی کر کے یہ سودا منسوخ کر دیں اور میرے پیسے واپس کر دیں، اور بیچنے والا اپنے نقصان

---

[۱] قرآن مجید، سورہ فاطر، آیت ۴۵۔
[۲] شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، دعائے کمیل۔

کے باوجود اسے واپس لے کر سودا منسوخ کردے۔

عرفانِ اسلامی میں جب یہ اصطلاح اللہ اور بندے کے درمیان استعمال ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اے اللہ! میں نے اپنی نادانی میں اپنے نفس اور شیطان کے ساتھ گناہ کا جو سودا کرلیا تھا، اب میں اس پر بے حد شرمندہ اور پشیمان ہوں۔ پس تو اپنے لطف و کرم سے اس سودے (میرے نامۂ اعمال کے اس حصے) کو ہی منسوخ (اقالہ) فرمادے۔

رسولِ خدا ﷺ اس اقالہ کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «مَنْ أَقَالَ مُسْلِماً نَدَامَتَهُ أَقَالَهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» "جو شخص کسی مسلمان کی پشیمانی پر اس کے سودے کو منسوخ (اقالہ) کردے، اللہ عَزَّوَجَلَّ روزِ قیامت اس کے گناہوں کے سودے کو منسوخ فرمادے گا"[1]۔

ہم رمضان کے اس مبارک دن میں اپنی تمام ارادی خطاؤں اور غیر ارادی ہفوات (غلطیوں) پر اللہ کی بارگاہ میں اقالے کی درخواست پیش کرتے ہیں، گویا وہ گناہ کبھی ہم سے سرزد ہی نہ ہوئے ہوں۔

۳. وَلَا تَجْعَلْنِي فِيهِ غَرَضاً لِلْبَلَايَا وَالْآفَاتِ

[1] شیخ صدوق، من لایحضرہ الفقیہ، جلد ۳، صفحہ ۱۹۴۔

بلاؤں اور آفات کا نشانہ بننے سے پناہ

تیسرا فقرہ گناہوں کے دنیوی نتائج اور آفات سے تحفظ کی التجا ہے: "اور مجھے اس میں بلاؤں اور آفتوں کا نشانہ (ہدف) نہ بنا"۔

لفظ "غَرَض" کا مطلب ہے وہ نشانہ جس کی طرف تیر پھینکے جائیں۔ اور "بلایا و آفات" ان مصیبتوں، بیماریوں، حادثات اور روحانی زوال کو کہا جاتا ہے جو انسان کو گھیر لیتے ہیں۔ ایک بہت ہی نازک اور خوفناک حقیقت یہ ہے کہ گناہ صرف آخرت کا عذاب نہیں لاتے، بلکہ وہ دنیا میں بھی انسان کو بلاؤں اور آفتوں کا ہدف بنا دیتے ہیں۔

امیر المومنین علی علیہ السلام گناہ اور بلا کے اس اٹل اور حتمی تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «تَوَقُّوا الذُّنُوبَ، فَمَا مِنْ بَلِيَّةٍ وَلَا نَقْصِ رِزْقٍ إِلَّا بِذَنْبٍ، حَتَّى الْخَدْشَةِ وَالنَّكْبَةِ وَالْمُصِيبَةِ» "گناہوں سے بچو، کیونکہ کوئی بھی بلا نازل نہیں ہوتی، اور نہ ہی رزق میں کمی آتی ہے مگر گناہ کے سبب سے، یہاں تک کہ کوئی کھرونچ لگنا، کوئی ٹھوکر کھانا اور کوئی مصیبت پہنچنا بھی (گناہوں کا نتیجہ ہوتا ہے)"[1]۔ رمضان کے مبارک ایام میں ہم اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ ہمارے گزشتہ گناہوں کے سبب ہمیں ان زمینی اور آسمانی آفات کا نشانہ نہ بننے دے جو ہمارے سکون اور عبادت کی توفیق کو ہم سے چھین سکتی ہیں۔

٤. بِعِزَّتِكَ يَا عِزَّ الْمُسْلِمِينَ

[1] محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، جلد ۷۰، صفحہ ۳۱۶۔

عزتِ الٰہی کا واسطہ اور حقیقی سرفرازی

دعا کا اختتام انسان کے اس عقیدے کے اظہار پر ہوتا ہے کہ حقیقی عزت صرف اور صرف اللہ کے در سے وابستہ ہے: "اپنی عزت کے واسطے، اے مسلمانوں (تسلیم ہونے والوں) کی عزت"۔

جب انسان کے گناہ بخش دیے جائیں، اس کی خطائیں منسوخ ہو جائیں اور وہ آفات سے بچ جائے، تو اس کی عزت اور آبرو محفوظ ہو جاتی ہے۔ انسان دنیا میں مال، منصب اور لوگوں کی چاپلوسی کے ذریعے عزت تلاش کرتا ہے، لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ عزت کا سرچشمہ صرف اور صرف پروردگار کی ذات ہے۔ قرآنِ مجید کا واضح اور دوٹوک اعلان ہے: ﴿مَن كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا﴾ "جو شخص بھی عزت چاہتا ہے (اسے معلوم ہونا چاہیے کہ) تمام تر عزت صرف اللہ ہی کے لیے ہے"[1]۔

ہم اس فقرے میں اللہ کو اس کی عزت و جلالت کا واسطہ دیتے ہیں کہ اے کائنات کے خالق! تو نے ہمیں اسلام (یعنی تیرے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے) کی دولت سے نوازا ہے، پس ہماری ان خطاؤں کو معاف کر دے جو معاشرے میں ہماری ذلت کا سبب بن سکتی ہیں۔ تو ہی در حقیقت ہم مسلمانوں کا وقار اور ہماری عزتوں کا اصل محافظ ہے۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے چودھویں دن کی دعا در حقیقت حلمِ الٰہی کے سائے میں گناہوں کی

---

[1] قرآن مجید، سورہ فاطر، آیت ۱۰۔

منسوخی اور دنیوی آفات سے تحفظ کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

- **عثرات (لغزشوں) پر گرفت نہ ہونے کی التجا:** دعا کا آغاز 'عثرات' (چلتے چلتے لگنے والی ٹھوکروں) پر مؤاخذہ نہ کرنے کی التجا سے ہوتا ہے۔ اخلاقیات میں اس سے مراد وہ غیر ارادی غلطیاں اور غفلتیں ہیں جو کمزور انسان سے سرزد ہو جاتی ہیں۔ قرآنِ مجید کے مطابق، اگر اللہ انسانوں کے گناہوں پر فوراً پکڑنے پر آ جائے تو زمین پر کوئی جاندار نہ بچے۔ اس فقرے میں اللہ کی صفتِ 'حلم' (بردباری) کو پکارا گیا ہے تاکہ وہ قہر نازل کرنے کے بجائے ہمیں سنبھلنے کی مہلت عطا کرے۔

- **خطاؤں کا اقالہ اور منسوخی:** دعا کے دوسرے حصے میں 'أَقِلْنِي' (مجھے اقالہ دے) کی نہایت بلیغ اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ فقہ میں جب کوئی خریدار سودا کر کے پچھتائے تو بیچنے والے کا نقصان کے باوجود سودا منسوخ کر دینا 'اقالہ' کہلاتا ہے۔ عرفان میں بندہ اللہ سے کہتا ہے کہ میں نے جو گناہوں کا سودا کیا تھا، میں اس پر شرمندہ ہوں، پس تو کرم کرتے ہوئے میرے نامۂ اعمال سے اس گناہ کے سودے کو ہی منسوخ کر دے، گویا وہ کبھی سرزد ہی نہ ہوا ہو۔

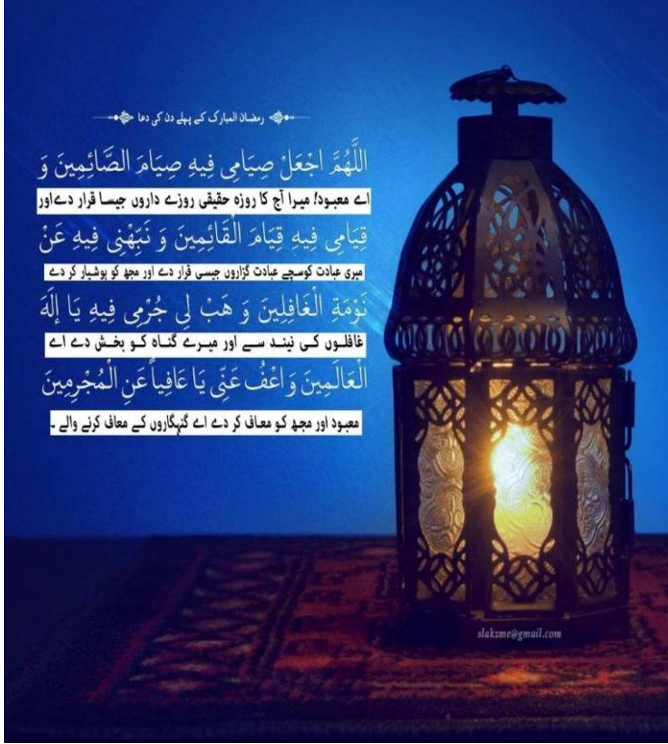
- **گناہوں کے دنیوی نتائج اور آفات سے تحفظ:** دعا کا تیسرا تقاضا آفتوں اور بلاؤں کا نشانہ (غرض) بننے سے پناہ ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ گناہ صرف آخرت تک محدود نہیں رہتے، بلکہ وہ دنیا میں بھی مصیبتیں لاتے ہیں۔ امیر المومنین علی علیہ السلام کی واضح تنبیہ ہے کہ کوئی بھی بلا، رزق کی کمی، حتیٰ کہ جسم پر لگنے والی ایک معمولی کھرونچ بھی انسان کے کسی نہ کسی

گناہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس دعا میں ہم ان باطنی اور ظاہری آفتوں سے تحفظ مانگتے ہیں۔

- **عزتِ الٰہی کا واسطہ اور حقیقی وقار:** دعا کا اختتام 'عزتِ الٰہی' کے شاندار واسطے پر ہوتا ہے۔ جب انسان گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے اور آفات سے بچ جاتا ہے، تو اس کی عزتِ نفس محفوظ ہو جاتی ہے۔ لوگ دنیا کے عہدوں میں عزت تلاش کرتے ہیں، لیکن قرآن کے اعلان کے مطابق تمام تر عزت صرف اللہ کے پاس ہے۔ بندہ اپنے رب سے التجا کرتا ہے کہ اے ہماری عزتوں کے محافظ، ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی کر کے دنیا اور آخرت میں ہمارے وقار کو سلامت رکھ۔

❖ رمضان المبارک کے چودہویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ ہماری فطرت کمزور ہے اور ہم بار بار پھسلتے ہیں، لیکن اگر ہم ندامت کے آنسوؤں کے ساتھ اللہ سے اپنے گناہوں کا اقالہ (منسوخی) کروا لیں، تو وہ نہ صرف ہمیں دنیا کی آفتوں سے بچا لیتا ہے بلکہ معاشرے میں ہماری عزت و آبرو کا محافظ بھی بن جاتا ہے۔

پندرہویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ ارْزُقْنِي فِيهِ طَاعَةَ الْخَاشِعِينَ، وَاشْرَحْ فِيهِ صَدْرِي بِإِنَابَةِ الْمُخْبِتِينَ، بِأَمَانِكَ يَا أَمَانَ الْخَائِفِينَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں عجز و انکسار کرنے والوں (خاشعین) کی سی طاعت (فرمانبرداری) بطور رزق عطا فرما، اور خاکسار اطاعت شعاروں (مخبتین) کی سی توبہ و بازگشت کے ذریعے میرا سینہ کشادہ فرما دے، تیری امان کے واسطے، اے خوفزدہ ہونے والوں کی امان۔

پندرھواں دن: باطنی حسن، شرحِ صدر اور مقامِ اخبات

رمضان المبارک کا پندرہواں دن، جو کہ اس مقدس مہینے اور عشرۂ مغفرت کا عین وسط ہے، بندگی کے سفر میں ایک خاص پختگی اور ٹھہراؤ کا مقام ہے۔ اس دن کی دعا انسان کو محض عبادات کی ظاہری کثرت سے نکال کر ان کی "باطنی کیفیت" اور "روحانی جمال" کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ مناجات در حقیقت بندگی کے دو عظیم ترین ستونوں—'خشوع' (بارگاہِ الٰہی میں دل کا پگھل جانا) اور 'اخبات' (اللہ کے احکامات کے سامنے زمین کی طرح بچھ جانا)—کے حصول کا ایک مکمل عرفانی نصاب ہے۔ یہ بیان ہمیں اس حقیقت سے آشنا کرتا ہے کہ مشینی اور بے روح عبادتیں انسان کو معرفت کی منزل تک نہیں پہنچا سکتیں۔ جب تک دل میں تکبر کی چٹانیں اور دنیوی الجھنوں کی تنگی موجود ہو، انسان حق کو جذب کرنے کی صلاحیت سے محروم رہتا ہے۔ اس دعا کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ سالک اللہ کی بارگاہ میں التجا کرتا ہے کہ اس کے سینے کو اس نور (شرحِ صدر) سے کشادہ کر دیا جائے جو بڑی سے بڑی مصیبت اور آزمائش کو اپنے اندر سمونے کی طاقت رکھتا ہو۔ یہ دن ہمیں سکھاتا ہے کہ جب انسان اپنی انا کو مٹا کر ایک خاکسار اطاعت شعار (مخبت) بن کر اللہ کی طرف پلٹتا (انابت) ہے، تو اس کا خوفِ خدا اسے دنیا کی ہر طاقت کے خوف سے آزاد کر کے، پروردگار کی اس ابدی امان میں پہنچا دیتا ہے جہاں سے کوئی شیطانی قوت اسے بے دخل نہیں کر سکتی۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے پندرہویں دن کی دعا انسان کی ظاہری عبادات کو باطنی روح اور قلبی حسن عطا کرتی ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ کثرتِ عبادت کے بجائے طاعت کی وہ کیفیت

(خشوع) اہم ہے جس میں دل خدا کی ہیبت سے لرز اٹھے۔ یہ دعا دراصل نفس کے تکبر کو توڑ کر، سینے کی تنگی کو دور کرنے اور اللہ کی رضا کے سامنے مکمل خاکساری (اخبات) اختیار کرتے ہوئے، شیطان اور نفس کے شر سے اللہ کی محفوظ ترین امان (پناہ) میں آنے کا نام ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **خاشعین کی طاعت بطورِ رزق:** محض روٹی اور دولت کے بجائے، بندگی کی اس پرسوز اور عاشقانہ کیفیت (خشوع) کو اللہ کی طرف سے دیا گیا سب سے بڑا معنوی رزق سمجھنا۔
- **ظاہر اور باطن کا ربط:** خشوع کو محض گردن جھکانے یا آنکھیں بند کرنے (جو کہ نفاق ہو سکتا ہے) کے بجائے، دل کے اس سچے انکسار کا نام دینا جس کا اثر انسان کے اعضاء و جوارح پر بھی پڑے۔
- **شرحِ صدر کی عظیم نعمت:** حقائق کو جذب کرنے، کڑی آزمائشوں کو برداشت کرنے اور دنیوی طعنوں کو سہنے کے لیے روح کی وسعت اور سینے کی کشادگی (شرح صدر) کی التجا، جو کہ دل میں اترنے والا ایک الٰہی نور ہے۔
- **مقامِ اخبات اور خاکساروں کی توبہ:** اپنے دل کو اللہ کے احکامات کے سامنے اس نرم اور ہموار زمین (خبت) کی طرح بچھا دینا جس میں غرور کا کوئی پتھر نہ ہو، اور اسی خاکساری (انابتِ مخبتین) کے ساتھ اللہ کی طرف پلٹنا۔ **خوفزدہ دلوں کی الٰہی امان:** اپنے عمل کی کمزوری اور نفس کی سرکشی سے ڈرتے ہوئے، اپنی ذات کو اللہ کی اس پناہ (امان) کے حوالے کر دینا جو ہر خوفزدہ انسان کا واحد اور آخری سہارا ہے۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

١. اَللَّهُمَّ ارْزُقْنِي فِيهِ طَاعَةَ الْخَاشِعِينَ

رزقِ معنوی اور خشوع کی حقیقت

دعا کا پہلا فقرہ بندگی کی سب سے قیمتی کیفیت اور اس کے رُوحانی جمال سے متعلق ہے: "اے اللہ! مجھے اس مہینے میں عجز و انکسار کرنے والوں (خاشعین) کی سی طاعت عطا فرما"۔ **الف) رزق کا وسیع اور کائناتی مفہوم:** اس فقرے میں طاعت (بندگی) کو ایک "رزق" کے طور پر مانگا گیا ہے (ارزقنی)۔ عوام الناس کا عام تصور یہ ہے کہ "رزق" صرف مادی نعمتوں (جیسے روٹی، کپڑا، مکان، اور مال و دولت) تک محدود ہے۔ لیکن اسلامی عرفان اور روایاتِ معصومین علیہم السلام میں لفظ "رزق" ایک نہایت وسیع اور کائناتی مفہوم رکھتا ہے۔ ہر وہ نعمت جو اللہ کی طرف سے بندے کو عطا ہو، وہ رزق ہے۔ مادی رزق جسم کو زندہ رکھتا ہے جبکہ معنوی رزق روح کو حیات بخشتا ہے۔ تندرستی، قلبی سکون، ایک سچا دوست، حج و زیارات کی توفیق، اور سب سے بڑھ کر "خالص طاعت و بندگی" معنوی رزق کے اعلیٰ ترین مصادیق ہیں۔ جسمانی رزق تو اللہ نے حیوانات کو بھی دیا ہے، لیکن طاعتِ خاشعین کا رزق صرف ان خوش نصیبوں کو ملتا ہے جنہیں وہ اپنے دربار کے لیے چن لیتا ہے۔ **ب) خشوع کا فلسفہ اور ظاہر و باطن کا ربط:** "خَاشِعِين" لفظ "خشوع" سے مشتق ہے۔ عربی زبان میں خشوع اس جسمانی اور روحانی خاکساری کو کہتے ہیں جو کسی عظیم ہستی کی جلالت اور ہیبت کے سامنے انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے، اور جس کے اثرات اس کے ظاہر (بدن، آنکھوں اور حرکات) پر بھی نمایاں ہوتے ہیں۔

قرآنِ مجید نے خشوع کو سچے مؤمنین کی سب سے پہلی اور نمایاں صفت قرار دیا ہے: ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾ "یقیناً صاحبانِ ایمان کامیاب ہو گئے؛ جو اپنی نمازوں میں خشوع (گڑگڑانے اور عجز و انکسار) والے ہیں"[1]۔ خشوع محض گردن جھکا لینے یا آنکھیں بند کر لینے کا نام نہیں ہے۔ اگر دل میں تکبر یا دنیا کے خیالات ہوں اور ظاہر میں انسان عاجزی دکھا رہا ہو تو یہ خشوع نہیں بلکہ "نفاق" (منافقت) ہے۔ ایک دفعہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو نماز کی حالت میں اپنی ڈاڑھی کے بالوں سے کھیلتے ہوئے دیکھا، تو آپؐ نے ظاہری اور باطنی خشوع کے ربط کا ایک ابدی اصول بیان کرتے ہوئے فرمایا: «أَمَا إِنَّهُ لَوْ خَشَعَ قَلْبُهُ لَخَشَعَتْ جَوَارِحُهُ» "آگاہ ہو جاؤ! اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا، تو اس کے اعضاء و جوارح میں بھی خشوع پایا جاتا"[2]۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اپنے ماننے والوں کی اسی عظیم صفت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «وَاللَّهِ شِيعَتُنَا الَّذِينَ... وَصَفَهُمُ اللَّهُ بِالْعِبَادَةِ وَالْخُشُوعِ وَرِقَّةِ الْقَلْبِ، فَقَالَ: وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا» "خدا کی قسم ہمارے شیعہ (پیروکار) فقط وہی لوگ ہیں جنہیں خداوندِ عالم نے عبادت، انکساری (خشوع) اور نرم دلی کی صفات کے ساتھ موصوف کیا ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے: اور جب ان کے سامنے رحمن (اللہ) کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے جھک جاتے ہیں"[3]۔ ہم اس دعا میں اللہ سے یہی التجاء کرتے ہیں کہ اے خالق! ہماری مشینی اور بے روح عبادتوں کو "خاشعین" کی

---

[1] قرآن مجید، سورہ المؤمنون، آیت ۱-۲۔

[2] محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، جلد ۸۱، صفحہ ۲۲۸۔

[3] محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، جلد ۶۵، صفحہ ۳۴۴۔

اس پُرسوز، عاشقانہ اور خاکسارانہ طاعت میں بدل دے جو تیرے دربار میں شرفِ قبولیت پاتی ہے۔

۲. وَاشْرَحْ فِيهِ صَدْرِي بِإِنَابَةِ الْمُخْبِتِينَ

شرحِ صدر کا کمال اور مقامِ اخبات

دعا کا دوسرا اور مرکزی تقاضا روح کی وسعت اور قلبی تسلیم و رضا سے متعلق ہے: "اور خاکسار اطاعت شعاروں (مخبتین) کی سی توبہ و بازگشت کے ذریعے میرا سینہ کشادہ فرما دے"۔ اس فقرے میں دو انتہائی عمیق عرفانی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں: "شرحِ صدر" اور "مخبتین"۔

الف) شرحِ صدر (سینے کی کشادگی): علمِ اخلاق کی نگاہ میں "شرحِ صدر" ایک عظیم ترین الٰہی نعمت ہے، جبکہ "ضیقِ صدر" (سینے کی تنگی) ایک خدائی سزا اور بیماری ہے۔ جن کی روح کشادہ (شرحِ صدر والی) ہوتی ہے، وہ بڑی سے بڑی مصیبت، کڑی آزمائش اور مخالفین کے طعنوں کو اس طرح برداشت کر لیتے ہیں جیسے سمندر پتھروں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ لیکن تنگ سینے والے افراد ذرا سی تنقید یا معمولی سی مصیبت پر واویلا کرنے لگتے ہیں، کیونکہ ان کے باطن میں حقائق کو جذب کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اپنے حبیب ﷺ پر کیے گئے سب سے بڑے احسان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ "کیا ہم نے آپؐ کی خاطر آپ کا سینہ کشادہ (شرحِ صدر) نہیں کر دیا؟"[1]۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو اصحاب نے رسولِ خدا ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ شرحِ

---

[1] قرآن مجید، سورہ الشرح، آیت ۱۔

صدر کیا ہے ؟ آپ صلى الله عليه وآله وسلم نے ایک انتہائی نورانی جواب مرحمت فرمایا: «نُورٌ يَقْذِفُهُ اللَّهُ فِي قَلْبِ مَنْ يَشَاءُ فَيَنْشَرِحُ لَهُ صَدْرُهُ وَيَنْفَسِحُ» "یہ ایک نور ہے کہ جسے اللہ جس شخص کے دل میں چاہے ڈال دے، تو اس کے سائے میں اس کا سینہ اور روح وسیع اور کشادہ ہو جاتی ہے"۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا اس کی کوئی نشانی بھی ہے ؟ تو آپؐ نے فرمایا: «نَعَمْ، الْإِنَابَةُ إِلَى دَارِ الْخُلُودِ، وَالتَّجَافِي عَنْ دَارِ الْغُرُورِ، وَالِاسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُولِ الْمَوْتِ» "ہاں! اس کی نشانی ہمیشہ باقی رہنے والے گھر (آخرت) کی طرف توجہ کرنا، دنیا کے دھوکے والے گھر سے دامن سمیٹنا، اور موت کے آنے سے قبل موت کے لیے آمادہ رہنا ہے"[1]۔

ب) اِنَابَةِ الْمُخْبِتِينَ (خاکساروں کی بازگشت): "مخبتین" لفظ "اِخبات" سے نکلا ہے۔ عربی لغت میں اخبات کا مادہ "خَبت" ہے (جو بروزن ثَبت ہے)۔ یہ لفظ اس زمین کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو بالکل ہموار، وسیع اور نرم ہو، جس پر چلنے والے کے قدموں کو کوئی ٹھوکر نہ لگے[2]۔ اس لغوی معنی کی مناسبت سے "مخبت" اس انسان کو کہتے ہیں جس کا دل اللہ کے حکم کے سامنے زمین کی طرح نرم، ہموار اور بچھا ہوا ہو، جس میں غرور کی کوئی چٹان اور تکبر کا کوئی پتھر نہ ہو۔ یہ اللہ کے احکامات کے سامنے مکمل تسلیم اور عجز و انکساری کا نام ہے۔ قرآنِ مجید ان مخبتین کو بشارت دیتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ﴾ "اور آپ صلى الله عليه وآله وسلم ان تواضع اور عاجزی کرنے والوں (مخبتین)

---

[1] محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، جلد ۷۴، صفحہ ۹۲۔

[2] راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، مادہ خ ب ت۔

کو بشارت دے دیجیے؛ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل (لرز) جاتے ہیں، اور وہ ان مصیبتوں پر صبر کرنے والے ہیں جو ان پر نازل ہوتی ہیں"[1]۔ اس دعا میں ہم التجاء کر رہے ہیں کہ اے اللہ! میرے سینے کی اس تنگی کو دور کر دے، اور مجھے ان مخبتین (خاکساروں) کی سی "انابت" (توبہ اور تیری طرف پلٹنا) نصیب فرما تاکہ میرے دل میں حق کو قبول کرنے کی وسعت پیدا ہو سکے۔

۳. بِأَمَانِكَ يَا أَمَانَ الْخَائِفِينَ

خوفِ خدا اور الٰہی امان کا حصار

دعا کا حتمی اور پُر وقار اختتام اللہ کی امان اور پناہ کے واسطے پر ہوتا ہے: "تیری امان کے واسطے، اے خوفزدہ ہونے والوں کی امان"۔ خدا کی بارگاہ میں خاکساری (خشوع) اور تسلیم و رضا (اخبات) کے دعوے بہت بڑے اور بھاری ہیں۔ انسان جانتا ہے کہ اس کا عمل انتہائی ضعیف اور اس کا نفسِ امارہ نہایت سرکش ہے۔ جب وہ اپنی کمزوری اور شیطان کے حملوں کو دیکھتا ہے تو وہ خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ اس خوفِ الٰہی میں مبتلا انسان کے پاس کائنات میں صرف ایک ہی پناہ گاہ اور امان باقی رہتی ہے، اور وہ خود اللہ کی ذات ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام مناجاتِ مسجدِ کوفہ میں اپنے اس خوف اور اللہ کی اس امان کو ان خوبصورت اور لرزہ خیز الفاظ میں پیش کرتے ہیں: «مَوْلَايَ يَا مَوْلَايَ، أَنْتَ الْمُعَافِي وَأَنَا الْمُبْتَلَىٰ، وَهَلْ يَرْحَمُ الْمُبْتَلَىٰ إِلَّا الْمُعَافِي...

[1] قرآن مجید، سورہ الحج، آیت ۳۴-۳۵۔

مَوْلَايَ يَا مَوْلَايَ، أَنْتَ الْأَمَانُ وَأَنَا الْخَائِفُ، وَهَلْ يَرْحَمُ الْخَائِفَ إِلَّا الْأَمَانُ» "اے میرے مولا، اے میرے مولا! تو عافیت دینے والا ہے اور میں مصیبتوں میں مبتلا ہوں، اور کیا مبتلا پر عافیت دینے والے کے سوا کوئی اور رحم کر سکتا ہے؟... اے میرے مولا، اے میرے مولا! تو سراپا امان ہے اور میں خوفزدہ ہوں، اور کیا خوفزدہ شخص پر امان دینے والے کے سوا کوئی رحم کر سکتا ہے؟"[1]۔ پس پندرہویں دن ہم اللہ سے یہی التجا کرتے ہیں کہ اے خوفزدہ دلوں کو تسکین بخشنے والے رب! ہماری اس ٹوٹی پھوٹی عبادت اور طاعت کو قبول فرما، اور ہمیں شیطان کے شر، نفس کی گمراہیوں، اور روزِ قیامت کی رسوائیوں سے اپنی خاص امان میں محفوظ فرما لے۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے پندرہویں دن کی دعا در حقیقت بندگی کی کوالٹی، روح کی وسعت اور بارگاہِ صمدیت میں مکمل انکساری کا نام ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

- **طاعت کا معنوی رزق اور خشوع:** دعا کا آغاز 'طاعتِ خاشعین' کو بطورِ 'رزق' مانگنے سے ہوتا ہے۔ مادی رزق تو اللہ نے حیوانات کو بھی دیا ہے، مگر خالص بندگی کا معنوی رزق صرف چنے ہوئے لوگوں کو ملتا ہے۔ خشوع وہ قلبی خاکساری ہے جو خدا کی جلالت کے سامنے پیدا ہوتی ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کے مطابق، اگر دل میں سچا خشوع ہو تو انسان کے ظاہری اعضاء (ہاتھ، پاؤں، آنکھیں) بھی اس عاجزی کی گواہی دیتے ہیں، ورنہ ظاہری عاجزی محض منافقت ہے۔ **شرحِ صدر اور روح کی وسعت:** دعا کا مرکزی تقاضا

[1] شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، مناجاتِ امیر المومنین (علیہ السلام) در مسجد کوفہ۔

'شرحِ صدر' (سینے کی کشادگی) ہے۔ تنگ سینے والے لوگ ذرا سی مصیبت پر واویلا کرتے ہیں، جبکہ کشادہ روح والے پہاڑ جیسی آزمائشوں کو بھی سہ جاتے ہیں۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شرحِ صدر کو ایک ایسا 'نور' قرار دیا ہے جو انسان کی توجہ فانی دنیا سے ہٹا کر ابدی آخرت اور موت کی تیاری کی طرف موڑ دیتا ہے۔ **مخبتین کی بازگشت اور مقامِ اخبات:** اس دعا میں '**مخبتین** کی انابت' کے ذریعے سینہ کشادہ کرنے کی التجا کی گئی ہے۔ '**مخبتین**' کا مادہ 'خَبْت' ہے، جو اس نرم اور ہموار زمین کو کہتے ہیں جس میں کوئی پتھر نہ ہو۔ اسی طرح مخبت وہ ہے جس کا دل اللہ کے حکم کے سامنے بالکل نرم اور غرور سے پاک ہو۔ انسان التجا کرتا ہے کہ یارب، مجھے ان خاکساروں کی سی توبہ عطا کر تاکہ میرے دل میں حق قبول کرنے کی وسعت پیدا ہو۔ **خائفین کی پناہ اور الٰہی امان:** دعا کا اختتام اللہ کی 'امان' کے نہایت دلگداز واسطے پر ہوتا ہے۔ خاکساری کے اتنے بڑے دعوے کے بعد انسان اپنے کمزور عمل اور نفسِ امارہ کی سرکشی سے ڈر جاتا ہے۔ امیر المومنین علی علیہ السلام کی مناجات کی روشنی میں، یہ خوفزدہ انسان دنیا کی ہر طاقت سے کٹ کر اس ذات کو پکارتا ہے جو 'امان الخائفین' (خوفزدہ ہونے والوں کی واحد پناہ گاہ) ہے۔ بندہ التجا کرتا ہے کہ اے رب، مجھے اپنی خاص امان میں لے کر شیطان اور نفس کے شر سے محفوظ فرمادے۔

- رمضان المبارک کے پندرہویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ جب تک عبادت میں دل کا خشوع شامل نہ ہو اور انسان کی روح میں حق کو قبول کرنے کی وسعت (شرحِ صدر) پیدا نہ ہو، اس کا روزہ محض فاقہ کشی رہتا ہے۔ اور سچی بندگی دراصل اپنے آپ کو مکمل طور پر مٹا کر (اخبات) اللہ کی امان میں آجانے کا نام ہے۔

سولہویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ وَفِّقْنِي فِيهِ لِمُوَافَقَةِ الْأَبْرَارِ، وَجَنِّبْنِي فِيهِ مُرَافَقَةَ الْأَشْرَارِ، وَآوِنِي فِيهِ بِرَحْمَتِكَ إِلَىٰ دَارِ الْقَرَارِ، بِإِلَٰهِيَّتِكَ يَا إِلَٰهَ الْعَالَمِينَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں نیکوکاروں (ابرار) کی ہمراہی اور موافقت کی توفیق عطا فرما، اور مجھے اس میں شریروں کی رفاقت سے دور رکھ، اور اپنی رحمت کے ذریعے مجھے سکون کے گھر (جنت) میں پناہ دے، تیری الوہیت (معبودیت) کے واسطے، اے تمام جہانوں کے معبود۔

سولھواں دن: انتخابِ حق، بصیرتِ فتنہ اور منزلِ ابدی

رمضان المبارک کے دوسرے عشرے کا سولہواں دن انسان کے باطنی تزکیے کو معاشرتی اور اجتماعی حقیقتوں سے جوڑنے کا ایک کٹھن موڑ ہے۔ یہ دعا ہمیں اس عظیم حقیقت سے آشنا کرتی ہے کہ انسان کا روحانی ارتقاء محض تنہائی کے حجروں یا غاروں میں نہیں ہوتا، بلکہ اس کی اصل آزمائش معاشرے کے ان کڑے معرکوں میں ہوتی ہے جہاں اسے حق اور باطل کے درمیان کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ یہ مناجات دراصل انسان کے نظریاتی، فکری اور عملی رابطوں کے تعین کا ایک مکمل منشور ہے۔ اس کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ انسان جس کی صحبت، ہمراہی اور موافقت اختیار کرتا ہے، لاشعوری طور پر اسی کے انجام کا حصہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا، سالک اس دن پروردگار سے یہ بصیرت مانگتا ہے کہ وہ فتنوں کے اس دور میں باطل اور اشرار کے فریب کو پہچان سکے اور خاموشی یا غیر جانبداری کی چادر اوڑھنے کے بجائے، کھل کر حق اور ابرار کا ساتھ دے۔ بندگی کا یہ سفر اس وقت تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا جب تک انسان دنیا کے اس عارضی اور دھوکے والے گھر سے اپنی توجہ ہٹا کر، اللہ کی رحمت کے سائے میں اس ابدی اور ہمیشہ سکون دینے والے گھر (دار القرار) کی طلب نہ کرے، جو ہر کچے اور سچے مؤمن کی آخری منزل ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے سولہویں دن کی دعا انسان کو معاشرے میں حق و باطل کی پہچان اور درست ہم نشینوں کے انتخاب کی کسوٹی عطا کرتی ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ دین کے فتنوں میں غیر

جانبدار رہنا دراصل باطل کی مدد کرنا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ انسان کھلم کھلا پاکیزہ اور سچے لوگوں (ابرار) کی موافقت اختیار کرے اور فسادی عناصر (اشرار) کی صحبت سے دور بھاگے۔ یہ دعا دنیا کی بے ثباتی کا احساس دلاتے ہوئے، اپنے اعمال پر غرور کرنے کے بجائے محض پروردگار کی رحمت کے ذریعے جنت (دار القرار) کے ابدی سکون کو پانے کا ایک عظیم الشان لائحہ عمل ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **ابرار کی موافقت اور ہمراہی:** محض نیک بننے کی دعا نہیں، بلکہ ان کامل اور اکمل ہستیوں (محمد و آلِ محمد ع) کے عقائد، طرزِ زندگی اور سیرت کی مکمل پیروی (موافقت) کرنے کی التجا، جو کہ ابرار کے حقیقی مصداق ہیں۔
- **اشرار کی رفاقت سے دوری:** فتنوں کے دور میں باطل، ظالم اور معاشرے میں فساد پھیلانے والے شریروں کے فریب سے بچنا، اور حق و باطل کی جنگ میں خاموش تماشائی بننے کے بجائے بصیرت کے ساتھ حق کا دفاع کرنا۔
- **دارِ القرار کا ابدی سکون:** اس دنیا کو 'دار الممر' (گزرنے کی جگہ) سمجھ کر، اللہ کی رحمت کے واسطے سے آخرت کے اس ہمیشہ ٹھہرنے والے اور پرسکون گھر (دار القرار/جنت) میں پناہ مانگنا۔
- **الوہیتِ پروردگار کا واسطہ:** اتنی بڑی اور عظیم منازل (ابرار کا ساتھ اور جنت کا حصول) مانگنے کے لیے کسی چھوٹی صفت کے بجائے، اللہ کی ذات اور اس کی 'الوہیت' (جو تمام صفاتِ کمال کا مجموعہ ہے) کو اپنا وسیلہ بنانا۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

١. اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنِي فِيهِ لِمُوَافَقَةِ الْأَبْرَارِ

ابرار کی موافقت اور صراطِ مستقیم کا انتخاب

دعا کا پہلا فقرہ انسان کے فکری اور عملی رابطوں کے تعین کی بنیاد ہے: "اے اللہ! مجھے اس مہینے میں نیکوکاروں (ابرار) کی ہمراہی اور موافقت کی توفیق عطا فرما"۔

"اَبْرار" عربی زبان کے لفظ "بَرّ" کی جمع ہے، جس کا مطلب ہے وہ پاکیزہ اور وسیع الظرف ہستیاں جن کا وجود نیکیوں اور کمالات کا سمندر ہو، جن کے عقائد ٹھوس، ہمتیں بلند، اور اعمال خالص ہوں۔ انسان جس کی صحبت اور موافقت اختیار کرتا ہے، لاشعوری طور پر اسی کی صفات کو اپنے اندر جذب کرنے لگتا ہے۔ قرآنِ مجید نے ابرار کے مقام کی عظمت کو بار بار دہرایا ہے، یہاں تک کہ صاحبانِ عقل (اولو الالباب) کی حتمی آرزو یہی ہوتی ہے کہ ان کا انجام ابرار کے ساتھ ہو: ﴿وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ﴾ "اور ہمیں نیکوکاروں (ابرار) کے ساتھ موت عطا فرما"[1]۔

مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام کی روشنی میں جب ہم "ابرار" کی تلاش کرتے ہیں تو اس کا سب سے کامل اور اکمل مصداق محمد و آلِ محمد علیہم السلام کی ذواتِ مقدسہ ہیں۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے ایک نہایت خوبصورت اور صریح اعلان فرماتے ہیں: «كُلَّمَا فِي كِتَابِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ قَوْلِهِ (إِنَّ الْأَبْرَارَ) فَوَاللَّهِ مَا أَرَادَ بِهِ إِلَّا عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ

---

[1] قرآن مجید، سورہ آل عمران، آیت ۱۹۳۔

وَفَاطِمَةَ وَأَنَا وَالْحُسَيْنَ» "کتابِ خدا (عزوجل) میں جہاں کہیں بھی (انّ الابرار) کا ذکر آیا ہے، پس خدا کی قسم! اللہ نے اس سے علی ابن ابی طالب، فاطمہ، مجھے اور حسین (علیہم السلام) کے سوا کسی اور کو مراد نہیں لیا"[1]۔

لہٰذا اس دعا میں "موافقۃ الابرار" مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ اے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میرے عقائد، میری سوچ، میرا طرزِ زندگی اور میرا ہر عمل محمد وآلِ محمد علیہم السلام کی سیرت کے عین مطابق (موافق) ہو جائے، تاکہ روزِ قیامت میں انہی کے پرچم تلے محشور ہو سکوں۔

۲. وَجَنِّبْنِي فِيهِ مُرَافَقَةَ الْأَشْرَارِ

اشرار کی صحبت سے گریز اور فتنوں میں بصیرت

دعا کا دوسرا تقاضا ایک انتہائی نازک اور خطرناک مرحلے سے بچنے کی التجا ہے: "اور مجھے اس میں شریروں کی رفاقت سے دور رکھ"۔

"أَشْرَار" (شر کی جمع) ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کا باطن تاریک اور جن کا عمل معاشرے کے لیے فساد کا باعث ہو۔ یہاں سب سے بڑا مسئلہ فتنوں کے دور میں حق اور باطل کی پہچان کا ہے۔ بسا اوقات اشرار ظاہری طور پر دین کا لبادہ اوڑھ کر آتے ہیں۔ بعض کم فہم افراد امیر المومنین علی علیہ السلام کے اس مشہور فرمان کو سیاق وسباق سے ہٹ کر پیش کرتے ہیں: «كُنْ فِي الْفِتْنَةِ كَابْنِ اللَّبُونِ، لَا ظَهْرٌ فَيُرْكَبَ، وَلَا ضَرْعٌ فَيُحْلَبَ» "فتنے کے دور میں اس اونٹ کے دو سالہ بچے کی مانند

---

[1] ابن شہر آشوب، مناقب آل أبی طالب، جلد ۳، صفحہ ۱۴۸۔

ہو جاؤ، جس کی پیٹھ پر سواری نہیں کی جا سکتی، اور نہ ہی اس کے تھنوں سے دودھ دوہا جا سکتا ہے"[۱]۔

اس فرمان کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ جب حق اور باطل (جیسے علی علیہ السلام اور معاویہ، یا حسین علیہ السلام اور یزید) کی جنگ ہو رہی ہو تو انسان غیر جانبدار ہو کر گھر میں بیٹھ جائے۔ بلکہ اس کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ فتنے برپا کرنے والوں (اشرار) کے ہاتھ کا کھلونا نہ بنو اور انہیں اپنا استحصال نہ کرنے دو۔ جب امامِ برحق میدان میں موجود ہو، تو خاموشی اور کنارہ کشی خود ایک شیطانی فتنہ ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب امیر المومنین علیہ السلام نے حق کے دفاع کے لیے جنگیں لڑیں، تو ربیع بن خُثَیم (خواجہ ربیع) اور حسن بصری جیسے ظاہر بین زاہدوں نے یہ کہہ کر امام کا ساتھ چھوڑ دیا کہ "ہمیں حق اور باطل سمجھ نہیں آ رہا"۔ یہ کنارہ کشی در حقیقت "اشرار" کی بالواسطہ مدد تھی۔ ایسے مقامات پر بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے کہ انسان آنکھیں کھول کر دیکھے کہ حق کا مرکز کہاں ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ ابدی فرمان جو حق کی کسوٹی ہے: «عَلِيٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِيٍّ» "علی حق کے ساتھ ہیں، اور حق علی کے ساتھ ہے"[۲]۔

پس دعا کے اس فقرے میں ہم اللہ سے وہ بصیرت مانگتے ہیں کہ ہم اشرار کے فریب میں نہ آئیں اور بوقتِ ضرورت باطل کے خلاف حق کا کھل کر ساتھ دے سکیں۔

۳. وَآوِنِي فِيهِ بِرَحْمَتِكَ إِلَىٰ دَارِ الْقَرَارِ

---

[۱] سید رضی، نہج البلاغہ، حکمت ۱۔

[۲] شیخ صدوق، الآمالی، صفحہ ۸۹۔

رحمتِ الٰہی کا سایہ اور ابدی سکون کا گھر

تیسرا فقرہ انسان کے حتمی انجام اور روح کی آخری منزل کی جانب اشارہ کرتا ہے: "اور اپنی رحمت کے ذریعے مجھے سکون کے گھر (جنت) میں پناہ دے"۔

دنیوی زندگی چاہے کتنی ہی طویل اور پر تعیش کیوں نہ ہو، اسے ایک نہ ایک دن ختم ہونا ہے۔ یہ دنیا "دار الممر" (گزرنے کی جگہ) ہے، جبکہ انسان کی روح کو جس چیز کی تلاش ہے وہ "دار القرار" (ہمیشہ رہنے والی اور سکون کی جگہ) ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی پائیداری کا موازنہ کرتے ہوئے قرآنِ مجید میں ایک صاحبِ ایمان شخص کی زبانی یہ عظیم حقیقت بیان کی گئی ہے: ﴿يَا قَوْمِ إِنَّمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ﴾ "اے میری قوم! یہ دنیا کی زندگی تو محض چند روزہ فائدہ (اور عارضی متاع) ہے، اور یقیناً آخرت ہی ہمیشہ ٹھہرنے کا گھر (دارِ قرار) ہے"[1]۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ جنت جیسی عظیم منزل کی طلب انسان اپنے اعمال کی بنیاد پر نہیں کر رہا، بلکہ وہ اسے اللہ کی "رحمت" (بِرَحْمَتِكَ) کے واسطے سے مانگ رہا ہے۔ اعمال چاہے کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، وہ جنت کی لامحدود نعمتوں کی قیمت نہیں ہو سکتے۔ یہ صرف اور صرف ذاتِ باری کی وسعتِ رحمت ہے جو انسان کو جہنم کے اشرار سے بچا کر دارِ قرار کے ابرار کے ساتھ لا بٹھاتی ہے۔

٤. بِإِلَٰهِيَّتِكَ يَا إِلَٰهَ الْعَالَمِينَ

---

[1] قرآن مجید، سورہ غافر، آیت ۳۹۔

الوہیت کا واسطہ اور کائنات کا حقیقی معبود

دعا کا اختتام ایک انتہائی باوقار اور توحیدی واسطے پر ہوتا ہے: "تیری الوہیت (معبودیت) کے واسطے، اے تمام جہانوں کے معبود"۔

یہ کائنات، اس کا نظام، انسانوں کے قلوب، اور جنت و دوزخ سب اسی ایک الٰہ کی ربوبیت کے ماتحت ہیں۔ جب انسان کسی بہت بڑی چیز کا سوال کرتا ہے (جیسے ابرار کی رفاقت اور دارِ قرار کا حصول)، تو وہ کسی چھوٹی صفت کا واسطہ نہیں دیتا، بلکہ اللہ کی "الوہیت" کا واسطہ دیتا ہے، جو اس کی تمام صفاتِ کمال و جلال کا مجموعہ ہے۔ بندہ اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ اے اللہ! چونکہ تو ہی میرا اور تمام جہانوں کا تنہا معبود ہے، اس لیے میری پناہ گاہ اور میری امیدوں کا مرکز بھی تیرے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ میری اس پکار کو اپنے کمالِ الوہیت کے صدقے میں شرفِ قبولیت بخش دے۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے سولہویں دن کی دعا درحقیقت سماجی رابطوں کی درستی، نظریاتی پختگی اور روح کی آخری منزل کی جستجو کا نام ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

- **ابرار کی پیروی اور حق کا انتخاب:** دعا کا آغاز 'ابرار' (نیکوکاروں) کی موافقت کی التجا سے ہوتا ہے۔ اولوالالباب کی حتمی آرزو یہی ہوتی ہے کہ ان کا انجام ابرار کے ساتھ ہو۔ امام حسن علیہ السلام کی صریح حدیث کے مطابق، قرآن میں ابرار کا کامل ترین مصداق اہلِ بیت علیہم السلام کی ذوات ہیں۔ اس فقرے میں ہم التجا کرتے ہیں کہ یارب، ہمارے عقائد،

افکار اور اعمال کو آلِ محمد علیہم السلام کی سیرت کے عین مطابق بنا دے تاکہ ہم روزِ قیامت انہی کے پرچم تلے کھڑے ہوں۔

- **فتنوں میں بصیرت اور اشرار سے گریز:** دعا کا دوسرا اور نازک مرحلہ 'اشرار' (شریروں) کی رفاقت سے بچنا ہے۔ فتنوں کے دور میں بعض کم فہم لوگ حضرت علی علیہ السلام کے قولِ مبارک کا غلط مطلب نکال کر، حق اور باطل کے معرکے میں خاموشی اختیار کر لیتے ہیں (جیسے خواجہ ربیع نے کیا تھا)۔ یہ کنارہ کشی در حقیقت ظالم کی بالواسطہ مدد ہے۔ یہ فقرہ ہمیں وہ بصیرت مانگنے کا درس دیتا ہے کہ ہم فتنوں کو پہچانیں اور اشرار کا کھلونا بننے کے بجائے، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسوٹی "علی حق کے ساتھ ہیں" پر پورا اترتے ہوئے باطل سے بیزاری کا اعلان کریں۔

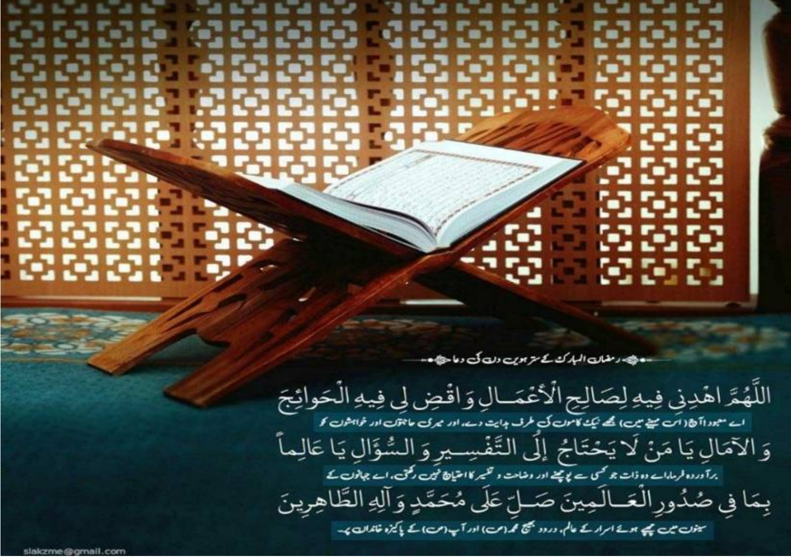
- **رحمت کے سائے میں دارِ القرار کی طلب:** دعا کا تیسرا تقاضا اس فانی دنیا سے دل اٹھا کر ابدی گھر کی طرف لو لگانے سے متعلق ہے۔ قرآنی اعلان کے مطابق دنیا محض ایک دھوکے کا سامان اور گزر گاہ ہے، جبکہ آخرت ہمیشہ سکون سے رہنے کا گھر (دار القرار) ہے۔ بندہ اس عظیم جنت کی طلب اپنے ناقص اعمال کی بنیاد پر نہیں کرتا، بلکہ وہ جانتا ہے کہ یہ ابدی پناہ گاہ صرف اور صرف پروردگار کی 'رحمت' کے واسطے سے ہی مل سکتی ہے۔

- **اللہ العالمین کی ذات پر کامل توکل:** دعا کا اختتام اللہ کی 'الوہیت' کے نہایت باوقار واسطے پر ہوتا ہے۔ جب انسان اتنی بڑی منزلوں کا سوال کرتا ہے تو وہ اللہ کی الوہیت کا سہارا لیتا ہے جو کائنات کے ہر ذرے اور جنت و دوزخ پر محیط ہے۔ بندہ اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ

اے تمام جہانوں کے معبود! چونکہ تیری ذات کے سوا کوئی اور پناہ گاہ نہیں، اس لیے میری ان التجاؤں کو اپنے کمالِ الوہیت کے صدقے میں قبول فرما لے۔

❖ رمضان المبارک کے سولہویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ بندگی تنہائی کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ معاشرے کے فتنوں میں آنکھیں کھول کر حق اور ابرار کا ساتھ دینے اور اشرار سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا نام ہے۔ جب انسان یہ کٹھن امتحان پاس کر لیتا ہے تو اللہ اپنی رحمت سے اسے ابدی سکون کے گھر میں جگہ عطا فرما دیتا ہے۔

سترہویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ اهْدِنِي فِيهِ لِصَالِحِ الْأَعْمَالِ، وَاقْضِ لِي فِيهِ الْحَوَائِجَ وَالْآمَالَ، يَا مَنْ لَا يَحْتَاجُ إِلَى التَّفْسِيرِ وَالسُّؤَالِ، يَا عَالِماً بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ، صَلِّ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں نیک اعمال کی ہدایت (توفیق) عطا فرما، اور اس میں میری حاجتوں اور آرزوؤں کو پورا کر دے، اے وہ ذات جسے (حالات کی) تفسیر (وضاحت) اور سوال کرنے کی ضرورت نہیں، اے تمام جہانوں والوں کے سینوں کے رازوں کو جاننے والے، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی پاکیزہ آل علیہم السلام پر درود نازل فرما۔

سترھواں دن: عملِ صالح، تکمیلِ حاجات اور رازِ صلوات

رمضان المبارک کا سترہواں دن، جو عشرۂ مغفرت کے اختتام کی جانب سفر ہے، ایک ایسے روحانی مقام کی نشاندہی کرتا ہے جہاں انسان کا باطنی تزکیہ اسے 'عملِ صالح' کے کٹھن میدان میں لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ دعا درحقیقت بندگی کے دو اہم ترین ستونوں—یعنی عمل اور دعا—کے درمیان ایک حسین توازن قائم کرتی ہے۔ یہ مناجات ہمیں سکھاتی ہے کہ محض اعمال کی کثرت کافی نہیں، بلکہ ان کی بنیاد میں اخلاص کا ہونا شرط ہے، کیونکہ نیت کے بغیر کیا گیا عمل صالحیت کا درجہ نہیں پاتا۔ اس کے ساتھ ہی، یہ دعا انسان کی فطری ضروریات اور آرزوؤں کا رخ دنیاوالوں کے در سے موڑ کر صرف اور صرف خالقِ کائنات کی جانب کر دیتی ہے۔ اس مناجات کا سب سے خوبصورت اور عرفانی پہلو پروردگار کی اس 'بے نیازی' کا اقرار ہے، جس کے تحت وہ ہمارے دل کے ان پوشیدہ دردوں اور ان کہی آرزوؤں کو بھی پوری طرح جانتا ہے جنہیں بیان کرنے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہوتے۔ اس بیان کا لبِ لباب یہ ہے کہ جب انسان اپنے اعمال کی پاکیزگی اور دلی مرادوں کی تکمیل چاہتا ہے، تو وہ اپنی التجاؤں کو 'محمد و آلِ محمد علیہم السلام پر درود' (صلوات) کے اس نورانی اور مستجاب غلاف میں لپیٹ کر بارگاہِ صمدیت میں پیش کرتا ہے، اس کامل یقین کے ساتھ کہ عالمِ صدور (سینوں کا حال جاننے والا رب) اس کی پکار کو ہرگز رد نہیں کرے گا۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے سترہویں دن کی دعا انسان کی عملی زندگی اور حاجات کی تکمیل کو خالص توحید سے

جوڑتی ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ اللہ سے محض اعمال کی نہیں بلکہ 'نیک اعمال' (جو ریاکاری سے پاک ہوں) کی توفیق مانگی جائے۔ یہ دعا انسان کو یہ عقیدہ عطا کرتی ہے کہ اس کی دنیوی اور اخروی آرزوؤں کا واحد مرکز وہ ذات ہے جسے حالات سمجھانے کے لیے الفاظ یا تفسیر کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ دلوں کے رازوں سے بخوبی واقف ہے۔ اور سب سے بڑھ کر، یہ دعا قبولیت کا وہ ابدی راز بتاتی ہے کہ ہر حاجت کو محمد و آلِ محمد علیہم السلام پر صلوات کے سائے میں مانگا جائے۔

دعا کے اہم نکات

- **عملِ صالح کی خالص توفیق:** ظاہری عبادات کے ساتھ ساتھ ان کی روح (نیت اور اخلاص) کی حفاظت کرتے ہوئے، ایسے پاکیزہ اعمال کی توفیق مانگنا جو اللہ کے دربار میں 'صالح' کہلانے کے حقدار ہوں۔
- **حاجات اور آرزوؤں کا مرکزِ واحد:** اپنی دنیوی ضروریات اور مستقبل کی امیدوں کو مخلوق کے بجائے صرف اور صرف 'قاضی الحاجات' (اللہ) کے محفوظ ترین دربار میں پیش کرنا۔
- **اللہ کی بے نیازی اور علمِ محیط:** اس حقیقت کا دلی اقرار کہ پروردگار کو ہماری مجبوریاں سمجھنے کے لیے کسی طویل تفسیر، وضاحت یا ظاہری الفاظ کی ضرورت نہیں، وہ ہماری خاموشی کی زبان کو بھی سنتا ہے۔
- **درود (صلوات) اور قبولیت کی مہر:** مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام کے اصول کے مطابق، اپنی دعاؤں کے آغاز اور اختتام کو 'صلوات' جیسے مستجاب عمل سے مزین کرنا تاکہ درمیانی حاجت بھی شرفِ قبولیت پالے۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

۱. اَللَّهُمَّ اهْدِنِي فِيهِ لِصَالِحِ الْأَعْمَالِ

عملِ صالح کی حقیقت اور ہدایتِ الٰہی

دعا کا پہلا فقرہ انسان کے فکری اور عملی ارتقاء کی جانب رہنمائی کرتا ہے: "اے اللہ! مجھے اس مہینے میں نیک اعمال کی ہدایت (توفیق) عطا فرما"۔

یہاں ایک بہت ہی باریک اور عرفانی نکتہ ہے۔ ہم نے اللہ سے محض "اعمال" نہیں مانگے، بلکہ "صالح اعمال" (لِصَالِحِ الْأَعْمَالِ) کی توفیق مانگی ہے۔ کوئی بھی عمل، چاہے وہ بظاہر کتنا ہی بڑا اور خوبصورت کیوں نہ ہو، اس وقت تک "صالح" (نیک اور پاکیزہ) نہیں بنتا جب تک اس کی بنیاد میں "اخلاص" نہ ہو۔ ریاکاری سے پڑھی گئی نماز عمل تو ہے، مگر عملِ صالح نہیں ہے۔

قرآنِ مجید نے عملِ صالح کو ایمان کی لازمی شرط اور ابدی زندگی کی ضمانت قرار دیا ہے: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً﴾ "جو کوئی بھی نیک عمل کرے گا، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مؤمن ہو، تو ہم یقیناً اسے ایک پاکیزہ (اور بہترین) زندگی عطا کریں گے"[1]۔

اس فقرے میں لفظ "اهْدِنِي" (مجھے ہدایت دے) کا مطلب راستہ دکھانا نہیں ہے، کیونکہ

---

[1] قرآن مجید، سورہ النحل، آیت ۹۷۔

روزے دار کو تو راستہ پہلے سے معلوم ہے، بلکہ یہاں ہدایت سے مراد "توفیق" اور عمل کی انجام دہی کے لیے اسباب کا مہیا ہونا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام عملِ صالح کی روح (یعنی نیت) کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «النِّيَّةُ أَفْضَلُ مِنَ الْعَمَلِ، أَلَا وَإِنَّ النِّيَّةَ هِيَ الْعَمَلُ» "نیت، عمل سے زیادہ فضیلت رکھتی ہے، بلکہ آگاہ ہو جاؤ کہ نیت ہی دراصل (حقیقی) عمل ہے"[1]۔

پس اس فقرے میں ہم التجا کرتے ہیں کہ یا رب! ہمارے دلوں کو ریا، فخر اور دکھاوے سے پاک کر کے ہمیں ایسے اعمال کی توفیق دے جو تیرے دربار میں "صالح" ہونے کا درجہ پا سکیں۔

۲. وَاقْضِ لِي فِيهِ الْحَوَائِجَ وَالْآمَالَ

امیدوں کا مرکز اور حاجت روائی کا فلسفہ

دعا کا دوسرا تقاضا انسان کی ضروریات اور مستقبل کی آرزوؤں سے متعلق ہے: "اور اس میں میری حاجتوں اور آرزوؤں کو پورا کر دے"۔ انسان کی زندگی "حوائج" (ضروریات) اور "آمال" (امیدوں اور آرزوؤں) کے گرد گھومتی ہے۔ جب تک انسان زندہ ہے، اس کی حاجتیں ختم نہیں ہوتیں۔ لیکن ایک سچے مؤمن اور ایک عام انسان میں فرق یہ ہے کہ عام انسان اپنی حاجتیں دنیا والوں کے در پر لے کر جاتا ہے، جبکہ مؤمن اپنی ہر چھوٹی اور بڑی حاجت صرف "قاضی الحاجات" (حاجتیں پوری کرنے والے خدا) کی بارگاہ میں پیش کرتا ہے۔

---

[1] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۲، صفحہ ۱۶۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اپنے فرزند امام حسن علیہ السلام کو وصیت کرتے ہوئے امیدوں کا رخ صرف خالق کی جانب موڑنے کی تلقین فرماتے ہیں: «وَأَلْجِئْ نَفْسَكَ فِي أُمُورِكَ كُلِّهَا إِلَى إِلَهِكَ، فَإِنَّكَ تُلْجِئُهَا إِلَى كَهْفٍ حَرِيزٍ، وَمَانِعٍ عَزِيزٍ، وَأَخْلِصْ فِي الْمَسْأَلَةِ لِرَبِّكَ، فَإِنَّ بِيَدِهِ الْإِعْطَاءَ وَالْحِرْمَانَ» "اور اپنے تمام معاملات میں اپنے نفس کو اپنے اللہ کی پناہ میں دے دو، کیونکہ ایسا کرکے تم اسے ایک نہایت محفوظ غار اور غالب محافظ کے سپرد کردو گے۔ اور اپنے رب سے مانگنے میں مکمل اخلاص پیدا کرو، کیونکہ عطا کرنا اور محروم رکھنا صرف اسی کے ہاتھ میں ہے"[1]۔

اس مہینے میں، جب آسمانِ رحمت کے دروازے کھلے ہیں، ہم اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ اے خالق! ہماری دنیوی اور اخروی، مادی اور معنوی، تمام جائز آرزوؤں کو اپنے فضل سے پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔

۳. يَا مَنْ لَا يَحْتَاجُ إِلَى التَّفْسِيرِ وَالسُّؤَالِ

علمِ محیط اور بے نیاز ذات

تیسرا فقرہ اللہ کی ذات کے لامحدود علم اور اس کی عظمت کا اعتراف ہے: "اے وہ ذات جسے (حالات کی) تفسیر اور سوال کرنے کی ضرورت نہیں"۔

ہم دنیا میں جب کسی انسان کے سامنے اپنی مشکل بیان کرتے ہیں تو ہمیں الفاظ کا سہارا لینا پڑتا

[1] سید رضی، نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱۔

ہے، رو کر یا گڑگڑا کر حالات کی پوری تفسیر (وضاحت) کرنی پڑتی ہے تاکہ وہ ہماری مجبوری کو سمجھے۔ بسا اوقات انسان کے پاس وہ الفاظ ہی نہیں ہوتے جن سے وہ اپنے دل کی تکلیف اور درد کو بیان کر سکے۔

لیکن پروردگارِ عالم کی ذات وہ ہے جسے نہ ہمارے الفاظ کی ضرورت ہے اور نہ ہی حالات کی تفسیر کی۔ وہ ہماری خاموشی کی زبان کو بھی ویسے ہی سنتا ہے جیسے ہماری پکار کو سنتا ہے۔ قرآنِ مجید اللہ کے اسی علمِ محیط اور قرب کا اعلان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ "اور یقیناً ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم بخوبی جانتے ہیں جو وسوسے اس کا نفس اس کے دل میں ڈالتا ہے، اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں"[1]۔

سید الساجدین امام زین العابدین علیہ السلام مناجاتِ راغبین میں اسی عقیدے کا اظہار ان نورانی کلمات میں کرتے ہیں: «يَا مَنْ يَعْلَمُ ضَمِيرَ الصَّامِتِينَ... فَإِنَّكَ تَعْلَمُ سِرِّي وَعَلَانِيَتِي، وَتَعْلَمُ مَا أُرِيدُ أَنْ أَطْلُبَهُ مِنْكَ» "اے وہ ذات جو خاموش رہنے والوں کے ضمیر کا راز جانتی ہے... یقیناً تو میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے، اور تو بخوبی جانتا ہے کہ میں تجھ سے کیا طلب کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں"[2]۔

یہ فقرہ دراصل انسان کو ایک عجیب سا قلبی سکون عطا کرتا ہے کہ میرا رب میری ہر اَن کہی بات اور ہر چھپے ہوئے درد سے مکمل آگاہ ہے۔

---

[1] قرآن مجید، سورہ ق، آیت ۱۶۔

[2] شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، مناجات الراغبین۔

٤. يَا عَالِماً بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ، صَلِّ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ

اسرارِ قلب اور قبولیتِ دعا کی حتمی مہر

دعا کا اختتام ذاتِ الٰہی کے علم پر ایمان اور محمد و آلِ محمد علیہم السلام کی ذاتِ گرامی پر درود کے ساتھ ہوتا ہے: "اے تمام جہانوں والوں کے سینوں کے رازوں کو جاننے والے، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی پاکیزہ آل علیہم السلام پر درود نازل فرما"۔

قرآنِ مجید میں بار بار یہ حقیقت دہرائی گئی ہے کہ ﴿إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ (یقیناً اللہ سینوں کے رازوں کو خوب جاننے والا ہے)۔ بندہ یہ اعتراف کر رہا ہے کہ اے اللہ، میں تجھ سے اپنی حاجتیں طلب کر رہا ہوں، لیکن تو میرے سینے کے کھوٹ، میری نیت کی سچائی اور میری قلبی کیفیات سے پوری طرح واقف ہے۔ پس تو میرے گناہوں کی طرف نہ دیکھ بلکہ اپنی رحمت کی طرف نگاہ کر۔ اور اس عظیم الشان دعا کا اختتام "صلوات" پر کیا گیا ہے۔ مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام کی دعاؤں کا یہ ایک اٹل اصول ہے کہ جب بھی بارگاہِ الٰہی میں کوئی حاجت پیش کی جائے، تو اس کی ابتدا اور انتہا میں محمد و آلِ محمد علیہم السلام پر درود بھیجا جائے۔ صلوات وہ مستجاب دعا ہے جسے اللہ ہر حال میں قبول فرماتا ہے، اور اللہ کی ذات اس سے بہت بلند ہے کہ وہ دعا کے آغاز اور اختتام کو قبول کر لے اور درمیان والی حاجت کو رد کر دے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام قبولیتِ دعا کا یہ عظیم راز بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «مَنْ كَانَتْ لَهُ

إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ حَاجَةٌ فَلْيَبْدَأْ بِالصَّلَاةِ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِهِ، ثُمَّ يَسْأَلُ حَاجَتَهُ، ثُمَّ يَخْتِمُ بِالصَّلَاةِ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ؛ فَإِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ أَكْرَمُ مِنْ أَنْ يَقْبَلَ الطَّرَفَيْنِ وَيَدَعَ الْوَسَطَ» "جس شخص کی اللہ عَزَّوَجَلَّ کی بارگاہ میں کوئی حاجت ہو، تو اسے چاہیے کہ وہ محمد اور ان کی آل علیہم السلام پر درود پڑھنے سے آغاز کرے، پھر اپنی حاجت مانگے، اور پھر محمد اور آلِ محمد علیہم السلام پر درود پڑھ کر دعا کو ختم کرے؛ کیونکہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی ذات اس سے کہیں زیادہ کریم ہے کہ وہ (دعا کے) دونوں سروں (صلوات) کو قبول کر لے اور درمیانی حصے (بندے کی حاجت) کو چھوڑ دے"[1]۔ پس سترہویں دن ہم عملِ صالح اور تکمیلِ حاجات کی التجاء کو صلوات کے اس مضبوط اور نورانی غلاف میں لپیٹ کر اللہ کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں، اس یقین کے ساتھ کہ عالمِ صدور (سینوں کا حال جاننے والا) ہماری اس پکار کو ہرگز رد نہیں کرے گا۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے سترہویں دن کی دعا درحقیقت عمل کی پاکیزگی، اللہ کی وسعتِ علمی پر کامل یقین اور دعا مانگنے کے آداب کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے: **عملِ صالح اور نیت کی فضیلت:** دعا کا آغاز 'صالح اعمال' کی توفیق (ہدایت) مانگنے سے ہوتا ہے۔ ریاکاری اور دکھاوے سے بھرا عمل بارگاہِ الٰہی میں مردود ہے۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق پاکیزہ زندگی (حیاتِ طیبہ) کا دارومدار ایمان اور عملِ صالح پر ہے۔ امام صادق علیہ السلام کے فرمان کی روشنی میں، عمل سے زیادہ نیت فضیلت رکھتی ہے، لہٰذا اس دعا میں دل کو فخر سے پاک کر کے خالص نیت والے

---

[1] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۲، صفحہ ۴۹۴۔

اعمال کی التجا کی گئی ہے۔ **آمال و حاجات اور توکلِ کامل:** انسان کی زندگی ضروریات (حاجات) اور امیدوں (آمال) کا مجموعہ ہے۔ ایک عام انسان اور مؤمن میں فرق یہ ہے کہ مؤمن اپنی ہر چھوٹی بڑی حاجت صرف اللہ کی بارگاہ میں لے جاتا ہے۔ امیر المومنین علی علیہ السلام کی وصیت کے مطابق، انسان کو اپنی تمام تر امیدوں کا رخ صرف اپنے خالق کی طرف موڑ دینا چاہیے کیونکہ عطا کرنا اور محروم رکھنا صرف اسی کے اختیار میں ہے۔ **تفسیر سے بے نیاز رب اور خاموشی کی زبان:** دعا کا تیسرا اور نہایت پر سکون فقرہ اللہ کے لامحدود علم کے اقرار پر مبنی ہے۔ دنیا والوں کے سامنے درد بیان کرنے کے لیے الفاظ اور تفسیر درکار ہوتی ہے، لیکن اللہ انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام کی مناجات کے مطابق، وہ 'ضمیر الصامتین' (خاموش لوگوں کے دلوں کا حال) جانتا ہے۔ اس لیے بندہ کہتا ہے کہ اے اللہ، تجھے میری حالت کی تفسیر کی ضرورت نہیں، تو بن کہے سب جانتا ہے۔ **عالمِ صدور اور صلوات کا مستجاب غلاف:** دعا کا اختتام اللہ کو 'عالم الصدور' (سینوں کا راز جاننے والا) پکارنے اور محمد و آلِ محمد علیہم السلام پر درود بھیجنے پر ہوتا ہے۔ امام صادق علیہ السلام نے دعا کی قبولیت کا یہ عظیم راز بتایا ہے کہ حاجت سے پہلے اور بعد میں صلوات پڑھی جائے۔ اللہ کی ذات اس سے بہت بلند و کریم ہے کہ وہ دعا کے دونوں سروں (صلوات) کو قبول کر لے اور درمیانی حصے (بندے کی حاجت) کو رد کر دے۔

- رمضان المبارک کے سترہویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ جب انسان اپنے اعمال کو اخلاص کے سانچے میں ڈھالتا ہے، اپنی تمام امیدیں اللہ سے وابستہ کرتا ہے، اور اپنی ان کہی آرزوؤں کو صلوات کے نورانی غلاف میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے، تو سینوں کا حال جاننے والا رب اس کی ہر حاجت کو شرفِ قبولیت بخش دیتا ہے۔

اٹھارہویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ نَبِّهْنِي فِيهِ لِبَرَكَاتِ أَسْحَارِهِ، وَنَوِّرْ فِيهِ قَلْبِي بِضِيَاءِ أَنْوَارِهِ، وَخُذْ بِكُلِّ أَعْضَائِي إِلَى اتِّبَاعِ آثَارِهِ، بِنُورِكَ يَا مُنَوِّرَ قُلُوبِ الْعَارِفِينَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں اس کی سحریوں کی برکات کے لیے بیدار کر دے، اور اس میں میرے دل کو اس (مہینے) کی روشنیوں کی چمک سے منور فرما، اور میرے تمام اعضاء کو اس کی نیکیوں (آثار) کی پیروی کی طرف موڑ دے، اپنے نور کے واسطے، اے عارفوں (معرفت رکھنے والوں) کے دلوں کو روشن کرنے والے۔

اٹھارھواں دن: سحر کی بیداری، نورِ قلب اور اعضاء کی اطاعت

ماہِ رمضان کا اٹھارہواں دن شبہائے قدر (لیالیِ قدر) کی نورانی دہلیز پر قدم رکھنے کا دن ہے۔ یہ وہ کٹھن اور مبارک مقام ہے جہاں روزے دار کا روحانی سفر دن کی بھوک اور پیاس کی منزل سے آگے بڑھ کر راتوں کی بیداری، سحر کی مناجات اور قلب کی طہارت کے اعلیٰ ترین درجے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس دعا کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ محض پیٹ کو کھانے پینے سے روکے رکھنا کافی نہیں، بلکہ حقیقی بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کا دل نورِ الٰہی سے اس قدر منور ہو جائے کہ اس کے اعضاء و جوارح بھی گناہوں سے روزہ رکھ لیں۔ یہ بیان ہمیں اس عظیم حقیقت سے آشنا کرتا ہے کہ سحری کا وقت محض طعام کا وقت نہیں، بلکہ یہ وہ پر سکون اور ملکوتی ساعت ہے جب آسمانِ رحمت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور اللہ کے خاص بندے غفلت کی نیند سے جاگ کر استغفار کی برکات سمیٹتے ہیں۔ یہ مناجات دراصل دل کے زنگ کو اتار کر اسے اس قابل بنانے کی التجا ہے کہ وہ آنے والی شبِ قدر کی عظیم تجلیات کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ جب دل، جو کہ انسانی وجود کا بادشاہ ہے، نورِ معرفت سے چمک اٹھتا ہے، تو انسان کا پورا وجود اور اس کا ہر عمل خود بخود پروردگار کی رضا اور اطاعت کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ دن انسان کو عرفاء اور اولیاء کی اس صف میں کھڑے ہونے کا شعور بخشتا ہے جن کے دلوں کو اللہ دنیا کی تاریکیوں سے نکال کر اپنے خاص نور سے منور فرماتا ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے اٹھارہویں دن کی دعا شبِ قدر کی عظیم تجلیات کو سمیٹنے کے لیے ایک باطنی اور روحانی تیاری کا نام ہے۔ یہ مناجات سالک کو دن کے روزے کے ساتھ رات (سحر) کی بیداری، دل کی تاریکیوں کو نورِ الٰہی سے منور کرنے اور اپنے تمام اعضاء و جوارح کو خالص اطاعتِ پروردگار کے تابع کر دینے کا درس دیتی ہے، تاکہ انسان کا ظاہر اور باطن یکساں طور پر نورِ معرفت سے چمک اٹھے۔

دعا کے اہم نکات

- **سحر کی برکات کے لیے بیداری:** رات کے آخری پہر (سحر) کی روحانی تجلیات اور استغفار کی برکات کو سمیٹنے کے لیے غفلت اور سستی کی نیند سے جاگنا۔
- **دل کے لیے نور کی التجا:** گناہوں کی سیاہی سے تاریک ہونے والے دل (قلب) کو ماہِ صیام کی روحانی چمک (ضیاء) اور معرفت کے نور سے روشن کرنا۔
- **اعضاء و جوارح کی مکمل پیروی:** دل کے نور کا اثر جسم پر ظاہر ہونا؛ یعنی آنکھ، کان، زبان اور تمام اعضاء کا گناہوں سے رُک کر روزے کی نیکیوں (آثار) کا عملی پابند ہو جانا۔
- **عارفین کے دلوں کو منور کرنے والے کا واسطہ:** اپنے تاریک دل کو روشن کرنے کے لیے اللہ کے اس خاص نور کو واسطہ بنانا جس سے وہ اپنے خاص دوستوں (عارفین) کے دلوں کو منور کرتا ہے۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

۱. اَللّٰهُمَّ نَبِّهْنِي فِيهِ لِبَرَكَاتِ أَسْحَارِهِ

سحر کی بیداری اور نزولِ برکات کا وقت

دعا کا پہلا فقرہ رات کے اس خاص پہر کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے جس میں آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں: "اے اللہ! مجھے اس مہینے میں اس کی سحریوں کی برکات کے لیے بیدار کر دے"۔

عربی لغت میں "سَحَر" رات کے اس آخری تہائی حصے کو کہتے ہیں جو طلوعِ فجر (صبح صادق) سے متّصل ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب کائنات پر ایک عجیب سا سکوت اور روحانی تجلّی طاری ہوتی ہے۔ یہاں "بیدار کرنے" (نَبِّهْنِي) سے مراد صرف نیند سے آنکھیں کھول کر کھانا (سحری) کھا لینا نہیں ہے، بلکہ غفلت کی نیند سے بیدار ہو کر ان روحانی برکات کو سمیٹنا ہے جو اس وقت زمین پر نازل ہو رہی ہوتی ہیں۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے خاص، متقی اور جنتی بندوں کی ایک نمایاں صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ سحر کے وقت بستروں پر سوتے نہیں، بلکہ اپنے رب کے حضور گڑگڑاتے ہیں: ﴿كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ۝ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾ "وہ رات کے وقت بہت کم سویا کرتے تھے، اور سحر کے اوقات میں وہ (اپنے رب سے) استغفار (بخشش کی

طلب) کیا کرتے تھے"[۱]۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سحر کے وقت کی جانے والی مناجات کی عظمت اور مؤمن کے حقیقی شرف کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «شَرَفُ الْمُؤْمِنِ صَلاَتُهُ بِاللَّيْلِ، وَعِزُّهُ كَفُّ الْأَذَى عَنِ النَّاسِ» "مؤمن کا شرف (اس کی عزت و بلندی) رات کے وقت اس کی نماز (نمازِ شب) پڑھنے میں ہے، اور اس کی عزت لوگوں کو اذیت پہنچانے سے باز رہنے میں ہے"[۲]۔

ہم اس فقرے میں التجا کرتے ہیں کہ یا رب! ہمیں محض پیٹ بھرنے کے لیے نہیں، بلکہ ان سحریوں میں نازل ہونے والی رحمتوں اور مغفرت کی برکات کو لوٹنے کے لیے حقیقی طور پر بیدار فرما دے۔

۲. وَنَوِّرْ فِيهِ قَلْبِي بِضِيَاءِ أَنْوَارِهِ

نورِ قلب اور باطنی روشنی کا حصول

دعا کا دوسرا تقاضا انسان کی روح کے مرکز (قلب) کی طہارت اور اس میں نورِ الٰہی کے نزول سے متعلق ہے: "اور اس میں میرے دل کو اس (مہینے) کی روشنیوں کی چمک سے منور فرما"۔

قلب (دل) انسان کے وجود کا بادشاہ ہے۔ اگر دل تاریک ہو جائے تو انسان کی آنکھیں حق دیکھنے سے، کان حق سننے سے، اور زبان حق بولنے سے قاصر ہو جاتی ہے۔ گناہوں کی کثرت دل کو

---

[۱] قرآن مجید، سورہ الذاریات، آیت ۱۷-۱۸۔

[۲] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۳، صفحہ ۴۸۸۔

تاریک کر دیتی ہے، جبکہ بندگی، سحر کی مناجات اور روزے کی مشقت دل کے اندر ایک "ضیاء" (چمکتی ہوئی روشنی) پیدا کرتی ہے۔

قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ جسے اللہ نور عطا کر دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھل جاتا ہے: ﴿أَفَمَن شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِ ۚ فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم مِّن ذِكْرِ اللَّهِ﴾ "توکیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو پس وہ اپنے رب کی طرف سے ایک نور پر (قائم) ہو (اور وہ جو تاریکی میں ہو، برابر ہو سکتے ہیں؟) پس ہلاکت ہے ان کے لیے جن کے دل اللہ کے ذکر سے سخت ہو چکے ہیں"[۱]۔

امام محمد باقر علیہ السلام دل کے نور اور اس کی پاکیزگی کے بارے میں فرماتے ہیں: «مَا مِنْ عَبْدٍ إِلَّا وَفِي قَلْبِهِ نُكْتَةٌ بَيْضَاءُ، فَإِذَا أَذْنَبَ ذَنْباً خَرَجَ فِي النُّكْتَةِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ...» "کوئی بندہ ایسا نہیں مگر یہ کہ اس کے دل میں ایک سفید (نورانی) نقطہ ہوتا ہے۔ پس جب وہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس سفید نقطے میں ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جاتا ہے (یہاں تک کہ وہ پورے دل کو تاریک کر دیتا ہے)"[۲]۔

اٹھارہویں دن ہم ماہِ رمضان کے انوار و تجلیات کے ذریعے اپنے دل کی اس تاریکی کو ختم کر کے اسے دوبارہ روشن اور منور کرنے کی التجا کرتے ہیں تاکہ ہم شبِ قدر کے نزول کو اس روشن دل کے ساتھ محسوس کر سکیں۔

---

[۱] قرآن مجید، سورہ الزمر، آیت ۲۲۔

[۲] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۲، صفحہ ۲۷۳۔

۳. وَخُذْ بِكُلِّ أَعْضَائِي إِلَى اتِّبَاعِ آثَارِهِ

اعضاء و جوارح کی اطاعت اور عملی پیروی

تیسرا فقرہ دل کے نور کا انسانی جسم اور اعمال پر ظاہر ہونے کا عملی ثبوت ہے: "اور میرے تمام اعضاء کو اس کی نیکیوں کی پیروی کی طرف موڑ دے"۔

اسلامی عرفان کا یہ ایک مسلَّم اصول ہے کہ "باطن کا اثر ظاہر پر ضرور پڑتا ہے"۔ اگر دل میں اللہ کا نور آجائے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان کے ہاتھ ظلم کے لیے اٹھیں، اس کی آنکھ خیانت کرے، یا اس کے قدم گناہ کی طرف اٹھیں۔ یہاں "اتِّبَاعِ آثَارِهِ" سے مراد ماہِ رمضان اور روزے کے وہ روحانی اور اخلاقی اثرات ہیں جو انسان کی عملی زندگی میں نظر آنے چاہئیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی اس عظیم حدیث کا حوالہ دے چکے ہیں جس میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے کامل روزے کی شرط بتاتے ہوئے فرمایا تھا: «إِذَا صُمْتَ فَلْيَصُمْ سَمْعُكَ وَبَصَرُكَ وَشَعْرُكَ وَجِلْدُكَ» "جب تم روزہ رکھو، تو لازم ہے کہ تمہارے کان، تمہاری آنکھیں، تمہارے بال اور تمہاری جِلد بھی روزہ رکھیں"[1]۔

اس فقرے میں ہم اللہ کے حضور اپنا پورا وجود (خُذْ بِكُلِّ أَعْضَائِي) پیش کر کے عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ! میرے تمام اعضاء کو اپنے قبضۂ قدرت میں لے لے اور انہیں روزے کی حقیقی برکات، نماز، تلاوت، اور خدمتِ خلق کی پیروی کا پابند بنا دے، تاکہ روزِ قیامت جب میرے اعضاء

---

[1] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۴، صفحہ ۸۷۔

گواہی دیں تو وہ گناہ کی نہیں بلکہ بندگی کی گواہی دیں۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: ﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ "اس دن جب ان پر ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان اعمال کی گواہی دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے"[۱]۔

٤. بِنُورِكَ يَا مُنَوِّرَ قُلُوبِ الْعَارِفِينَ

نورِ الٰہی کا واسطہ اور عارفین کا مقام

دعا کا اختتام ایک انتہائی عاشقانہ اور عرفانی واسطے پر ہوتا ہے: "اپنے نور کے واسطے، اے عارفوں کے دلوں کو روشن کرنے والے"۔

عارف وہ ہے جس نے خدا کو اس کی صفات کے ذریعے پہچان لیا ہو، جس کی نگاہ مادی پردوں کو چیر کر حقیقت تک پہنچ گئی ہو۔ لیکن عارف کو یہ بصیرت اس کی اپنی عقل سے نہیں ملتی، بلکہ یہ اللہ کا وہ خاص نور ہے جو اس کے دل میں تجلی کرتا ہے۔ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام دعائے عرفہ میں عارفین کے دلوں کی اسی روشن کیفیت اور اس نور کے سرچشمے کو پکارتے ہوئے فرماتے ہیں: «وَأَنْتَ الَّذِي أَشْرَقْتَ الْأَنْوَارَ فِي قُلُوبِ أَوْلِيَائِكَ حَتَّى عَرَفُوكَ وَوَحَّدُوكَ» "اور تو ہی وہ ذات ہے جس نے اپنے دوستوں (اولیاء) کے دلوں میں انوار کو اس طرح روشن کیا کہ انہوں نے تیری پہچان حاصل کر لی اور تیری توحید کا اقرار کیا"[۲]۔

---

[۱] قرآن مجید، سورہ النور، آیت ۲۴۔

[۲] شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، دعائے عرفہ سید الشہداء (علیہ السلام)۔

اس دعا میں روزے دار اللہ سے یہ التجا کرتا ہے کہ اے پروردگار، جس طرح تو نے اپنے خاص عارفین، مقربین اور اولیاء کے دلوں کو اپنے نور سے منور کر کے انہیں دنیا کے اندھیروں سے بچا لیا ہے، اسی نور کے صدقے میں میرے تاریک دل کو بھی روشنی عطا فرما، تاکہ میں آنے والی شبِ قدر کی عظمتوں کو پہچان سکوں اور اپنے بقیہ اعمال کو خالص تیری رضا کے تابع کر سکوں۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے اٹھارہویں دن کی دعا درحقیقت سحر کی مناجات، قلب کی طہارت اور اعضاء کی عملی بندگی کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

- **سحر کی بیداری اور نزولِ برکات کا وقت:** دعا کا آغاز سحری کے وقت کی برکات سمیٹنے کی التجا سے ہوتا ہے۔ عربی لغت میں 'سحر' رات کے آخری حصے کو کہتے ہیں۔ یہاں بیدار ہونے کا مطلب محض کھانا کھانے کے لیے جاگنا نہیں، بلکہ غفلت کی نیند سے جاگ کر ان روحانی برکات کو سمیٹنا ہے جو اس وقت زمین پر نازل ہو رہی ہوتی ہیں۔ قرآن مجید کے مطابق متقی لوگوں کی صفت یہ ہے کہ وہ سحر کے وقت استغفار کرتے ہیں۔
- **نورِ قلب اور باطنی روشنی کا حصول:** دعا کے دوسرے فقرے میں دل کی تاریکی دور کرنے کی التجا کی گئی ہے۔ دل انسان کے وجود کا بادشاہ ہے؛ اگر یہ تاریک ہو جائے تو انسان حق دیکھنے اور سننے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ گناہ دل پر سیاہ نقطہ بناتے ہیں، جبکہ بندگی اور روزے کی مشقت دل میں ایک 'ضیاء' (چمکتی ہوئی روشنی) پیدا کرتی ہے۔ اس فقرے میں ہم التجا کرتے ہیں کہ ہمارے دل کو رمضان کے انوار سے روشن کر دے تاکہ شبِ قدر

کا نور اس میں سما سکے۔

- **اعضاء و جوارح کی اطاعت اور عملی پیروی:** دعا کا تیسرا تقاضا دل کے نور کو عملی زندگی میں لانے سے متعلق ہے۔ اسلامی عرفان کا اصول ہے کہ باطن کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے۔ جب دل میں نور آجائے تو آنکھ، کان، زبان اور ہاتھ پاؤں خود بخود گناہوں سے رُک کر نیکی کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ ہم اللہ کی بارگاہ میں اپنا پورا وجود پیش کر کے التجا کرتے ہیں کہ ہمارے تمام اعضاء کو روزے کے اخلاقی اثرات کی پیروی کا پابند بنا دے۔

- **نورِ الٰہی کا واسطہ اور عارفین کا مقام:** دعا کا اختتام ایک انتہائی عاشقانہ واسطے پر ہوتا ہے۔ عارف وہ ہے جس کی نگاہ مادی پردوں کو چیر کر حقیقت تک پہنچ جائے۔ یہ بصیرت انسان کو اپنی عقل سے نہیں بلکہ اللہ کے عطا کردہ 'نور' سے ملتی ہے۔ امام حسین علیہ السلام کی دعائے عرفہ کی روشنی میں، یہ وہی نور ہے جو اولیاء کے دلوں میں تجلی کرتا ہے۔ روزے دار اللہ سے التجا کرتا ہے کہ اسی نور کے صدقے میں میرے تاریک دل کو بھی روشنی عطا فرما دے تاکہ میں تیری معرفت حاصل کر سکوں۔

❖ رمضان المبارک کے اٹھارہویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ جب تک سحر کی بیداری اور دل کا نور انسان کے ظاہری اعضاء کو گناہوں سے نہ روک دے، بندگی نامکمل رہتی ہے۔ اور سچی معرفت پانے کے لیے اس پروردگار کا نور ہی واحد سہارا ہے جو عارفوں کے دلوں کو روشن کرتا ہے۔

انیسویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ وَفِّرْ فِيهِ حَظِّي مِنْ بَرَكَاتِهِ، وَسَهِّلْ سَبِيلِي إِلَىٰ خَيْرَاتِهِ، وَلَا تَحْرِمْنِي قَبُولَ حَسَنَاتِهِ، يَا هَادِياً إِلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ﴾

اے اللہ! اس مہینے میں اس کی برکتوں سے میرا حصہ وافر (زیادہ) کر دے، اور اس کی بھلائیوں کی طرف میرا راستہ آسان فرما، اور مجھے اس کی نیکیوں کی قبولیت سے محروم نہ رکھ، اے روشن حق کی طرف ہدایت دینے والے۔

انیسواں دن: شبِ قدر کی تجلی، قبولیت کی شرط اور پیکرِ حقِ مبین

رمضان المبارک کا انیسواں دن اسلامی تاریخ اور روحانی ارتقاء میں ایک بے حد عظیم، لرزہ خیز اور دوہری اہمیت کا حامل مقام ہے۔ ایک طرف تو یہ دن شبہائے قدر (لیالِ قدر) کی نورانی دہلیز ہے، جہاں کائنات کے نظام اور انسانوں کی تقدیر کے فیصلے صادر ہوتے ہیں؛ تو دوسری طرف یہ وہ خونچکاں دن ہے جب محرابِ کوفہ میں کائنات کے سب سے بڑے عادل اور "حقِ مبین" کے مجسم پیکر، امیر المومنین حضرت علی ابن ابي طالب علیہ السلام کے سرِ اقدس پر زہر آلود تلوار کا وار کیا گیا۔ اس کٹھن اور عظیم مقام پر پہنچ کر روزے دار کی دعا محض انفرادی مغفرت کے دائرے سے نکل کر تقدیر کے وسیع فیصلوں، اعمال کی حتمی قبولیت، اور حق کی پہچان کی جانب مڑ جاتی ہے۔ یہ دعا در حقیقت انسان کو اس بات کا شعور بخشتی ہے کہ ہزار مہینوں سے بہتر رات میں جب برکتوں کا نزول ہو رہا ہو، تو انسان کی جھولی چھوٹی نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اسے اللہ سے وافر (لامحدود) حصہ مانگنا چاہیے۔ یہ مناجات ہمیں اس کائناتی اصول سے بھی آگاہ کرتی ہے کہ نیکی کرنا ایک مرحلہ ہے، مگر اس کا بارگاہِ الٰہی میں "قبول" ہو جانا اس سے کہیں زیادہ بلند مرحلہ ہے، جس کی حتمی شرط تقویٰ اور حقِ مبین (ولایتِ حق) کی پہچان ہے۔ اس بیان کا لبِ لباب یہ ہے کہ جب ہم اس دن اللہ کو "روشن حق کی طرف ہدایت دینے والے" کہہ کر پکارتے ہیں، تو دراصل ہم تجدیدِ عہد کر رہے ہوتے ہیں کہ یا رب، فتنوں کے اس دور میں ہمیں اسی راستے پر استقامت عطا فرما جو تیرے سچے ولی کا راستہ ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے انیسویں دن کی دعا تقدیر کے فیصلوں، اعمال کی قبولیت اور حق کی واضح پہچان پر مرکوز ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ شبِ قدر کی برکات میں سے اپنا وافر حصہ کیسے طلب کیا جائے اور نیکی کے دشوار راستوں کو اللہ کی توفیق سے کیسے آسان بنایا جائے۔ اس دعا کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ محض کثرتِ اعمال نجات کی ضمانت نہیں، بلکہ ان کا بارگاہِ الٰہی میں تقویٰ اور ولایت کی شرط کے ساتھ قبول ہونا اصل کامیابی ہے۔ یہ دعا فتنوں کے دور میں خالص اور روشن حق (حقِ مبین) کے دامن سے وابستہ رہنے کا ایک عظیم روحانی لائحہ عمل ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **برکاتِ شبِ قدر کا وافر حصہ:** ہزار مہینوں سے بہتر رات (انیسویں شب) میں، جب تقدیر کے مقادیر طے کیے جاتے ہیں، اللہ کی لامحدود برکتوں میں سے اپنے لیے ایک وافر اور وسیع حصے کی طلب۔
- **نیکی (خیرات) کے راستوں کی آسانی:** نفسِ امارہ کی کشش اور دنیوی دشواریوں کے باوجود، اللہ کی توفیق سے نیکی کے کٹھن راستوں (عبادت، انفاق) پر چلنے کو سہل اور آسان بنانا۔
- **اعمال کی قبولیت سے محرومی کا ڈر:** محض اعمال انجام دینے پر غرور کرنے کے بجائے، ان کے رد ہو جانے سے ڈرنا، اور تقویٰ و اخلاص کے ساتھ ان کی حتمی قبولیت کی التجا کرنا۔

- **حقِ مبین (روشن حق) کی پہچان:** انیسویں رمضان کی تاریخی مناسبت سے، فتنوں کے دور میں باطل سے بیزار ہو کر اس روشن حق (ولایتِ علی ع) کی طرف ہدایت مانگنا جس میں باطل کی کوئی آمیزش نہیں۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

١. اَللَّهُمَّ وَفِّرْ فِيهِ حَظِّي مِنْ بَرَكَاتِهِ

برکات کا وافر حصہ اور شبِ قدر کی تجلی

دعا کا پہلا فقرہ اس مبارک دن اور رات کی لامحدود برکات کو سمیٹنے کا تقاضا ہے: "اے اللہ! اس مہینے میں اس کی برکتوں سے میرا حصہ وافر (زیادہ) کر دے"۔

"وَفِّرْ" کا مطلب ہے کسی چیز کو کثرت سے عطا کرنا اور اسے مکمل کر دینا، اور "حَظّ" کا مطلب ہے انسان کا وہ مقدر اور حصہ جو اسے عطا کیا جاتا ہے۔ ماہِ رمضان کا یہ حصہ عام دنوں کی طرح نہیں ہے، کیونکہ انیسویں شب سے ان مبارک راتوں کا آغاز ہوتا ہے جنہیں ہزار مہینوں (تقریباً ۸۳ سال) سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید اس رات کی بے پناہ برکات کا اعلان یوں فرماتا ہے: ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ﴾ "شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس میں فرشتے اور روح اپنے رب کے اذن سے

ہر کام (کا فیصلہ) لے کر نازل ہوتے ہیں"[۱]۔

اس رات کائنات کا پورا نظامِ تقدیر مرتب کیا جاتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام انیسویں رات کی اسی حتمی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «تُقَدَّرُ الْمَقَادِيرُ فِي لَيْلَةِ تِسْعَ عَشْرَةَ، وَتُبْرَمُ فِي لَيْلَةِ إِحْدَى وَعِشْرِينَ، وَتُمْضَى فِي لَيْلَةِ ثَلَاثٍ وَعِشْرِينَ» "انیسویں رات کو تقدیر کے فیصلے طے کیے جاتے ہیں، اکیسویں رات کو انہیں محکم (پختہ) کیا جاتا ہے، اور تیئیسویں رات کو ان پر حتمی مہر (دستخط) ثبت کر دی جاتی ہے"[۲]۔

پس اس فقرے میں ہم اللہ کی بارگاہ میں دستِ سوال دراز کرتے ہیں کہ اے کائنات کے خالق! جب آج رات میری تقدیر کا فیصلہ لکھا جائے، تو میری جھولی کو تنگ نہ دیکھنا، بلکہ اپنے فضل سے میری دنیوی اور اخروی برکات کے حصے کو وافر اور وسیع کر دینا۔

۲. وَسَهِّلْ سَبِيلِي إِلَىٰ خَيْرَاتِهِ

خیرات تک رسائی اور توفیقِ الٰہی کا راستہ

دعا کا دوسرا تقاضا نیکی کے راستے کی دشواریوں کو دور کرنے اور توفیق طلب کرنے سے متعلق ہے: "اور اس کی بھلائیوں (خیرات) کی طرف میرا راستہ آسان فرما"۔

انسان فطرتاً نیکی کرنا چاہتا ہے، لیکن شیطان کے وسوسے، نفسِ امارہ کی کشش، اور دنیوی

---

[۱] قرآن مجید، سورہ القدر، آیت ۳-۴۔

[۲] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۴، صفحہ ۱۵۹۔

مصروفیات اس راستے کو انتہائی کٹھن بنا دیتے ہیں۔ رات کو اٹھ کر عبادت کرنا، اپنے مال میں سے غریبوں کو حصہ دینا، اور غصے کے وقت خود پر قابو پانا—یہ سب وہ "خیرات" ہیں جن کا راستہ بظاہر دشوار محسوس ہوتا ہے۔ جب تک اللہ خود اس راستے کو آسان (سَہل) نہ کر دے، بندہ اس پر ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ جو شخص اس کی راہ میں قدم بڑھاتا ہے، وہ اس کے لیے نیکی اور بھلائی کا راستہ نہایت آسان کر دیتا ہے: ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ﴾ "پس جس نے (اللہ کی راہ میں) عطا کیا اور تقویٰ اختیار کیا، اور سب سے اچھی بات (حق) کی تصدیق کی، تو عنقریب ہم اس کے لیے آسان راستے (جنت اور نیکی) کو مزید سہل کر دیں گے"[1]۔

اس فقرے میں التجا یہ ہے کہ اے اللہ، نیکی کے کاموں کو مجھ پر بوجھ نہ بننے دے، بلکہ میری روح کو وہ لطافت عطا کر کہ میں ان خیرات کی طرف دوڑ کر جاؤں جیسا کہ قرآن کا حکم ہے: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (پس نیکیوں کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھو)۔

۳. وَلَا تَحْرِمْنِي قَبُولَ حَسَنَاتِهِ

قبولیتِ اعمال کی کڑی شرط اور محرومی کا خوف

تیسرا فقرہ بندگی کے سب سے حساس اور فکر انگیز پہلو کی نشاندہی کرتا ہے: "اور مجھے اس کی

[1] قرآن مجید، سورہ اللیل، آیت ۵-۷۔

نیکیوں کی قبولیت سے محروم نہ رکھ"۔

نیکی کرنا ایک مرحلہ ہے، لیکن اس نیکی کا بارگاہِ الٰہی میں "قبول" ہو جانا بالکل دوسرا اور کہیں زیادہ بلند مرحلہ ہے۔ بسا اوقات انسان رات بھر جاگ کر عبادت کرتا ہے، دن بھر بھوکا رہتا ہے، لیکن اس کے دل میں موجود ریاکاری، غرور، حسد، یا حقوق العباد کی تلفی اس کی پوری عبادت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ قبولیت کی سب سے بنیادی اور قطعی شرط "تقویٰ" ہے۔ قرآنِ مجید کا دو ٹوک اعلان ہے: ﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾ "اللہ تو صرف متقین (پرہیزگاروں) ہی کے اعمال قبول کرتا ہے"[1]۔ مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام میں قبولیتِ اعمال کی ایک اور عظیم ترین اور حتمی شرط "ولایت" اور حق کی پہچان ہے۔ اگر انسان کے دل میں کائنات کے سچے رہبروں اور حجتِ خدا کی محبت و معرفت نہ ہو، تو اس کے اعمال کی عمارت بغیر بنیاد کے ہوتی ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام اعمال کی اس قبولیت کا معیار بتاتے ہوئے فرماتے ہیں: «ذِرْوَةُ الْأَمْرِ وَسَنَامُهُ وَمِفْتَاحُهُ... الطَّاعَةُ لِلْإِمَامِ بَعْدَ مَعْرِفَتِهِ... أَمَا لَوْ أَنَّ رَجُلًا قَامَ لَيْلَهُ وَصَامَ نَهَارَهُ وَتَصَدَّقَ بِجَمِيعِ مَالِهِ وَحَجَّ جَمِيعَ دَهْرِهِ وَلَمْ يَعْرِفْ وَلَايَةَ وَلِيِّ اللَّهِ فَيُوَالِيَهُ وَيَكُونَ جَمِيعُ أَعْمَالِهِ بِدَلَالَتِهِ إِلَيْهِ، مَا كَانَ لَهُ عَلَى اللَّهِ جَلَّ وَعَزَّ حَقٌّ فِي ثَوَابِهِ» "ہر امر کی چوٹی، اس کی بلندی اور اس کی کنجی... معرفت کے بعد امام کی اطاعت ہے۔ آگاہ ہو جاؤ! اگر کوئی شخص اپنی تمام راتیں عبادت میں گزارے، تمام دن روزے رکھے، اپنا سارا مال صدقہ کر دے اور زندگی بھر حج کرتا رہے، لیکن وہ ولیِ خدا کی ولایت کو نہ پہچانے کہ اس سے محبت رکھے اور اپنے تمام اعمال اس کی

[1] قرآن مجید، سورہ المائدہ، آیت ۲۷۔

رہنمائی میں انجام دے، تو اللہ (جل و عز) کے ذمے اس شخص کے ثواب کا کوئی حق نہیں ہے"[۱]۔ اس مقام پر انسان التجا کرتا ہے کہ یا اللہ، میرے ناقص اعمال کو رد کر کے مجھے اس محرومی اور ناکامی کا شکار نہ ہونے دینا جس کا ازالہ پھر کبھی نہ ہو سکے۔

٤. يَا هَادِياً إِلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ

حقِ مبین کی جانب ہدایت اور محرابِ کوفہ کا پیغام

دعا کا اختتام ایک انتہائی پر جلال اور تاریخی معنویت کے حامل واسطے پر ہوتا ہے: "اے روشن حق کی طرف ہدایت دینے والے"۔ "الْحَقِّ الْمُبِينِ" (بالکل واضح اور روشن حق) کائنات کا وہ حتمی سچ ہے جس میں کسی باطل کی آمیزش نہیں۔ اللہ کی ذات، اس کا قرآن، اور اس کے بھیجے ہوئے نمائندے اسی حقِ مبین کا مظہر ہیں۔ قرآنِ مجید رسولِ پاک ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ﴾ "پس آپ اللہ پر توکل کیجیے، یقیناً آپ واضح اور روشن حق (حقِ مبین) پر قائم ہیں"[۲]۔ انیسویں رمضان کی صبح محرابِ کوفہ میں کائنات نے حقِ مبین کی اس عظیم ترین علامت کو اپنے خون میں نہاتے ہوئے دیکھا، جس کے بارے میں رسولِ خدا ﷺ نے قطعی فیصلہ سناتے ہوئے فرمایا تھا: «عَلِيٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِيٍّ، وَلَنْ يَفْتَرِقَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ» "علی حق کے ساتھ ہیں، اور حق علی کے ساتھ ہے۔ یہ

---

[۱] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۲، صفحہ ۱۸-۱۹۔
[۲] قرآن مجید، سورہ النمل، آیت ۷۹۔

دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر میرے پاس پہنچ جائیں "[1]۔ جب ہم انیسویں دن اللہ کو "یا هادياً الى الحق المبين" کہہ کر پکارتے ہیں، تو در اصل ہم تجدیدِ عہد کر رہے ہوتے ہیں کہ اے اللہ! تاریخ کے اس خونچکاں دن میں، جب فتنے برپا تھے اور باطل نے حق کے پیکر پر وار کیا تھا، تو ہمیں اس رستے پر قائم رکھنا جو علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا راستہ ہے۔ ہمیں ان لوگوں میں سے قرار نہ دینا جنہوں نے حق کو پہچاننے کے بعد بھی اس سے منہ موڑ لیا۔ ہمیں اپنی ہدایت کے نور سے اس روشن حق (ولایت، تقویٰ، اور خالص بندگی) کے دامن سے ہمیشہ وابستہ رکھنا۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے انیسویں دن کی دعا در حقیقت شبِ قدر کی تجلیات سمیٹنے، قبولیتِ اعمال کی فکر کرنے اور حق کے ساتھ تجدیدِ عہد کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے: **تقدیر کے فیصلے اور وافر برکات کی طلب:** دعا کا آغاز اس مبارک مہینے کی برکتوں میں سے 'وافر' (زیادہ اور مکمل) حصہ مانگنے سے ہوتا ہے۔ انیسویں رات عام رات نہیں، بلکہ امام صادق علیہ السلام کے فرمان کے مطابق اسی رات تقدیر کے فیصلے طے کیے جاتے ہیں۔ بندہ بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ پھیلاتا ہے کہ اے خالق! آج کی رات جب کائنات کا نظام مرتب ہو، تو میری جھولی کو تنگ نہ دیکھنا، بلکہ اپنے فضل سے میرے دنیوی اور اخروی نصیب کو برکتوں سے بھر دینا۔ **خیرات کے راستے کی آسانی اور توفیقِ الٰہی:** دعا کا دوسرا تقاضا نیکی کے دشوار راستوں کو اللہ کی توفیق سے آسان بنانے کا

[1] خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، جلد ۱۴، صفحہ ۳۲۲۔

ہے۔ عبادت کرنا یا غصے پر قابو پانا بظاہر کٹھن ہوتا ہے، مگر قرآن کا وعدہ ہے کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے، اللہ اس کے لیے نیکی کے راستے کو سہل کر دیتا ہے۔ بندہ التجا کرتا ہے کہ نیکی مجھ پر بوجھ نہ بنے، بلکہ میں تیری توفیق سے خیرات کی طرف دوڑ کر جاؤں۔ **قبولیتِ حسنات کی کڑی شرط اور ولایت:** دعا کا تیسرا اور سب سے فکر انگیز پہلو اعمال کی قبولیت سے محروم نہ ہونے کی التجا ہے۔ بسا اوقات ریاکاری یا حسد ساری رات کی عبادت کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ قرآن نے اعمال کی قبولیت کو 'تقویٰ' سے مشروط کیا ہے۔ مزید برآں، مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام میں عمل کی قبولیت کی کنجی 'ولایت' ہے۔ امام باقر علیہ السلام کے فرمان کے مطابق، اگر کوئی شخص زندگی بھر روزے اور حج کرے مگر ولیِ خدا کی پہچان اور اطاعت نہ رکھے، تو اس کے اعمال کا اللہ پر کوئی حق نہیں۔ ہم اسی محرومی سے پناہ مانگتے ہیں۔ **حقِ مبین کی ہدایت اور محرابِ کوفہ کا پیغام:** دعا کا اختتام اللہ کو 'ہادیاً الی الحق المبین' (روشن حق کی طرف ہدایت دینے والے) پکارنے پر ہوتا ہے۔ یہ کائنات کا وہ حتمی سچ ہے جس میں باطل کی کوئی آمیزش نہیں۔ انیسویں رمضان کی صبح محرابِ کوفہ میں اسی حق کے سب سے بڑے پیکر (امیر المومنین علیہ السلام) پر وار کیا گیا۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا "علی حق کے ساتھ ہیں اور حق علی کے ساتھ ہے"۔ اس دعا میں ہم تجدیدِ عہد کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں ان لوگوں میں قرار نہ دینا جنہوں نے حق کو پہچان کر منہ موڑ لیا، بلکہ ہمیشہ ہمیں علی علیہ السلام کے روشن راستے پر قائم رکھنا۔

❖ رمضان المبارک کے انیسویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ شبِ قدر کی برکات اسی وقت حاصل ہوتی ہیں جب انسان کے اعمال تقویٰ اور ولایت کی شرط کے ساتھ قبولیت کے درجے پر پہنچیں۔ اور فتنوں کے دور میں گمراہی سے بچنے کا واحد راستہ اس روشن حق (حقِ مبین) سے وابستہ رہنا ہے جس کی گواہی تاریخ نے محرابِ کوفہ میں دی۔

تیسرا باب

تیسرا عشرہ: عشرۂ نجات؛ حتمی منزل اور استقامت



بیسویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ افْتَحْ لِي فِيهِ أَبْوَابَ الْجِنَانِ، وَأَغْلِقْ عَنِّي فِيهِ أَبْوَابَ النِّيرَانِ، وَوَفِّقْنِي فِيهِ لِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ، يَا مُنْزِلَ السَّكِينَةِ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ﴾

اے اللہ! میرے لیے اس مہینے میں جنت کے دروازے کھول دے، اور مجھ پر اس میں جہنم کے دروازے بند کر دے، اور مجھے اس میں قرآن کی تلاوت کی توفیق عطا فرما، اے مؤمنین کے دلوں میں سکون (سکینہ) نازل کرنے والے۔

بیسواں دن: ابوابِ آخرت، بہارِ قرآن اور نزولِ سکینہ

رمضان المبارک کا بیسواں دن، جو عشرۂ مغفرت کا اختتامی اور عشرۂ نجات (جہنم سے خلاصی کے آخری دس دن) کا ابتدائی موڑ ہے، بندگی کے سفر کا ایک انتہائی فیصلہ کن مقام ہے۔ اس دن پہنچ کر روزے دار کی نگاہیں دنیا کی عارضی اور مادی طلب سے کٹ کر سیدھی اپنی ابدی منزلوں (جنت اور جہنم) پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ یہ دعا در حقیقت انسان کے حتمی انجام کو محفوظ بنانے کا ایک عظیم الشان الٰہی نصاب ہے۔ اس کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ جنت یا جہنم کے دروازے لکڑی یا لوہے کے نہیں کہ انہیں کسی مادی چابی سے کھولا یا بند کیا جا سکے، بلکہ انسان کے 'صالح اعمال' ہی جنت کی کنجیاں ہیں، اور اس کے 'گناہ آلود اعضاء' ہی جہنم کے دروازے ہیں۔ یہ مناجات ہمیں سکھاتی ہے کہ جب تک ہم کلامِ الٰہی (قرآنِ مجید) سے محض الفاظ کی حد تک نہیں، بلکہ عملی تلاوت (پیروی) کا رشتہ استوار نہیں کرتے، تب تک ہم ان ابدی دروازوں کے راز نہیں پا سکتے۔ اس بیان کا لبِ لباب یہ ہے کہ جب انسان جنت کی کشادگی، جہنم کی بندش اور قرآن کی تلاوت کو اپنی زندگی کا محور بنا لیتا ہے، تو پروردگار اس کے بے چین دل پر 'سکینہ' (وہ الٰہی طمانیت اور ٹھہراؤ جو دنیا کی کوئی دولت نہیں دے سکتی) نازل فرما دیتا ہے، جس سے اس کا ایمان کامل اور اس کی روح ابدی سکون پا لیتی ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے بیسویں دن کی دعا انسان کو اس کے ابدی انجام اور حتمی منزل (آخرت) کی فکر دلاتی ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ جنت کی نعمتوں کا حصول نیک اعمال کی کنجیوں سے، اور جہنم کے عذاب سے نجات گناہوں کے دروازے بند کرنے سے مشروط ہے۔ یہ دعا دراصل

رمضان کی بہار (قرآن) کی عملی پیروی اور تلاوت کے ذریعے، دلوں کو پلٹنے والے خدا سے اس قلبی سکون (سکینہ) کو مانگنے کا نام ہے، جو دنیا کے ہر خوف اور اضطراب کو مٹا دیتا ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **جنت کے دروازوں کی کشادگی:** جنت کے ان آٹھ دروازوں (خصوصاً روزے داروں کے دروازے 'ریان') کو اپنے لیے کھلا رکھنے کی التجا، جس کا اصل مطلب ان صالح اعمال کی توفیق مانگنا ہے جو جنت کی چابیاں ہیں۔
- **جہنم کے دروازوں کی بندش:** جہنم کے ان سات دروازوں (جو دراصل انسان کے وہ سات اعضاء ہیں جن سے گناہ ہوتا ہے) کو خود پر بند کرنے کی پکار، تاکہ ابدی قہر اور ہلاکت سے پناہ مل سکے۔
- **تلاوتِ قرآن کی توفیق:** ماہِ صیام جو کہ قرآن کی بہار ہے، اس میں کلامِ الٰہی کی محض قراءت (پڑھنے) کے بجائے، اس کی 'تلاوت' (پیروی اور احکامات پر عمل) کرنے کی بصیرت مانگنا۔
- **دلوں پر سکینہ کا نزول:** دنیا کی پریشانیوں اور مادی دوڑ سے تھکے ہوئے دل پر اللہ کی طرف سے اس 'سکینہ' (ٹھہراؤ اور اطمینان) کا نزول، جو مؤمن کے ایمان کو مضبوط اور اس کی روح کو پرسکون کر دیتا ہے۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

۱. اَللَّهُمَّ افْتَحْ لِي فِيهِ أَبْوَابَ الْجِنَانِ

ابوابِ جنت کی کشادگی اور اعمال کی چابیاں

دعا کا پہلا فقرہ انسان کی حتمی کامیابی اور جنت کی وسعتوں کی طلب ہے: "اے اللہ! میرے لیے اس مہینے میں جنت کے دروازے کھول دے"۔ عربی لغت اور قرآنی اصطلاح میں "جِنَان" (جنت کی جمع) باغات کو کہا جاتا ہے۔ جنت کوئی ایک محدود جگہ نہیں، بلکہ درجات اور مراتب کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، اور احادیث کی روشنی میں اس کے آٹھ دروازے ہیں۔ ہر دروازہ انسان کے کسی خاص عمل اور فضیلت کی نمائندگی کرتا ہے۔ جنت کے دروازے لکڑی یا لوہے کے نہیں بنے ہوئے کہ انہیں کسی مادی چابی سے کھولا جا سکے، بلکہ انسان کے "صالح اعمال" ہی دراصل ان دروازوں کی چابیاں ہیں۔ جب بندہ بارگاہِ الٰہی میں التجا کرتا ہے کہ "جنت کے دروازے کھول دے"، تو اس کا حقیقی اور عرفانی مطلب یہ ہے کہ "اے پروردگار! مجھے ان تمام نیکیوں اور اعمال کی توفیق عطا فرما جو جنت کے مختلف دروازوں تک لے جاتے ہیں"۔ رسولِ خدا ﷺ نے روزے داروں کے لیے جنت کے ایک مخصوص دروازے کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا: «إِنَّ لِلْجَنَّةِ بَاباً يُدْعَى الرَّيَّانَ، لَا يَدْخُلُ مِنْهُ إِلَّا الصَّائِمُونَ» "یقیناً جنت کا ایک دروازہ ہے جسے 'ریّان' (سیراب کرنے والا) کہا جاتا ہے، اس دروازے سے روزے داروں کے سوا کوئی اور داخل نہیں ہوگا"[1]۔ دنیا میں روزے کی شدتِ

---

[1] شیخ صدوق، معانی الأخبار، صفحہ ۴۰۹۔

پیاس کو برداشت کرنے کا صلہ یہ ہے کہ جنت کا وہ دروازہ جو ابدی سیرابی کا ضامن ہے، ان کے لیے کھول دیا جاتا ہے۔ پس بیسویں دن ہم اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ ہمارے روزوں اور عبادات میں وہ خلوص پیدا کردے جو ان ابوابِ جنان کو ہمیشہ کے لیے ہمارے روبرو کشادہ کردے۔

٢. وَأَغْلِقْ عَنِّي فِيهِ أَبْوَابَ النِّيرَانِ

جہنم کے دروازوں کی بندش اور گناہوں سے دوری

دعا کا دوسرا تقاضا ابدی قہر اور ہلاکت سے پناہ مانگنے پر مبنی ہے: "اور مجھ پر اس میں جہنم کے دروازے بند کردے"۔ جس طرح جنت کے آٹھ دروازے ہیں، اسی طرح قرآنِ مجید کی صریح نص کے مطابق جہنم کے سات دروازے ہیں: ﴿لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِّكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ﴾ "اس (جہنم) کے سات دروازے ہیں، ان میں سے ہر دروازے کے لیے (گمراہوں کا) ایک مخصوص حصہ تقسیم کردیا گیا ہے"[1]۔ جلیل القدر علماء فرماتے ہیں کہ جہنم کے یہ سات دروازے دراصل انسان کے وہ سات ظاہری اعضاء (آنکھ، کان، زبان، پیٹ، شرمگاہ، ہاتھ اور پاؤں) ہیں جن کے ذریعے وہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ جب انسان اپنی آنکھ کو نامحرم سے، زبان کو غیبت سے، اور پیٹ کو حرام لقمے سے بند کرلیتا ہے، تو وہ درحقیقت اسی دنیا میں اپنے اوپر جہنم کے دروازے بند کررہا ہوتا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام انسان کو اس شدتِ عذاب سے خبردار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «فَاحْذَرُوا نَاراً قَعْرُهَا بَعِيدٌ، وَحَرُّهَا شَدِيدٌ، وَعَذَابُهَا جَدِيدٌ» "پس اس آگ

---

[1] قرآن مجید، سورہ الحجر، آیت ۴۴۔

سے بچو جس کی گہرائی بہت دور ہے، جس کی تپش انتہائی کڑی ہے، اور جس کا عذاب (ہر لمحہ) نیا ہے"[۱]۔ ہم اس دعا کے ذریعے التجا کرتے ہیں کہ یارب! ہمیں وہ کامل تقویٰ عطا فرما جو ہمارے اعضاء پر ایسا کنٹرول قائم کر دے کہ گناہ کی راہیں مسدود ہو جائیں اور ہم پر جہنم کے دروازے ابد تک کے لیے بند ہو جائیں۔

۳. وَوَفِّقْنِي فِيهِ لِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ

بہارِ قرآن، علمِ الٰہی کا نزول اور روح کی سیرابی

تیسرا فقرہ ماہِ رمضان کے سب سے عظیم عمل اور قلب کی حیات سے متعلق ہے: "اور مجھے اس میں قرآن کی تلاوت کی توفیق عطا فرما"۔ رمضان المبارک اور قرآن کا رشتہ جسم اور روح جیسا ہے۔ یہ وہ مبارک مہینہ ہے جس میں کلامِ الٰہی لوحِ محفوظ سے قلبِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔ قرآن محض پڑھے جانے والے الفاظ کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ یہ اسرارِ کائنات، قوانینِ حیات، اور ابدی حقائق کا وہ لامحدود سمندر ہے جس کی گہرائیوں کا کوئی کنارہ نہیں۔ امام محمد باقر علیہ السلام رمضان اور قرآن کے اس لازوال تعلق کو ایک انتہائی خوبصورت تشبیہ کے ذریعے بیان فرماتے ہیں: «لِكُلِّ شَيْءٍ رَبِيعٌ، وَرَبِيعُ الْقُرْآنِ شَهْرُ رَمَضَانَ» "ہر چیز کی ایک بہار ہوتی ہے، اور قرآن کی بہار ماہِ رمضان ہے"[۲]۔ یہاں محض "قراءت" (پڑھنے) کا لفظ استعمال نہیں ہوا، بلکہ "تِلَاوَةِ الْقُرْآنِ" کا لفظ آیا ہے۔ تلاوت کا مادہ "تِلْو" ہے جس کا مطلب ہے پیچھے پیچھے چلنا اور پیروی کرنا۔ یعنی قرآن کی حقیقی تلاوت

---

[۱] سید رضی، نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۰۔
[۲] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۲، صفحہ ۶۳۰۔

وہ ہے جس میں انسان آیات کو پڑھے، ان کے معانی و تفاسیر میں غوطہ زن ہو، اور پھر اپنی زندگی کو ان احکامات کے سانچے میں ڈھال لے۔ قرآن کے اسرار تب تک منکشف نہیں ہوتے جب تک کہ انسان کا دل دنیا کی آلودگیوں سے پاک نہ ہو۔ ہم اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ اے خالق! ہمیں وہ بصیرت عطا کر کہ ہم قرآن کے ظاہری الفاظ سے گزر کر اس کے باطنی مفاہیم اور انوار تک رسائی حاصل کر سکیں۔

٤. يَا مُنْزِلَ السَّكِينَةِ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ

نزولِ سکینہ اور قلب کا ابدی اطمینان

دعا کا حتمی اختتام ایک ایسے واسطے اور پکار پر ہوتا ہے جو دنیا کی تمام پریشانیوں کا واحد علاج ہے: "اے مؤمنین کے دلوں میں سکون (سکینہ) نازل کرنے والے"۔ "سَكِينَة" لغت میں اس ٹھہراؤ، امن اور قلبی اطمینان کو کہتے ہیں جو ہر قسم کے خوف، اضطراب اور طوفان کے باوجود انسان کے دل کو ثابت قدم رکھتا ہے۔ کائنات کی کوئی مادی دولت، کوئی منصب اور کوئی طاقت انسان کو یہ "سکینہ" فراہم نہیں کر سکتی، کیونکہ اس کا کنٹرول صرف اور صرف مقلب القلوب (دلوں کو پلٹنے والے خدا) کے ہاتھ میں ہے۔ قرآنِ مجید میں نزولِ سکینہ کا ذکر ایمان کی تقویت کے ساتھ کیا گیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَّعَ إِيمَانِهِمْ﴾

"وہی تو ہے جس نے مؤمنین کے دلوں میں سکون (سکینہ) نازل کیا تاکہ ان کے ایمان کے ساتھ

مزید ایمان کا اضافہ ہو جائے"[۱]۔ جب انسان جنت کے دروازے کھلنے اور جہنم کے بند ہونے کی امید رکھتا ہے، اور کلامِ الٰہی کی تلاوت سے اپنے رب سے ہمکلام ہوتا ہے، تو اس کے نتیجے میں دل پر جو کیفیّت طاری ہوتی ہے، اسی کا نام "سکینہ" ہے۔ امیر المومنین علی علیہ السلام اس اطمینانِ قلب کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «أَصْلُ صَلَاحِ الْقَلْبِ اشْتِغَالُهُ بِذِكْرِ اللَّهِ» "دل کے سنورنے کی بنیاد (اور اس کی اصلاح کی جڑ) اس کا اللہ کے ذکر میں مشغول ہونا ہے"[۲]۔ پس بیسویں دن کی یہ دعا ہمیں بے سکون دنیا کی دوڑ سے نکال کر اس الٰہی سکون کی وادی میں پہنچا دیتی ہے جہاں انسان کا دل اپنے خالق کے فیصلوں پر مکمل طور پر راضی اور مطمئن ہو جاتا ہے۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے بیسویں دن کی دعا در حقیقت آخرت کی تیاری، قرآن سے عملی وابستگی اور قلبی طمانیت کے حصول کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

ابوابِ جنان اور اعمال کی چابیاں: دعا کا آغاز جنت کے دروازے کھولنے کی التجا سے ہوتا ہے۔ احادیث کے مطابق جنت کے آٹھ دروازے ہیں اور ہر دروازہ کسی خاص عمل (فضیلت) کی نمائندگی کرتا ہے۔ جنت کے دروازے اعمالِ صالحہ سے کھلتے ہیں۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت کے مطابق، روزے کی شدتِ پیاس برداشت کرنے والوں کے لیے جنت کا خاص دروازہ 'ریان' (سیراب کرنے والا) کھولا جائے گا۔ یہ فقرہ دراصل ان اعمالِ صالحہ کی توفیق مانگنے کا استعارہ ہے جو جنت کی کنجیاں ہیں۔ **جہنم کے دروازے اور اعضاء کا کنٹرول:** دعا کا دوسرا تقاضا جہنم کے دروازے بند کروانے کا ہے۔ قرآن کی صریح

---

[۱] قرآن مجید، سورہ الفتح، آیت ۴۔

[۲] عبد الواحد آمدی، غرر الحکم و درر الکلم، صفحہ ۲۲۵۔

نص کے مطابق جہنم کے سات دروازے ہیں۔ علمائے کرام فرماتے ہیں کہ یہ سات دروازے انسان کے وہ سات ظاہری اعضاء (آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پاؤں، پیٹ اور شرمگاہ) ہیں جن سے گناہ سرزد ہوتا ہے۔ جب انسان تقویٰ کے ذریعے ان اعضاء کو حرام سے روک لیتا ہے، تو وہ دنیا میں ہی خود پر جہنم کے دروازے بند کر لیتا ہے۔ امیر المومنین علی علیہ السلام نے اس آگ کی شدت سے ڈرایا ہے جس کا عذاب ہر لحہ نیا ہے۔ **بہارِ قرآن اور عملی تلاوت:** دعا کا تیسرا فقرہ رمضان کے سب سے عظیم عمل، یعنی تلاوتِ قرآن کی توفیق پر مبنی ہے۔ امام باقر علیہ السلام کے فرمان کے مطابق، رمضان قرآن کی بہار ہے۔ یہاں محض لفظوں کو پڑھنے (قراءت) کی بجائے 'تلاوت' کا لفظ آیا ہے، جس کا مادہ 'تلو' (پیروی کرنا) ہے۔ یعنی انسان قرآن کے معانی میں غوطہ زن ہو کر اپنی عملی زندگی کو اس کے احکامات کے سانچے میں ڈھالے۔ **نزولِ سکینہ اور ابدی اطمینانِ قلب:** دعا کا اختتام دلوں میں 'سکینہ' نازل کرنے والے رب کی پکار پر ہوتا ہے۔ سکینہ وہ الٰہی ٹھہراؤ، امن اور طمانیت ہے جو دنیا کے ہر طوفان اور اضطراب میں دل کو ثابت قدم رکھتا ہے۔ کائنات کی کوئی دولت یہ سکون نہیں دے سکتی۔ قرآن کے مطابق، سکینہ کا نزول مؤمن کے ایمان میں اضافے کا باعث ہے۔ جب انسان اعمالِ صالحہ، ترکِ گناہ اور تلاوتِ قرآن سے جڑتا ہے، تو اللہ اس کے دل پر وہ سکینہ نازل فرماتا ہے جو اسے دنیوی پریشانیوں سے نکال کر ابدی سکون کی وادی میں پہنچا دیتا ہے۔

❖ رمضان المبارک کے بیسویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ ہماری حتمی کامیابی کا انحصار جنت کے حصول اور جہنم سے نجات پر ہے، جس کا واحد راستہ قرآن کی عملی پیروی ہے۔ جب انسان کا تعلق کلامِ الٰہی سے مضبوط ہو جاتا ہے، تو دلوں کو پلٹنے والا خدا اسے دنیا اور آخرت کا ابدی سکون (سکینہ) عطا فرما دیتا ہے۔

اکیسویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ اجْعَلْ لِي فِيهِ إِلَىٰ مَرْضَاتِكَ دَلِيلًا، وَلَا تَجْعَلْ لِلشَّيْطَانِ فِيهِ عَلَيَّ سَبِيلًا، وَاجْعَلِ الْجَنَّةَ لِي مَنْزِلًا وَمَقِيلًا، يَا قَاضِيَ حَوَائِجِ الطَّالِبِينَ﴾

اے اللہ! میرے لیے اس مہینے میں اپنی رضا (خوشنودی) کی طرف کوئی رہبر (دلیل/راستہ) قرار دے، اور اس میں شیطان کے لیے مجھ پر کوئی راستہ نہ رکھ، اور جنت کو میری منزل اور آرام گاہ قرار دے، اے طلب کرنے والوں کی حاجتیں پوری کرنے والے۔

اکیسواں دن: تلاشِ رہبر، حصارِ نفس اور ابدی مقیل

ماہِ رمضان کا اکیسواں دن اسلامی تاریخ کا وہ عظیم، رقت انگیز اور دوہری اہمیت کا حامل مقام ہے جہاں کائنات کی عظیم ترین ہستی، عدل و انصاف کے پیکر، امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شہادت واقع ہوئی۔ یہ دن ایک طرف یتیموں کے باپ کے اٹھ جانے کے غم کا استعارہ ہے اور دوسری طرف 'شبِ قدر' کی ان عظیم ساعتوں کا امین ہے جن میں مقدرات پر حتمی مہر ثبت ہوتی ہے۔ اس دن کی دعا انسان کو بندگی کے اس انتہائی حساس موڑ پر لے آتی ہے جہاں اسے یہ ادراک ہوتا ہے کہ اس کی محدود عقل اللہ کی لامحدود رضا تک پہنچنے کے لیے ناکافی ہے۔ لہٰذا، وہ اللہ سے ایک 'کامل رہبر' (دلیل) کی طلب کرتا ہے جس کا عمل خود خدا کا عمل ہو، اور جس کی گواہی آج محرابِ کوفہ دے رہی ہے۔ یہ مناجات ہمیں سکھاتی ہے کہ شیطان انسان پر باہر سے حملہ نہیں کرتا بلکہ وہ نفس کی خواہشات کے ذریعے اندرونی 'راستے' (سبیل) بناتا ہے، جنہیں مسدود کرنا روزے کا اصل ہدف ہے۔ اس بیان کا لبِ لباب یہ ہے کہ دنیا کا سفر ایک تھکا دینے والا جہادِ اکبر ہے، اور جب انسان سچے رہبر کی انگلی پکڑ کر شیطانی وسوسوں سے بچ نکلتا ہے، تو وہ پروردگار کی بارگاہ میں التجا کرتا ہے کہ اس کٹھن سفر کے بعد اسے جنت کے اس ابدی سکون اور آرام گاہ (مقیل) میں جگہ عطا کی جائے، جو صرف قاضی الحاجات ہی دے سکتا ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے اکیسویں دن کی دعا انسان کو رضائے الٰہی تک پہنچنے کے لیے ایک سچے ہادی اور کامل رہبر (دلیل) کی ضرورت کا احساس دلاتی ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ شیطان کے ان پوشیدہ راستوں کو بند کیا جائے جو نفس کی خامیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ دعا دراصل دنیا کے تھکا دینے والے سفر کے بعد، جنت کو اپنی حتمی آرام گاہ (مقیل) بنانے کے لیے تمام حاجتوں کے اکیلے مرکز (قاضی الحاجات) پر کامل توکل کرنے کا ایک عظیم روحانی لائحہ عمل ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **رضائے الٰہی کے لیے کامل رہبر:** اپنی ناقص عقل پر بھروسہ کرنے کے بجائے، اللہ کی رضا تک پہنچنے کے لیے اس سچے ہادی (دلیل) کی انگلی پکڑنا جو خود رضائے الٰہی کا مظہر ہے (جیسے محمد و آلِ محمد ع)۔
- **شیطانی راستوں (سبیل) کی مسدودی:** نفسانی خواہشات، غصے اور لالچ پر کنٹرول حاصل کر کے شیطان کے ان تمام پوشیدہ راستوں اور غلبے کو بند کرنا جو گناہ کی طرف لے جاتے ہیں۔
- **جنت بطورِ ابدی آرام گاہ (مقیل):** دنیا کے کٹھن امتحانات اور جہادِ اکبر کی تھکاوٹ کے بعد، جنت کے اس مستقل اور پرسکون مقام (مقیل) کی طلب جہاں کوئی دکھ اور تکلیف نہ ہو۔
- **قاضی الحاجات پر کامل انحصار:** رہبر کی معرفت اور شیطانی حملوں سے پناہ جیسی کائناتی حاجتوں کو دنیا والوں کے بجائے، صرف اس پروردگار کی بارگاہ میں پیش کرنا جو ہر طلب کرنے والے کی حاجت روائی کرتا ہے۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

١. اَللَّهُمَّ اجْعَلْ لِي فِيهِ إِلَىٰ مَرْضَاتِكَ دَلِيلًا

رضائے الٰہی کی جستجو اور کامل رہبر کی طلب

دعا کا پہلا فقرہ انسان کی روحانی بے بسی اور ایک ہادیِ برحق کی ضرورت کا اعلان ہے: "اے اللہ! میرے لیے اس مہینے میں اپنی رضا (خوشنودی) کی طرف کوئی رہبر (دلیل/راستہ) قرار دے"۔

"دَلیل" کا مطلب لغت میں وہ رہبر، رہنما اور نشانی ہے جو اندھیرے اور بھٹکنے کے مقامات پر انسان کی انگلی پکڑ کر اسے صحیح منزل تک پہنچا دے۔ انسان کی عقل محدود ہے، اور رضائے الٰہی (خدا کی خوشنودی) کا مقام لامحدود اور انتہائی بلند ہے۔ انسان اپنی ناقص عقل کے بل بوتے پر کبھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ خدا کس عمل سے راضی ہوتا ہے اور کس سے ناراض۔ اسے ہر قدم پر ایک ایسے الٰہی نمائندے اور "دلیل" کی ضرورت ہوتی ہے جس کا عمل خود خدا کا عمل ہو، جس کی رضا خدا کی رضا ہو، اور جو انسان کو کھینچ کر مَرْضَاتِکَ (تیری رضا) تک لے جائے۔

مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام کے خالص عقیدے کی رو سے یہ "دلیل" اور رہبر کوئی اور نہیں، بلکہ محمد و آلِ محمد علیہم السلام کی ذواتِ مقدسہ ہیں۔ زیارتِ جامعہ کبیرہ میں ان پاکیزہ ہستیوں کو مخاطب کرتے ہوئے ہم اسی عظیم قرآنی اور عرفانی حقیقت کا اقرار کرتے ہیں: «وَالْأَدِلَّاءَ عَلَى صِرَاطِهِ... وَأَنْتُمُ الْأَدِلَّاءُ عَلَى مَرْضَاتِهِ» "اور (آپ حضرات) اس کے (سیدھے) راستے کے رہنما (دلیلیں)

ہیں... اور آپ ہی اس کی رضا (خوشنودی) تک پہنچانے والے رہبر ہیں"[1]۔

اکیسویں رمضان کو، جب "رضائے الٰہی کی سب سے بڑی دلیل" (علی علیہ السلام) اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں، روزے دار اللہ سے گڑگڑا کر التجا کرتا ہے کہ اے پروردگار! اس دنیا کی گمراہیوں میں مجھے تنہا نہ چھوڑنا، بلکہ مجھے اس ہادیِ برحق (امامِ زمانہ علیہ السلام) کے دامن سے وابستہ رکھنا جو آج کے دور میں تیری رضا تک پہنچنے کی واحد دلیل اور راستہ ہے۔

۲. وَلَا تَجْعَلْ لِلشَّيْطَانِ فِيهِ عَلَيَّ سَبِيلًا

شیطانی راستوں کی مسدودی اور روحانی حصار

دعا کا دوسرا تقاضا نفس کی حفاظت اور شیطانی وسوسوں سے دفاع سے متعلق ہے: "اور اس میں شیطان کے لیے مجھ پر کوئی راستہ (سبیل) نہ رکھ"۔

لفظ "سَبِیل" کا مطلب راستہ، غلبہ، یا تسلط ہے۔ شیطان انسان پر اچانک باہر سے حملہ نہیں کرتا، بلکہ وہ انسان کے باطن، اس کی خواہشات، اس کے غصے، اس کی لالچ، اور اس کی انا کے ذریعے اپنے لیے "راستے" (سبیل) بناتا ہے۔ جب انسان گناہ کی طرف ایک قدم بڑھاتا ہے، تو وہ در حقیقت شیطان کو اپنے وجود پر غلبہ پانے کا ایک راستہ فراہم کر دیتا ہے۔

قرآنِ مجید ایک انتہائی واضح اور دوٹوک اصول بیان کرتا ہے کہ شیطان کا ان لوگوں پر کوئی غلبہ (سبیل/سلطان) نہیں جو اللہ پر خالص توکل کرتے ہیں: ﴿إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ

[1] شیخ صدوق، من لا یحضرہ الفقیہ، جلد ۲، صفحہ ۶۱۳۔

آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ﴾ "یقیناً اس (شیطان) کا کوئی غلبہ ان لوگوں پر نہیں ہے جو ایمان لائے اور صرف اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس کا غلبہ تو صرف ان لوگوں پر ہے جو اسے اپنا سرپرست (دوست) بناتے ہیں"[۱]۔

روزہ دراصل شیطان کے ان راستوں کو تنگ کرنے کی ایک جسمانی اور روحانی مشق ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام شیطان کے راستوں کو مسدود کرنے کا طریقہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں: «أَغْلِقُوا أَبْوَابَ الْمَعْصِيَةِ بِالِاسْتِعَاذَةِ، وَافْتَحُوا أَبْوَابَ الطَّاعَةِ بِالتَّسْمِيَةِ» "گناہ کے دروازوں کو (اعوذ باللہ پڑھ کر) پناہ مانگنے کے ذریعے بند کر دو، اور اطاعت کے دروازوں کو (بسم اللہ پڑھ کر) اللہ کا نام لینے کے ذریعے کھول دو"[۲]۔

پس اس فقرے میں ہم التجا کرتے ہیں کہ یا اللہ! میرے دل کو ایسا مضبوط قلعہ بنا دے جس میں شیطان کے داخلے کی تمام راہیں ہمیشہ کے لیے مسدود ہو جائیں۔

۳. وَاجْعَلِ الْجَنَّةَ لِي مَنْزِلًا وَمَقِيلًا

ابدی سکون اور دارِ قرار کا حصول

تیسرا فقرہ انسان کے حتمی انجام، اس کی آخری منزل اور ابدی سکون کی طلب ہے: "اور جنت کو میری منزل اور آرام گاہ قرار دے"۔

---

[۱] قرآن مجید، سورہ النحل، آیت ۹۹-۱۰۰۔

[۲] محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، جلد ۹۰، صفحہ ۲۱۶۔

اس دعا میں دو انتہائی پرکشش الفاظ استعمال ہوئے ہیں: "مَنْزِل" (جائے قیام/جہاں انسان کا سفر ختم ہو) اور "مَقِیل"۔ عربی زبان میں "مقیل" (قیلولہ سے مشتق) دن کے وقت کے اس آرام اور سکون کی جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں انسان شدید تھکاوٹ کے بعد لیٹ کر راحت محسوس کرتا ہے[۱]۔

دنیا کی زندگی مؤمن کے لیے ایک انتہائی تھکا دینے والا اور دشوار گزار سفر ہے۔ یہاں قدم قدم پر آزمائشیں، بیماریاں، نفس کی مزاحمت، اور شیطانی حملے ہیں۔ اس مسلسل جہادِ اکبر کے بعد روح ایک ایسے سکون کی متلاشی ہوتی ہے جہاں اسے کوئی خوف، کوئی دکھ اور کوئی تھکاوٹ نہ چھو سکے۔ قرآنِ مجید نے اہلشتِ جنت کے اسی ابدی آرام (مقیل) کی منظرکشی ان الفاظ میں کی ہے: ﴿أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَأَحْسَنُ مَقِيلًا﴾ "اس دن جنت والے قیام گاہ کے اعتبار سے بھی بہترین ہوں گے اور آرام گاہ (مقیل) کے اعتبار سے بھی سب سے اچھے ہوں گے"[۲]۔

دنیوی محلات اور بستیاں عارضی آرام گاہیں ہیں۔ امیر المومنین علی علیہ السلام دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی پائیداری کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «الدُّنْيَا دَارُ مَمَرٍّ لَا دَارُ مَقَرٍّ... فَخُذُوا مِنْ مَمَرِّكُمْ لِمَقَرِّكُمْ» "دنیا گزرنے کی جگہ ہے، ٹھہرنے کی جگہ نہیں... پس اپنی اس گزر گاہ سے اپنی اس قیام گاہ (آخرت) کے لیے زادِ راہ اکٹھا کر لو"[۳]۔

بندہ اللہ سے التجاء کرتا ہے کہ اے رب! دنیا کے اس تھکا دینے والے سفر کے بعد، مجھے اپنے

---

[۱] راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، مادہ ق ی ل۔

[۲] قرآن مجید، سورہ الفرقان، آیت ۲۴۔

[۳] سید رضی، نہج البلاغہ، حکمت ۱۳۳۔

دربار کے مقربین میں شامل کر کے جنت کو میری ابدی آرام گاہ (مقیل) قرار دے۔

٤ . يَا قَاضِيَ حَوَائِجِ الطَّالِبِينَ

تمام مُطالبات کا مرکز اور قاضی الحاجات

دعا کا اختتام ایک ایسے عظیم اور وسیع واسطے پر ہوتا ہے جو انسان کی تمام ضرورتوں کو کائنات کے مالک سے جوڑ دیتا ہے: "اے طلب کرنے والوں کی حاجتیں پوری کرنے والے"۔

جب انسان اللہ سے رضائے الٰہی کی رہنمائی، شیطان سے تحفظ، اور جنت جیسی عظیم الشان منزل مانگتا ہے، تو یہ حاجتیں دنیوی بادشاہوں کی دسترس سے کوسوں دور ہوتی ہیں۔ ان عظیم المرتبت طلبوں کو پورا کرنے کی طاقت صرف اس ذات کے پاس ہے جو "قاضی الحاجات" ہے۔

طالب (طلب کرنے والا) جب تک اس کائنات کے دروازوں پر دستک دیتا ہے، مایوس رہتا ہے، لیکن جب وہ اپنی طلب کا رخ اس پروردگار کی جانب موڑ لیتا ہے جو بنا مانگے عطا کرنے پر قادر ہے، تو اس کی کوئی حاجت رد نہیں ہوتی۔ امام زین العابدین علیہ السلام مناجاتِ مفتقرین میں اس شانِ کریمی کو یوں پکارتے ہیں: «وَيَا مَنْ إِلَيْهِ يَفْزَعُ الْمُذْنِبُونَ، وَيَا مَنْ إِلَيْهِ يَلْجَأُ الْخَائِفُونَ، يَا غَايَةَ الطَّالِبِينَ» "اور اے وہ ذات جس کی طرف گنہگار فریاد لے کر آتے ہیں، اور اے وہ ذات جس کی طرف خوفزدہ پناہ لیتے ہیں، اے طلب کرنے والوں کی آخری منزل"[1]۔

اکیسویں روزے کی افطار اور شبِ قدر کی اس رقت انگیز ساعت میں، بندہ اپنا دامن پھیلا کر یہ

---

[1] شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، مناجاتِ مفتقرین۔

اقرار کرتا ہے کہ اے قاضی الحاجات، میری سب سے بڑی حاجت تیری رضا کے ہادی (امام) کی معرفت، نفسِ امارہ سے نجات، اور تیرے قرب کی منزل ہے۔ پس اپنے فضل سے میری ان تمام روحانی اور مادی طلبوں کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے اکیسویں دن کی دعا درحقیقت ہادیِ برحق کی پہچان، نفس کے حصار اور ابدی سکون کی جستجو کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

- **رضائے الٰہی کی جستجو اور کامل رہبر کی طلب:** دعا کا آغاز 'مرضات' (اللہ کی رضا) تک پہنچنے کے لیے ایک 'دلیل' (رہبر/راستہ) مانگنے سے ہوتا ہے۔ انسان کی عقل ناقص ہے اور وہ تنہا اللہ کی رضا نہیں پا سکتا، اسے ایک ایسے نمائندے کی ضرورت ہوتی ہے جو اندھیرے میں اس کی انگلی پکڑ لے۔ زیارتِ جامعہ کبیرہ کی رو سے یہ دلیل اہلِ بیت علیہم السلام کی ذوات ہیں۔ اکیسویں رمضان کو، جب 'رضائے الٰہی کی سب سے بڑی دلیل' (حضرت علی علیہ السلام) رخصت ہو رہے ہیں، روزے دار اللہ سے ہادیِ برحق (امامِ زمانہ ع) کے دامن سے وابستہ رہنے کی التجا کرتا ہے۔
شیطانی راستوں کی مسدودی اور روحانی حصار: دعا کا دوسرا فقرہ شیطان کے غلبے (سبیل) سے پناہ پر مبنی ہے۔ شیطان انسان پر تسلط نہیں رکھتا، بلکہ وہ انسان کے باطن (غصہ، لالچ) کے ذریعے اپنے لیے 'راستے' بناتا ہے۔ قرآن کے مطابق، شیطان کا زور ان پر نہیں چلتا جو اللہ پر خالص توکل کرتے ہیں۔ امام صادق علیہ السلام کے فرمان کی روشنی میں، یہ دعا دل کو ایک ایسا مضبوط قلعہ بنانے کی پکار ہے جس میں شیطانی وسوسوں کے داخلے کے تمام دروازے مسدود ہو جائیں۔

- **ابدی سکون اور دارِ قرار کا حصول:** دعا کے تیسرے فقرے میں جنت کو 'منزل' اور 'مقیل' قرار دینے کی التجا کی گئی ہے۔ لغت میں 'مقیل' شدید تھکاوٹ کے بعد آرام کرنے کی وہ پر سکون جگہ ہے جہاں کوئی خوف نہ ہو۔ دنیا کی زندگی مؤمن کے لیے ایک تھکا دینے والا جہاد ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام کی تنبیہ کے مطابق دنیا محض گزر گاہ ہے۔ بندہ التجا کرتا ہے کہ یا رب، اس کٹھن دنیوی سفر کے بعد مجھے جنت کی اس ابدی اور پائیدار آرام گاہ (مقیل) میں جگہ عطا کر۔ **تمام مطالبات کا مرکز اور قاضی الحاجات:** دعا کا اختتام 'قاضی الحاجات' (حاجتیں پوری کرنے والے) کے عظیم واسطے پر ہوتا ہے۔ رضائے الٰہی کا ہادی، شیطان سے تحفظ، اور جنت کا حصول ـــ یہ ایسی حاجتیں ہیں جو دنیوی بادشاہ نہیں دے سکتے۔ امام زین العابدین علیہ السلام کی مناجات کے مطابق، اللہ ہی وہ ذات ہے جس کی طرف گنہگار اور خوفزدہ لوگ پناہ لیتے ہیں۔ شبِ قدر کی اس رقت انگیز ساعت میں، بندہ اپنا دامن پھیلا کر اقرار کرتا ہے کہ اے رب، میری ان تمام روحانی اور مادی طلبوں کو اپنے فضل سے شرفِ قبولیت عطا فرما۔

❖ رمضان المبارک کے اکیسویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ جب تک انسان کو اللہ کی رضا تک پہنچانے والا سچا ہادی (دلیل) نہ مل جائے، وہ شیطان کے راستوں (سبیل) سے نہیں بچ سکتا۔ اور اس جہادِ اکبر کی حتمی کامیابی یہ ہے کہ قاضی الحاجات کی بارگاہ سے جنت کا ابدی سکون (مقیل) حاصل ہو جائے۔

بائیسویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ افْتَحْ لِي فِيهِ أَبْوَابَ فَضْلِكَ، وَأَنْزِلْ عَلَيَّ فِيهِ بَرَكَاتِكَ، وَوَفِّقْنِي فِيهِ لِمُوجِبَاتِ مَرْضَاتِكَ، وَأَسْكِنِّي فِيهِ بُحْبُوحَاتِ جَنَّاتِكَ، يَا مُجِيبَ دَعْوَةِ الْمُضْطَرِّينَ﴾

اے اللہ !میرے لیے اس مہینے میں اپنے فضل کے دروازے کھول دے،اور مجھ پر اس میں اپنی برکتیں نازل فرما،اور مجھے اس میں اپنی رضا(خوشنودی) کے اسباب کی توفیق دے،اور مجھے اس میں اپنی جنتوں کے مرکز (درمیان) میں سکونت عطا فرما، اے بے قراروں (مضطرین) کی دعا قبول کرنے والے۔

بائیسواں دن: فضلِ الٰہی، اسبابِ رضا اور مرکزِ جنت

ماہِ رمضان کا بائیسواں دن، جو شبہائے قدر کی عظیم تجلیات اور امیر المومنین علیہ السلام کی شہادت کے پُراندوہ لمحات کے عین درمیان واقع ہے، بندگی کے ایک ایسے کٹھن مرحلے کی نشاندہی کرتا ہے جہاں انسان کا دل دنیا کے تمام سہاروں سے کٹ کر صرف بارگاہِ الٰہی کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر انسان کو اپنے اعمال کی بے بضاعتی اور کمزوری کا اس شدت سے احساس ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے 'عدل' کا سامنا کرنے سے لرز جاتا ہے اور گڑگڑا کر اس کے 'فضل' کا دامن تھام لیتا ہے۔ یہ دعا درحقیقت اسی حقیقت کا اعلان ہے کہ ہماری برسوں کی عبادتیں بھی پروردگار کی ایک نعمت کا حق ادا نہیں کرسکتیں، لہٰذا نجات صرف اسی صورت ممکن ہے جب خدا ہمارے استحقاق سے بڑھ کر ہم پر اپنی برکتیں نازل فرمائے۔ اس دعا کا سب سے خوبصورت عرفانی پہلو انسان کی بلند ہمتی ہے؛ وہ جنت کے محض کنارے پر یا کسی ادنیٰ مقام پر رکنے پر راضی نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک 'مضطر' (ایسا بے قرار شخص جس کے تمام ظاہری سہارے ٹوٹ چکے ہوں) بن کر جنت کے بالکل قلب اور مرکز (بحبوحہ) میں سکونت کی التجا کرتا ہے۔ یہ بیان ہمیں سکھاتا ہے کہ جب انسان اضطراب اور کامل بے بسی کی حالت میں پروردگار کو پکارتا ہے اور اس کی رضا کے اسباب کی توفیق مانگتا ہے، تو قاضی الحاجات اس کی جھولی کو اپنے لامحدود فضل سے بھر کر اسے مقربین کی ہمسائیگی (مرکزِ جنت) عطا فرما دیتا ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے بائیسویں دن کی دعا انسان کو اس کے اعمال پر غرور کرنے کے بجائے اللہ کے فضل اور برکت پر کامل توکل کا درس دیتی ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ رضائے الٰہی کے اسباب تلاش کرنے کے لیے محض ظاہری عبادات کافی نہیں، بلکہ دل کا اللہ کی طرف مائل ہونا شرط ہے۔ یہ دعا دراصل انسان کی بلند ہمتی اور اضطرار کی اس کیفیت کا نام ہے، جس میں وہ اپنے ناقص اعمال کے باوجود، پروردگار کے رحم و کرم پر بھروسہ کرتے ہوئے جنت کے سب سے اعلیٰ ترین مقام (بحبوحہ) اور اہلِ بیت علیہم السلام کی ہمسائیگی کا سوال کرتا ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **فضل کے دروازوں کی کشادگی:** اپنے اعمال کی بنیاد پر اللہ کے 'عدل' (انصاف) کا سامنا کرنے کے خوف سے بچتے ہوئے، اس کے 'فضل' (بغیر معاوضے اور استحقاق سے بڑھ کر عطا) کی پناہ مانگنا۔ **برکات کا نزول اور ابدیت:** ظاہری نعمتوں کے بجائے ان پوشیدہ 'برکتوں' کا نزول طلب کرنا جو رزق، عمر اور عبادات میں مستقل اضافہ اور سکون پیدا کرتی ہیں۔ **اسبابِ رضا کی توفیق:** اپنی ناقص عقل سے یہ فیصلہ کرنے کے بجائے کہ کون سا عمل بہتر ہے، اللہ سے ان مخصوص کاموں (موجبات) کی جانب رہنمائی مانگنا جو یقینی طور پر اس کی خوشنودی کا سبب بنتے ہیں۔ **بحبوحۂ جنت اور پکارِ مضطر:** اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود، ایک مایوس اور بے قرار (مضطر) انسان کی طرح گڑگڑا کر جنت کے مرکز، یعنی محمد و آلِ محمد علیہم السلام کی ہمسائیگی میں ابدی سکونت کی التجا۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

۱. اَللَّهُمَّ افْتَحْ لِي فِيهِ أَبْوَابَ فَضْلِكَ

فضلِ الٰہی کے دروازے اور عدل سے پناہ

دعا کا پہلا فقرہ انسان کے اپنے اعمال پر عدمِ اعتماد اور اللہ کی عطا پر کامل توکل کا مظہر ہے: "اے اللہ! میرے لیے اس مہینے میں اپنے فضل کے دروازے کھول دے"۔

عرفانِ اسلامی میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کے معاملے کی دو بنیادیں ہیں: "عدل" اور "فضل"۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو بالکل اتنا ہی ملے جتنا اس نے عمل کیا ہے (نہ کم، نہ زیادہ)۔ جبکہ فضل کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی محنت اور استحقاق سے کہیں بڑھ کر، اسے بغیر کسی معاوضے کے لامحدود عطا کیا جائے۔

اگر روزِ قیامت اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ اپنے "عدل" کی بنیاد پر فیصلہ کیا، تو کوئی بھی شخص اپنے اعمال کے بل بوتے پر نجات نہیں پا سکے گا، کیونکہ ہماری برسوں کی عبادت بھی اللہ کی دی ہوئی آنکھ کی ایک نعمت کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ اسی لیے انبیاء اور آئمہ علیہم السلام ہمیشہ اللہ کے فضل کو پکارتے تھے۔

سید الساجدین امام زین العابدین علیہ السلام صحیفہ سجادیہ میں نہایت عاجزی کے ساتھ اسی فضل کا سوال کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «إِلَهِي عَامِلْنِي بِفَضْلِكَ، وَلَا تُعَامِلْنِي بِعَدْلِكَ، فَإِنَّ عَدْلَكَ هَلَاكِي» "اے میرے معبود! میرے ساتھ اپنے فضل کا معاملہ فرما، اور میرے ساتھ

اپنے عدل کا معاملہ نہ کر، کیونکہ یقیناً تیرا عدل (اگر نافذ ہو گیا تو) میری ہلاکت ہے"[۱]۔

قرآنِ مجید نے بھی مؤمنین کو فضلِ الٰہی کی اسی وسعت کی بشارت دی ہے: ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ﴾ "پس جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور انہوں نے اسی (کے دامن) کو مضبوطی سے تھام لیا، تو وہ عنقریب انہیں اپنی خاص رحمت اور فضل میں داخل کر دے گا"[۲]۔ ہم بائیسویں دن کی اس دعا میں اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ یا رب! ہمارے ٹوٹے پھوٹے روزوں اور غفلت بھری نمازوں کو نہ دیکھ، بلکہ اپنے فضل کے وہ دروازے کھول دے جو ہماری تمام کوتاہیوں کو چھپا لیں۔

۲. وَأَنْزِلْ عَلَيَّ فِيهِ بَرَكَاتِكَ

برکتوں کا نزول اور نعمتوں میں ابدیت

دعا کا دوسرا تقاضا آسمانی اور زمینی نعمتوں میں اضافے اور ٹھہراؤ سے متعلق ہے: "اور مجھ پر اس میں اپنی برکتیں نازل فرما"۔ "بَرَكَة" عربی زبان میں اس خیر، بھلائی اور نعمت کو کہتے ہیں جو مستقل ہو، جس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، اور جو انسان کے لیے نفع بخش ثابت ہو[۳]۔

نعمت اور برکت میں ایک واضح فرق ہے۔ نعمت وہ ہے جو ظاہر میں موجود ہو (جیسے مال، اولاد، وقت)، لیکن برکت اس نعمت کی وہ پوشیدہ کیفیت ہے جو اسے انسان کے لیے باعثِ سکون بناتی ہے۔

---

[۱] شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، مناجات۔

[۲] قرآن مجید، سورہ النساء، آیت ۱۷۵۔

[۳] راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، مادہ ب ر ک۔

بسا اوقات ایک شخص کے پاس بے تحاشا مال ہوتا ہے لیکن اس میں برکت نہیں ہوتی، وہ مال اسے بیماری اور پریشانی کے سوا کچھ نہیں دیتا۔ جبکہ ایک غریب کے تھوڑے سے رزق میں اتنی برکت ہوتی ہے کہ اس کا گھرانہ سکون سے سوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی برکات آسمان اور زمین کے ہر پہلو کو محیط ہیں۔ قرآنِ مجید تقویٰ اور ایمان کو ان برکات کے نزول کی بنیادی شرط قرار دیتا ہے: ﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ﴾ "اور اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے، تو ہم یقیناً ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں (کے دروازے) کھول دیتے"[1]۔

روزہ انسان کے اندر اسی تقویٰ کی آبیاری کرتا ہے، اور اس فقرے کے ذریعے ہم عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ! میری عمر، میرے رزق، میرے علم اور میری عبادات پر اپنی برکتوں کا نزول فرما تاکہ ان کا فائدہ میری دنیا اور آخرت دونوں کو سنوار دے۔

۳. وَوَفِّقْنِي فِيهِ لِمُوجِبَاتِ مَرْضَاتِكَ

اسبابِ رضا کی توفیق اور بندگی کا شعور

تیسرا فقرہ انسان کے ان اعمال کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو براہِ راست اللہ کی خوشنودی کا سبب بنتے ہیں: "اور مجھے اس میں اپنی رضا (خوشنودی) کے اسباب کی توفیق دے"۔ "مُوجِبَات" ان اعمال اور اسباب کو کہا جاتا ہے جن کو انجام دینے سے کوئی نتیجہ حتمی اور واجب ہو جائے (یعنی جو یقینی

---

[1] قرآن مجید، سورہ الاعراف، آیت ۹۶۔

طور پر رضا کا باعث بنیں)۔ انسان اپنی ناقص عقل سے یہ نہیں جان سکتا کہ کون سا عمل اللہ کی رضا کو اپنی جانب کھینچ لاتا ہے۔ کبھی ایک چھوٹا سا عمل (جیسے راستے سے پتھر ہٹانا یا کسی پیاسے جانور کو پانی پلانا) اللہ کو اتنا پسند آجاتا ہے کہ وہ انسان کی مغفرت فرما دیتا ہے، اور کبھی ایک بڑی عبادت غرور کی وجہ سے رد ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہم اللہ سے "توفیق" مانگتے ہیں کہ اے رب! میرے دل کو ان کاموں کی طرف مائل کر دے جو تجھے سب سے زیادہ پسند ہیں۔ امام زین العابدینؑ دعائے مکارم الاخلاق میں اللہ سے اسی توفیق کو مانگتے ہوئے فرماتے ہیں: «وَأَنْطِقْنِي بِالْهُدَى، وَأَلْهِمْنِي التَّقْوَى، وَوَفِّقْنِي لِلَّتِي هِيَ أَزْكَى، وَاسْتَعْمِلْنِي بِمَا هُوَ أَرْضَى» "اور میری زبان سے ہدایت کی باتیں جاری فرما، اور میرے دل میں تقویٰ کا الہام کر، اور مجھے اس عمل کی توفیق دے جو سب سے زیادہ پاکیزہ ہو، اور مجھ سے وہ کام لے جو تجھے سب سے زیادہ راضی کرنے والا (پسندیدہ) ہو"[1]۔

٤. وَأَسْكِنِّي فِيهِ بُحْبُوحَاتِ جَنَّاتِكَ، يَا مُجِيبَ دَعْوَةِ الْمُضْطَرِّينَ

مرکزِ جنت کی طلب اور حالتِ اضطرار

دعا کا اختتام ایک انتہائی بلند ہمت آرزو اور ایک رقت انگیز واسطے پر ہوتا ہے: "اور مجھے اس میں اپنی جنتوں کے مرکز (درمیان) میں سکونت عطا فرما، اے بے قراروں کی دعا قبول کرنے والے"۔

---

[1] علی ابن الحسین (علیہ السلام)، صحیفہ سجادیہ، دعا ۲۰۔

الف) بُحْبُوحَاتِ جَنَّاتِكَ **(جنتوں کا مرکز):** لفظ "بُحْبُوحَة" کا مطلب کسی بھی جگہ کا درمیانی، سب سے بہترین، وسیع اور اعلیٰ ترین حصہ ہوتا ہے[1]۔ مؤمن کی ہمت اتنی بلند ہوتی ہے کہ وہ جنت کے کنارے پر یا کسی ادنیٰ مقام پر رکنے پر راضی نہیں ہوتا، بلکہ وہ جنت کے بالکل قلب (مرکز) کا سوال کرتا ہے۔ احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں جنت کا یہ مرکز اور بحبوحہ کوئی اور مقام نہیں، بلکہ محمد و آلِ محمد علیہم السلام کی قربت اور ان کی ہمسائیگی کا مقام ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی مقام کی عظمت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: «مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَسْكُنَ بُحْبُوحَةَ الْجَنَّةِ فَلْيَتَوَلَّ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ» "جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ وہ جنت کے مرکز (بحبوحہ) میں سکونت اختیار کرے، تو اسے چاہیے کہ وہ علی ابن ابی طالب (علیہ السلام) کو اپنا ولی (سرپرست و رہبر) تسلیم کرے"[2]۔

ب) يَا مُجِيبَ دَعْوَةِ الْمُضْطَرِّينَ **(اے مضطرین کی پکار سننے والے):** جب انسان جنت کے مرکز کا سوال کرتا ہے، تو اسے اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کا احساس دبوچ لیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ میرا عمل تو اس لائق نہیں کہ میں ادنیٰ جنت میں بھی جا سکوں، تو پھر مرکزِ جنت کا سوال کیسے کروں؟ یہاں انسان ایک "مضطر" (انتہائی بے قرار، گھبرایا ہوا، اور ہر طرف سے مایوس شخص) بن کر اللہ کی بارگاہ میں گر جاتا ہے۔ "اضطرار" قبولیتِ دعا کی سب سے بڑی کنجی ہے۔ جب انسان کے دل سے دنیا کے تمام سہاروں کی امید کٹ جاتی ہے اور وہ جان لیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں، تو اس کی دعا سیدھی عرش تک جاتی ہے۔ قرآنِ مجید اللہ کی اس صفت کا اعلان ان الفاظ میں کرتا ہے:

---

[1] حسن مصطفوی، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، جلد ۱، صفحہ ۲۲۰۔
[2] شیخ صدوق، الآمالی، صفحہ ۵۶۔

﴿أَمَّن يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ﴾ "بھلا کون ہے جو بے قرار (مضطر) کی دعا کو قبول کرتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور وہ اس کی تکلیف کو دور کر دیتا ہے؟"[1]۔ اس مبارک دن میں، ہم بارگاہِ الٰہی میں اسی اضطرار کی کیفیت کے ساتھ حاضر ہیں کہ اے قاضی الحاجات، ہم بے بس ہیں، ہمارے پاس کوئی عمل نہیں جو ہم تجھے پیش کر سکیں، پس تو ہماری اس بے قراری پر رحم فرما اور ہمیں فضلِ الٰہی کے سائے میں بحبوحۂ جنت (قربِ اہلِ بیتؑ) کی ابدی سکونت عطا فرما۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے بائیسویں دن کی دعا درحقیقت اعمال پر عدمِ اعتماد، فضلِ خداوندی کی طلب اور بلند ہمتی کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

فضلِ الٰہی کے دروازے اور عدل سے پناہ: دعا کا آغاز 'فضل' کے دروازے کھولنے کی التجا سے ہوتا ہے۔ عرفان میں اللہ کے ساتھ معاملے کی دو بنیادیں ہیں: عدل (جیسا عمل ویسی جزا) اور فضل (عمل سے کہیں بڑھ کر عطا)۔ انسان کی عبادتیں اتنی ناقص ہیں کہ اگر اللہ عدل کرے تو کوئی نجات نہ پائے۔ امام زین العابدین علیہ السلام بھی اللہ سے عدل کے بجائے فضل کا معاملہ کرنے کی التجا کرتے تھے کیونکہ عدل ہلاکت کا باعث بن سکتا ہے۔ روزے دار ٹوٹے پھوٹے اعمال پر فضل کا پردہ مانگتا ہے۔ **برکتوں کا نزول اور نعمتوں میں ٹھہراؤ:** دعا کا دوسرا تقاضا برکتوں کے نزول کا ہے۔ نعمت ظاہری چیز ہے (جیسے مال)، مگر برکت وہ پوشیدہ کیفیت ہے جو اس مال کو باعثِ سکون بناتی ہے۔ بے برکت مال وبالِ جان

[1] قرآن مجید، سورہ النمل، آیت ۶۲۔

ہوتا ہے۔ قرآن کے مطابق تقویٰ برکتوں کے نزول کی شرط ہے۔ روزے دار التجا کرتا ہے کہ اس کی عمر، رزق اور عبادات میں وہ برکت ڈال دی جائے جو اس کے لیے دنیا اور آخرت میں نفع بخش ہو۔

اسبابِ رضا کی توفیق اور بندگی کا شعور: دعا کے تیسرے فقرے میں اللہ کی خوشنودی واجب کرنے والے اعمال (موجباتِ مرضات) کی توفیق مانگی گئی ہے۔ انسان نہیں جانتا کہ اس کا کون سا چھوٹا سا عمل (جیسے راستے سے پتھر ہٹانا) اللہ کو راضی کر دے، اور کون سی بڑی عبادت غرور کی وجہ سے رد ہو جائے۔ اس لیے ہم اللہ سے رہنمائی مانگتے ہیں کہ وہ ہمارے دل کو ان کاموں کی طرف موڑ دے جو اسے سب سے زیادہ پسند ہیں۔ **مرکزِ جنت کی طلب اور حالتِ اضطرار:** دعا کا اختتام 'بحبوحاتِ جنات' (جنت کے مرکز) کی طلب اور 'مضطرین' کی پکار پر ہوتا ہے۔ مؤمن کی ہمت اتنی بلند ہوتی ہے کہ وہ ادنیٰ جنت پر راضی نہیں ہوتا بلکہ جنت کے قلب کا سوال کرتا ہے، جو احادیث کے مطابق اہلِ بیت علیہم السلام کی ہمسائیگی کا مقام ہے۔ جب بندہ اپنے گناہوں کو دیکھ کر اس بلند مقام کے حصول سے مایوس ہونے لگتا ہے، تو وہ ایک 'مضطر' (بے قرار) بن کر اللہ کو پکارتا ہے۔ قرآن گواہ ہے کہ جب انسان دنیا کے تمام سہاروں سے کٹ کر خالصتاً اللہ کو پکارتا ہے، تو اللہ اس کی بے قراری پر رحم فرما کر اس کی ہر دعا قبول کر لیتا ہے۔

❖ رمضان المبارک کے بائیسویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ ہماری نجات ہمارے اعمال میں نہیں بلکہ اللہ کے فضل میں پوشیدہ ہے۔ جب انسان کامل اضطرار اور بے بسی کے ساتھ پروردگار کے فضل کا دامن تھام لیتا ہے، تو وہ اسے جنت کے سب سے اعلیٰ مقام پر فائز کر دیتا ہے۔

تیئیسویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ اغْسِلْنِي فِيهِ مِنَ الذُّنُوبِ، وَطَهِّرْنِي فِيهِ مِنَ الْعُيُوبِ، وَامْتَحِنْ قَلْبِي فِيهِ بِتَقْوَى الْقُلُوبِ، يَا مُقِيلَ عَثَرَاتِ الْمُذْنِبِينَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں گناہوں سے دھو دے،اور مجھے اس میں عیوب (باطنی برائیوں) سے پاک کر دے،اور اس میں میرے دل کا دلوں والے تقویٰ کے ذریعے امتحان لے (اسے آزما)،اے گنہگاروں کی لغزشوں کو معاف کرنے والے (اقالہ کرنے والے)۔

تیئیسواں دن: شبِ قدر کا حتمی فیصلہ اور قلب کا امتحان

ماہِ رمضان کا تیئیسواں دن اور اس سے متّصل رات (شبِ تیئیس رمضان)، مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام کی روایات کی روشنی میں، شبہائے قدر میں سب سے زیادہ عظمت اور فضیلت کی حامل ہے۔ یہ وہ فیصلہ کن اور لرزہ خیز رات ہے جس میں سال بھر کی تقدیر اور مقدرات کے فیصلوں پر حتمی مہر (دستخط) ثبت کی جاتی ہے۔ بندگی کا سفر جب اس قطعی موڑ پر پہنچتا ہے، تو روزے دار کی دعا انتہائی عمیق، دردمندانہ اور باطنی ہو جاتی ہے۔ اب وہ محض گناہوں پر پردہ ڈالنے (مغفرت) پر راضی نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنے وجود کو گناہوں کی غلاظت سے مکمل طور پر دھونے (غسل) اور روح کو ان باطنی بیماریوں (عیوب) سے پاک کرنے کی التجا کرتا ہے جو گناہوں کو جنم دیتی ہیں۔ یہ مناجات درحقیقت انسان کی باطنی جراحی کا ایک عظیم الشان نصاب ہے۔ اس دعا کا سب سے پُرجلال پہلو یہ ہے کہ سالک اپنے دعوائے ایمان کی سچائی ثابت کرنے کے لیے پروردگار سے تقویٰ کی بھٹی میں اپنے دل کا امتحان لینے کی درخواست کرتا ہے۔ جب انسان شبِ قدر کی اس عظیم ساعت میں گناہوں کے اقالے (سودے کی مکمل منسوخی) کی التجا کرتا ہے، تو وہ دراصل اپنے نامۂ اعمال کو ہر سیاہی سے پاک کر کے فرشتوں کے نزول اور اللہ کی حتمی رحمت کو سمیٹنے کے قابل بننے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے تیئیسویں دن کی دعا، جو کہ شبِ قدر کے حتمی فیصلوں کا وقت ہے، انسان کی مکمل ظاہری اور باطنی طہارت پر مرکوز ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ گناہوں کو دھونے

کے ساتھ ساتھ ان کو جنم دینے والے عیوب (حسد، تکبر) کا جڑ سے خاتمہ کرنا لازمی ہے۔ یہ دعا دراصل اللہ کی بارگاہ میں قلبِ سلیم (بے عیب دل) لے کر جانے، تقویٰ کی کسوٹی پر دل کا امتحان دینے، اور ندامت کے آنسوؤں کے ذریعے گناہوں کے برے سودے کو ہمیشہ کے لیے منسوخ (اقالہ) کروانے کا ایک عظیم روحانی لائحہ عمل ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **گناہوں کی غلاظت سے غسل:** گناہوں پر محض پردہ ڈالنے (مغفرت) کے بجائے، ان کی نجاست اور نحوست کو اشکِ ندامت کے ذریعے مکمل طور پر دھو ڈالنے (غسل) کی التجا۔
- **باطنی عیوب کی جراحی (طہارت):** ظاہری گناہوں کو دھونے کے بعد، ان گناہوں کی جڑ (عیوب جیسے تکبر، ریاکاری اور کینہ) کو روح سے کاٹ کر قلبِ سلیم حاصل کرنا۔
- **قلبی تقویٰ کی کسوٹی پر امتحان:** ظاہری وضع قطع کے بجائے، دل (جو اللہ کا حرم ہے) کو تقویٰ کی بھٹی میں تپا کر ایمان کے دعوے کی سچائی اور کھوٹ کو آزمانا۔
- **گناہوں کے سودے کا اقالہ:** شبِ قدر کی فیصلہ کن رات میں، مقدر کی کتاب بند ہونے سے قبل، نادانی میں شیطان کے ساتھ کیے گئے گناہوں کے سودے کو ندامت کی بنیاد پر مکمل منسوخ (اقالہ) کروانا۔

١. اَللّٰهُمَّ اغْسِلْنِي فِيهِ مِنَ الذُّنُوبِ

گناہوں سے غسل اور آنسوؤں کی طہارت

دعا کا پہلا فقرہ انسان کے ظاہری اور عملی کردار کی پاکیزگی سے متعلق ہے: "اے اللہ! مجھے اس مہینے میں گناہوں سے دھودے"۔

اس فقرے میں "اغْسِلْنِي" (مجھے دھودے) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مغفرت اور غسل میں ایک بہت لطیف فرق ہے۔ مغفرت کا مطلب ہے گناہ پر پردہ ڈال دینا، لیکن غسل کا مطلب ہے اس گناہ کی گندگی، اس کے اثرات اور اس کی نحوست کو وجود سے اس طرح دھوڈالنا کہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔

گناہ انسان کی روح پر ایک کثافت اور نجاست بن کر جم جاتے ہیں۔ اس نجاست کو دھونے کے لیے جس "پانی" کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مادی پانی نہیں، بلکہ ندامت کے آنسو ہیں۔ روزِ قیامت جب جہنم کی آگ بھڑک رہی ہوگی، تو دنیا کا کوئی پانی اسے بجھا نہیں سکے گا، سوائے اللہ کے خوف سے بہنے والے آنسوؤں کے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام اشکِ ندامت کی اس عظیم طاقت اور غسل کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «مَا مِنْ شَيْءٍ إِلَّا وَلَهُ كَيْلٌ وَوَزْنٌ إِلَّا الدُّمُوعَ، فَإِنَّ الْقَطْرَةَ تُطْفِئُ بِحَاراً مِنْ نَارٍ» "ہر چیز کا ایک ناپ اور ایک وزن مقرر ہے سوائے آنسوؤں کے؛ کیونکہ (اللہ کے خوف سے بہنے والے آنسو کا) ایک قطرہ آگ کے سمندروں کو بجھا دیتا ہے"[1]۔

---

[1] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۲، صفحہ ۴۸۱۔

تیئیسویں شب کی دہلیز پر، ہم التجا کرتے ہیں کہ یا رب! آج کی رات جب تو فرشتوں کے ذریعے مقدرات نازل کرے گا، تو میرا نامۂ اعمال گناہوں سے آلودہ ہے۔ پس اپنی رحمت اور میری اس پشیمانی کے صدقے، مجھے ان خطاؤں سے ایسا غسل دے کہ میں تیرے فرشتوں کے استقبال کے قابل ہو سکوں۔

۲. وَطَهِّرْنِي فِيهِ مِنَ الْعُيُوبِ

عیوب سے طہارت اور باطنی جراحی

دعا کا دوسرا تقاضا اعمال کی طہارت سے گزر کر روح کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے: "اور مجھے اس میں عیوب (باطنی برائیوں) سے پاک کر دے"۔

عرفان و اخلاق کی دنیا میں "ذُنُوب" (گناہ) اور "عُیُوب" (خامیاں/عیب) میں ایک واضح فرق ہے۔ گناہ وہ فعل ہے جو انسان کے ظاہری اعضاء سے سرزد ہوتا ہے (جیسے جھوٹ بولنا، چوری کرنا)، جبکہ عیب انسان کے باطن کی وہ بیماری اور صفت ہے جو گناہ کو جنم دیتی ہے (جیسے تکبر، حسد، ریاکاری، کینہ، اور بخل)۔

اگر انسان گناہوں کو دھو بھی لے لیکن اس کے اندر کا "عیب" موجود رہے، تو وہ دوبارہ گناہ کر بیٹھے گا۔ لہٰذا، جب تک درخت کی جڑ (عیب) کو نہ کاٹا جائے، اس کی شاخوں (گناہوں) کو کاٹنے کا کوئی مستقل فائدہ نہیں ہوتا۔ اللہ کی بارگاہ میں صرف وہی دل شرفِ قبولیت پاتا ہے جو ان تمام عیوب سے مکمل طور پر پاک (سلیم) ہو۔ قرآنِ مجید اسی باطنی طہارت کا حتمی فیصلہ یوں سناتا ہے: ﴿يَوْمَ لَا

يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۞ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ "اس دن نہ مال کوئی فائدہ دے گا اور نہ ہی اولاد، سوائے اس شخص کے جو اللہ کی بارگاہ میں قلبِ سلیم (ہر عیب سے پاک اور سالم دل) لے کر حاضر ہو"[1]۔

اس فقرے میں ہم عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ! روزے نے میرے جسم کو تو گناہوں سے روک دیا ہے، لیکن میرے اندر اب بھی نفسِ امارہ کے وہ عیوب چھپے ہیں جو میری روحانیت کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ پس تو اپنے فضل سے میرے باطن کی وہ روحانی جراحی (طہارت) فرما کہ میرے دل میں تیرے سوا کسی اور کا کھوٹ باقی نہ رہے۔

۳. وَامْتَحِنْ قَلْبِي فِيهِ بِتَقْوَى الْقُلُوبِ

قلب کا امتحان اور تقویٰ کی قرار گاہ

تیسرا فقرہ انسان کے دعوائے بندگی کی سچائی کو پرکھنے کا ایک کٹھن معیار ہے: "اور اس میں میرے دل کا دلوں والے تقویٰ کے ذریعے امتحان لے (اسے آزما)"۔

یہ دعا کا سب سے زیادہ پُر جلال اور عارفانہ حصہ ہے۔ لفظ "امْتَحِنْ" (امتحان لے) کا مطلب محض ٹیسٹ لینا نہیں ہے، بلکہ جس طرح سونے کو آگ میں تپا کر اس کا کھوٹ نکالا جاتا ہے اور اسے کندن بنایا جاتا ہے، اسے امتحان کہتے ہیں۔

---

[1] قرآن مجید، سورہ الشعراء، آیت ۸۸-۸۹۔

اور "تَقْوَى الْقُلُوب" سے کیا مراد ہے؟ تقویٰ صرف ظاہری لباس، وضع قطع یا عبادات کی کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کا اصل مرکز انسان کا دل ہے۔ قرآنِ مجید نے شعائرِ الٰہی کی تعظیم کو اسی قلبی تقویٰ کی علامت قرار دیا ہے: ﴿ذَٰلِكَ وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ "یہ (حکمِ خدا) ہے، اور جو شخص اللہ کی نشانیوں (شعائر) کی تعظیم کرتا ہے، تو یقیناً یہ دلوں کے تقویٰ کی دلیل ہے"[1]۔

جب دل میں تقویٰ آجاتا ہے تو وہ اللہ کا حرم بن جاتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام انسان کے دل کی اسی مرکزیت اور اس کی حفاظت کے متعلق فرماتے ہیں: «الْقَلْبُ حَرَمُ اللَّهِ، فَلَا تُسْكِنْ حَرَمَ اللَّهِ غَيْرَ اللَّهِ» "دل اللہ کا حرم (مقدس اور محفوظ گھر) ہے، پس اللہ کے اس حرم میں اللہ کے سوا کسی اور کو رہائش نہ دو"[2]۔

روزے دار اللہ سے التجا کر رہا ہے کہ اے خالق! میرے دل کو آزمائش کی بھٹی سے گزار تاکہ میرے دعوائے ایمان کا کھوٹ نکل جائے اور یہ ثابت ہو جائے کہ میرے دل میں تیرے خوف، تیری محبت اور تیری رضا (یعنی تقویٰ) کے سوا کچھ باقی نہیں بچا۔

٤. يَا مُقِيلَ عَثَرَاتِ الْمُذْنِبِينَ

---

[1] قرآن مجید، سورہ الحج، آیت ۳۲۔
[2] محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، جلد ٦٧، صفحہ ٢٥۔

اقالہ کی التجاء اور خطاؤں کی منسوخی

دعا کا اختتام انسان کی اس آخری اور سب سے بڑی امید پر ہوتا ہے جو شبِ قدر کے فیصلوں میں اسے مایوسی سے بچاتی ہے: "اے گنہگاروں کی لغزشوں کو معاف کرنے والے (اقالہ کرنے والے)"۔ جیسا کہ ہم چودہویں دن کی دعا میں "أَقِلْنِي" کے مفہوم میں بیان کر چکے ہیں کہ اقالہ کا مطلب محض معاف کرنا نہیں ہے، بلکہ کیے گئے برے سودے (گناہ) کو مکمل طور پر منسوخ کر دینا ہے کہ گویا وہ کبھی وقوع پذیر ہی نہ ہوا ہو۔ شبِ تیئیس رمضان، جس میں مقدر کی کتاب بند ہونے والی ہے، انسان جانتا ہے کہ اگر اس کے نامۂ اعمال میں اس کے گناہوں اور لغزشوں کی سیاہی باقی رہ گئی، تو اس کی پوری آنے والی زندگی اور آخرت برباد ہو جائے گی۔ اس لیے وہ گریہ و زاری کرتے ہوئے پروردگار کی صفتِ اقالہ کو پکارتا ہے۔ وہ عرض کرتا ہے کہ اے لغزشوں کو مٹانے والے! میں نے اپنے نفس کے ہاتھوں مجبور ہو کر شیطان کے ساتھ گناہ کا جو خسارے والا سودا کیا تھا، آج کی اس عظیم رات میں، اپنے فضل اور اپنے محبوبین (محمد و آلِ محمد علیہم السلام) کے صدقے میں، میرے اس بدترین سودے کو منسوخ فرما دے، تاکہ میں کل صبح کا آغاز ایک پاکیزہ، روشن اور بے عیب دل کے ساتھ کر سکوں۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے تیئیسویں دن کی دعا درحقیقت حتمی طہارت، تزکیۂ نفس اور شبِ قدر کی تجلیات سمیٹنے کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

- **گناہوں سے غسل اور اشکِ ندامت:** دعا کا آغاز گناہوں کو دھونے (اغسلنی) کی التجا سے

ہوتا ہے۔ مغفرت کا مطلب گناہ چھپانا ہے، جبکہ غسل کا مطلب اس کی گندگی کو وجود سے اس طرح مٹانا ہے کہ کوئی نشان نہ رہے۔ گناہ روح پر کثافت بن کر جم جاتے ہیں، جنہیں دھونے کے لیے مادی پانی نہیں بلکہ ندامت کے آنسو درکار ہیں۔ امام صادق علیہ السلام کے فرمان کے مطابق، خوفِ خدا سے بہنے والے آنسو کا ایک قطرہ جہنم کی آگ کے سمندروں کو بجھا دیتا ہے۔ انسان التجا کرتا ہے کہ تقدیر کے فیصلوں سے قبل اسے ان خطاؤں سے ایسا غسل دیا جائے کہ وہ فرشتوں کے استقبال کے قابل ہو سکے۔

- **عیوب سے طہارت اور قلبِ سلیم کی طلب:** دعا کے دوسرے فقرے میں 'عیوب' سے پاکیزگی مانگی گئی ہے۔ گناہ (ذنوب) ظاہری فعل ہے، جبکہ عیب (تکبر، حسد) وہ باطنی بیماری ہے جو گناہ کو جنم دیتی ہے۔ اگر گناہ دھو لیے جائیں مگر عیب باقی رہے تو انسان پھر گناہ کرے گا۔ درخت کی شاخوں کے بجائے جڑ کاٹنا ضروری ہے۔ قرآن کے مطابق روزِ قیامت صرف 'قلبِ سلیم' (بے عیب دل) ہی فائدہ دے گا۔ یہ فقرہ روح کی اس جراحی کی پکار ہے جو دل سے خدا کے سوا ہر کھوٹ نکال دے۔

- **تقویٰ کی بھٹی میں دل کا امتحان:** دعا کا تیسرا اور نہایت پُرجلال حصہ دل کے امتحان (امتحن قلبی) پر مبنی ہے۔ امتحان محض ٹیسٹ نہیں، بلکہ سونے کو آگ میں تپا کر کندن بنانا ہے۔ تقویٰ کا اصل مرکز دل ہے۔ امام صادق علیہ السلام کے مطابق دل اللہ کا حرم ہے، اس میں کسی اور کو نہ بساؤ۔ روزے دار اللہ سے کہتا ہے کہ میرے دعوائے بندگی کو تقویٰ کی کسوٹی پر پرکھ تاکہ ثابت ہو جائے کہ میرے دل میں تیری محبت اور خوف کے سوا کچھ نہیں۔

- **صفتِ اقالہ اور خطاؤں کی منسوخی:** دعا کا اختتام اللہ کو 'مقیل العثرات' (لغزشوں کا اقالہ

کرنے والے) پکارنے پر ہوتا ہے۔ اقالہ کا مطلب کیے گئے برے سودے کو پچھتاوے پر مکمل منسوخ کر دینا ہے۔ تیئیسویں شب، جب سال بھر کے مقدر پر حتمی دستخط ہوتے ہیں، بندہ گریہ کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ اے رب! میں نے شیطان کے ساتھ جو گناہ کا خسارے والا سودا کیا تھا، آج کی رات اپنے فضل سے اس سودے کو منسوخ فرما دے تاکہ میرا نامۂ اعمال تباہی سے بچ جائے۔

❖ رمضان المبارک کے تیئیسویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ شبِ قدر کی حتمی تجلیات اسی وقت حاصل ہوتی ہیں جب انسان گناہوں کی نجاست اور باطنی عیوب کی جڑ کاٹ کر، تقویٰ کی کسوٹی پر پورا اترے اور سچے دل سے پروردگار کی صفتِ اقالہ کا دامن تھام لے۔

چوبیسویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ فِيهِ مَا يُرْضِيكَ، وَأَعُوذُ بِكَ مِمَّا يُؤْذِيكَ، وَأَسْأَلُكَ التَّوْفِيقَ فِيهِ لِأَنْ أُطِيعَكَ وَلَا أَعْصِيَكَ، يَا جَوَادَ السَّائِلِينَ﴾

اے اللہ! میں اس مہینے میں تجھ سے اس چیز کا سوال کرتا ہوں جو تجھے راضی کرے، اور میں اس چیز سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو تجھے ناراض (اذیت) کرے، اور میں اس میں تجھ سے اس بات کی توفیق مانگتا ہوں کہ میں تیری اطاعت کروں اور تیری نافرمانی نہ کروں، اے مانگنے والوں کو بہت زیادہ عطا کرنے والے (جواد)۔

چوبیسواں دن: بندگی کی معراج، رضائے الٰہی کی جستجو

ماہِ رمضان المبارک جب اپنے آخری اور فیصلہ کن ایام میں داخل ہوتا ہے، تو روزے دار کا روحانی ارتقاء ایک نئی اور انتہائی باشعور منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ چوبیسویں دن تک پہنچتے پہنچتے انسان کا دل دنیا کی عارضی طلبوں، حتیٰ کہ جنت کی لالچ اور جہنم کے خوف سے بھی بے نیاز ہو کر صرف اور صرف ایک ہی محور پر مرکوز ہو جاتا ہے، اور وہ ہے 'خالق کی خوشنودی' (رضائے الٰہی)۔ یہ دعا درحقیقت بندگی کے اس اعلیٰ ترین درجے (آزاد اور باشعور انسانوں کی بندگی) کی التجا ہے، جہاں انسان محض اس لیے اطاعت کرتا ہے کہ اللہ عبادت کے لائق ہے۔ اس مناجات کا ایک انتہائی نازک اور کلامی پہلو پروردگار کی ذات کو 'اذیت' (ناراضگی) پہنچانے والے اعمال سے پناہ مانگنا ہے۔ یہ بیان ہمیں اس عقیدے سے آشنا کرتا ہے کہ اللہ تو ہر ضعف سے پاک ہے، لہٰذا اسے اذیت دینے کا مطلب اس کے احکامات کی ہتک کرنا یا اس کے سب سے محبوب اور مقرب بندوں (انبیاء اور اہلِ بیت ع) کو تکلیف پہنچانا ہے، جو کہ براہِ راست اللہ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ اس دعا کا لبِ لباب یہ ہے کہ جب سالک اللہ کی بارگاہ میں اپنے ناقص ارادے کی اصلاح کے لیے توفیق مانگتا ہے، تو وہ جانتا ہے کہ اس کا عمل ان عظیم منزلوں (کامل اطاعت اور ترکِ معصیت) کو پانے کے لائق نہیں، لہٰذا وہ ایک سائل بن کر پروردگار کی اس شانِ کریمی (جوادیت) کا دامن تھامتا ہے جو مانگنے والوں کو ان کی اوقات کے بجائے اپنی وسعت کے مطابق عطا کرتی ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے چوبیسویں دن کی دعا انسان کو عبادات کی ظاہری لالچ یا خوف سے نکال کر خالص محبت اور رضائے الٰہی کے اعلیٰ ترین مقام پر لے آتی ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ کائنات کی سب سے بڑی نعمت اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے، اور سب سے بڑی ہلاکت ان اعمال اور عقائد سے جڑنا ہے جو اللہ اور اس کے محبوبین کی اذیت (ناراضگی) کا باعث بنیں۔ یہ دعا دراصل کامل اطاعت اور ترکِ نافرمانی کے لیے اللہ کی توفیق اور اس کی بے پناہ سخاوت (جود) پر انحصار کرنے کا ایک عظیم روحانی لائحہ عمل ہے۔

دعا کے اہم نکات

رضائے الٰہی کی خالص جستجو: جنت کی طلب سے بلند ہو کر، بندگی کی معراج کے طور پر صرف اور صرف ان اعمال کا سوال کرنا جو اللہ کی خوشنودی (مرضات) کا باعث بنتے ہیں۔ **اسبابِ اذیت (ناراضگی) سے پناہ:** ہر اس گناہ، ظلم، اور عقیدے سے محفوظ رہنے کی التجا، جس کے ذریعے اللہ کے احکامات کی ہتک ہو یا اس کے مقربین (رسول اور اہلِ بیت ع) کو تکلیف پہنچے، کیونکہ ان کی اذیت دراصل اللہ کی اذیت ہے۔ **اطاعت اور ترکِ معصیت کی توفیق:** اپنے آزاد مگر کمزور ارادے پر بھروسہ کرنے کے بجائے، اللہ کی اطاعت کرنے اور گناہوں سے مکمل طور پر بچنے کے لیے اسی کی غیبی مدد اور اسباب (توفیق) کو طلب کرنا۔ **جوادِ سائلین پر کامل انحصار:** رضائے الٰہی جیسی عظیم نعمت کو اپنے اعمال کی قیمت پر پانے کی بجائے، اللہ کی صفتِ 'جواد' (وہ سخاوت جو بن مانگے اور استحقاق سے بڑھ کر عطا کرے) کو اپنا وسیلہ بنانا۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

١. اَللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ فِيهِ مَا يُرْضِيكَ

رضائے الٰہی کی جستجو اور بندگی کی معراج

دعا کا پہلا فقرہ انسان کے مطالبات کی آخری اور بلند ترین منزل ہے: "اے اللہ! میں اس مہینے میں تجھ سے اس چیز کا سوال کرتا ہوں جو تجھے راضی کرے"۔

انسان کی بندگی کے تین درجات ہیں۔ کچھ لوگ دوزخ کے ڈر سے عبادت کرتے ہیں (یہ غلاموں کی بندگی ہے)، کچھ جنت کی لالچ میں عبادت کرتے ہیں (یہ تاجروں کی بندگی ہے)، اور کچھ لوگ صرف اس لیے عبادت کرتے ہیں کہ اللہ عبادت کے لائق ہے اور وہ اس کی رضا چاہتے ہیں (یہ آزاد اور باشعور انسانوں کی بندگی ہے)۔ جب بندہ اللہ سے "مَا يُرْضِيكَ" (جو تجھے راضی کرے) مانگتا ہے، تو وہ دراصل جنت سے بھی بڑی نعمت کا سوال کر رہا ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید نے جنت کی تمام تر مادی اور روحانی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد اعلان کیا ہے کہ اللہ کی رضا ان سب سے عظیم تر ہے: ﴿وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ... وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ "اللہ نے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں سے ایسی جنتوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں... اور

اللہ کی رضا (خوشنودی) ان سب سے بڑی (نعمت) ہے۔ یہی تو سب سے بڑی کامیابی ہے"[۱]۔

اس فقرے میں ہم اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ یا رب! ہمیں وہ بصیرت عطا فرما جس سے ہم پہچان سکیں کہ تیری رضا کن اعمال میں پوشیدہ ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام رضائے الٰہی کے حصول کا حتمی راستہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں: «رِضَى اللَّهِ سُبْحَانَهُ مَقْرُونٌ بِطَاعَتِهِ» "اللہ سبحانہ کی رضا اور خوشنودی اس کی مکمل اطاعت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے"[۲]۔

پس ہم دعا کرتے ہیں کہ اے خالق! میرے ارادوں کو اپنی رضا کے اس قدر تابع کر دے کہ میری مرضی تیری مرضی کے سانچے میں ڈھل جائے۔

۲. وَأَعُوذُ بِكَ مِمَّا يُؤْذِيكَ

اذیتِ پروردگار کا مفہوم اور اسبابِ غضب سے پناہ

دعا کا دوسرا تقاضا ایک انتہائی نازک عقائدی نکتے پر مبنی ہے: "اور میں اس چیز سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو تجھے ناراض (اذیت) کرے"۔

یہاں ایک بہت بڑا کلامی اور فلسفیانہ سوال پیدا ہوتا ہے: کیا اللہ تعالیٰ کو کوئی چیز "اذیت" (تکلیف یا دکھ) پہنچا سکتی ہے؟ پروردگار تو ہر قسم کے ضعف، نقص، اور درد سے پاک (منزّہ) ہے۔ وہ تو غنیِ مطلق ہے۔ پھر "مِمَّا يُؤْذِيكَ" کا کیا مطلب ہے؟

---

[۱] قرآن مجید، سورہ التوبہ، آیت ۷۲۔

[۲] عبد الواحد آمدی، غرر الحکم و درر الکلم، صفحہ ۳۴۴۔

علمِ عقائد کی روشنی میں، اللہ کو اذیت دینے کا مطلب اس کی ذات کو نقصان پہنچانا نہیں (جو کہ ناممکن ہے)، بلکہ اس سے مراد ان اعمال کا ارتکاب ہے جو اللہ کی نافرمانی پر مبنی ہوں، جو اس کے دین کی ہتک کا باعث بنیں، یا جو اللہ کے محبوب ترین بندوں (انبیاء اور اولیاء) کو تکلیف پہنچائیں۔ جب کوئی شخص اللہ کے نمائندوں کو دکھ دیتا ہے، تو اللہ اسے اپنی اذیت قرار دیتا ہے۔

قرآنِ مجید اس حقیقت کو ان واضح الفاظ میں بیان فرماتا ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا﴾ "یقیناً جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں، اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی ہے اور ان کے لیے رسواکن عذاب تیار کر رکھا ہے"[1]۔

مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام کے خالص منابع میں اس اذیت کی ایک سب سے نمایاں اور تاریخی مثال خاتونِ جنت سیدہ فاطمہ زہرا علیہا السلام کی ذاتِ مبارکہ ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حتمی اصول بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: «فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّي، فَمَنْ آذَاهَا فَقَدْ آذَانِي، وَمَنْ آذَانِي فَقَدْ آذَى اللَّهَ» "فاطمہ میرا کل سرمایہ ہے، پس جس نے اسے اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی، اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے (در حقیقت) اللہ کو اذیت دی"[2]۔

اس فقرے کے ذریعے روزے دار اللہ کی بارگاہ میں التجا کرتا ہے کہ یارب! مجھے ہر اس گناہ، ظلم، اور عقیدے سے اپنی پناہ میں رکھ جو تیری یا تیرے مقربین کی ناراضگی (اذیت) کا سبب بنے،

---

[1] قرآن مجید، سورہ الاحزاب، آیت ۵۷۔

[2] شیخ صدوق، علل الشرائع، جلد ۱، صفحہ ۱۸۶۔

کیونکہ میں اس غضب کو سہنے کی ذرہ برابر طاقت نہیں رکھتا۔

۳. وَأَسْأَلُكَ التَّوْفِيقَ فِيهِ لِأَنْ أُطِيعَكَ وَلَا أَعْصِيَكَ

توفیقِ الٰہی کی طلب اور ترکِ معصیت

تیسرا فقرہ انسان کے ارادے اور عمل کی درستی کے لیے اللہ کی توفیق کی مانگ ہے: "اور میں اس میں تجھ سے اس بات کی توفیق مانگتا ہوں کہ میں تیری اطاعت کروں اور تیری نافرمانی نہ کروں"۔

جیسا کہ ہم گزشتہ دعاؤں میں بھی ذکر کر چکے ہیں کہ "توفیق" اسباب کے ساز گار ہونے کا نام ہے۔ انسان کا ارادہ اگرچہ آزاد ہے، لیکن وہ نفسِ امارہ اور شیطان کے شدید دباؤ میں رہتا ہے۔ جب تک اللہ کی غیبی مدد اور توفیق شاملِ حال نہ ہو، کامل اطاعت ممکن نہیں اور گناہوں (معصیت) سے بچنا انتہائی دشوار ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے اسی توفیقِ الٰہی کا اعلان ان الفاظ میں کیا تھا: ﴿وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ﴾ "اور میری توفیق صرف اللہ ہی کی مدد سے ہے، میں نے اسی پر توکل کیا ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں"[1]۔

امام محمد تقی الجواد علیہ السلام ایک سچے مؤمن کی کامیابی کے لیے جن تین بنیادی خصلتوں کو ضروری قرار دیتے ہیں، ان میں سب سے پہلی شرط یہی توفیق ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں: «الْمُؤْمِنُ يَحْتَاجُ إِلَى ثَلَاثِ خِصَالٍ: تَوْفِيقٍ مِنَ اللَّهِ، وَوَاعِظٍ مِنْ نَفْسِهِ، وَقَبُولٍ مِمَّنْ

[1] قرآن مجید، سورہ ہود، آیت ۸۸۔

يَنْصَحُهُ» "مؤمن تین خصلتوں کا محتاج ہے: (پہلی) اللہ کی طرف سے ملنے والی توفیق، (دوسری) اس کے اپنے نفس کے اندر سے نصیحت کرنے والا ضمیر، اور (تیسری) جو اسے نصیحت کرے اس کی بات کو قبول کرنا"[1]۔

چوبیسویں دن ہم اللہ سے یہی التجا کرتے ہیں کہ ہمارے وجود پر ایسا الٰہی تصرف قائم فرمادے کہ اطاعت ہماری فطرت بن جائے اور نافرمانی (معصیت) سے ہمارے دل کو ہمیشہ کے لیے وحشت ہونے لگے۔

٤. يَا جَوَادَ السَّائِلِينَ

جودِ الٰہی کا واسطہ اور سائل کی پکار

دعا کا اختتام ذاتِ الٰہی کی ایک انتہائی عظیم اور وسیع صفت کے واسطے پر ہوتا ہے: "اے مانگنے والوں کو بہت زیادہ عطا کرنے والے (جواد)"۔

لفظ "جَوَاد" سخاوت کی اس حد کو کہا جاتا ہے جہاں عطا کرنے والا یہ نہ دیکھے کہ مانگنے والا اس لائق ہے یا نہیں۔ وہ بس اپنے کرم اور اپنے وجود کی وسعت کی بنیاد پر عطا کرتا چلا جاتا ہے۔ سائل (مانگنے والا) جب خدا کی بارگاہ میں رضائے الٰہی جیسی عظیم نعمت اور کامل اطاعت جیسی منزل کا سوال کرتا ہے، تو وہ جانتا ہے کہ اس کی اپنی اوقات اس قابل نہیں کہ وہ ان عظیم الشان مقامات کو اپنے اعمال کی قیمت پر خرید سکے۔

---

[1] حسن بن علی ابن شعبہ حرانی، تحف العقول، صفحہ ۴۵۷۔

یہاں آکر انسان کی عاجزی پکار اٹھتی ہے کہ اے اللہ! میری جھولی چھوٹی ہے، میرا عمل ناقص ہے، لیکن تو "جواد السائلین" ہے، تو مانگنے والوں کو ان کی استطاعت سے نہیں بلکہ اپنی شانِ کریمی سے نواز تا ہے۔ پس اپنے اسی جودوکرم کے طفیل میری اس دعا کو قبول فرما اور مجھے اپنی دائمی رضا کی خلعت پہنا دے۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے چوبیسویں دن کی دعا درحقیقت خالص بندگی، عقائد کی درستگی اور توفیقِ الٰہی کی طلب کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

رضائے الٰہی کی جستجو اور بندگی کی معراج: دعا کا آغاز 'ما یرضیک' (وہ چیز جو تجھے راضی کرے) مانگنے سے ہوتا ہے۔ بندگی کے تین درجے ہیں: خوف (غلاموں کی بندگی)، لالچ (تاجروں کی بندگی)، اور محبت (آزاد انسانوں کی بندگی)۔ یہ فقرہ اسی تیسرے اور بلند ترین درجے کی پکار ہے۔ قرآن کے مطابق جنت کی تمام نعمتوں سے بڑی نعمت 'رضوان من اللہ' (اللہ کی رضا) ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام کے فرمان کی روشنی میں، یہ رضا مکمل اطاعت سے جڑی ہے۔ ہم التجا کرتے ہیں کہ یا رب، ہمارے ارادوں کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال دے۔ **اذیتِ پروردگار کا مفہوم اور اسبابِ غضب سے پناہ:** دعا کا دوسرا اور نازک تقاضا اللہ کو 'اذیت' (ناراض) کرنے والی چیزوں سے پناہ ہے۔ اللہ تو ہر دکھ سے پاک (منزہ) ہے۔ علمِ عقائد کی رو سے، اللہ کو اذیت دینے کا مطلب اس کے دین کی ہتک کرنا یا اس کے مقربین کو تکلیف پہنچانا ہے۔ قرآن نے اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دینے والوں پر لعنت کی ہے۔ مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام میں اس کی نمایاں مثال سیدہ فاطمہ علیہا السلام کی ذات ہے، جن کی اذیت کو

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اور خدا کی اذیت قرار دیا۔ روزے دار ان تمام گناہوں اور عقائد سے پناہ مانگتا ہے جو اس الٰہی ناراضگی کا سبب بنیں۔ **توفیقِ الٰہی کی طلب اور ترکِ معصیت:** دعا کے تیسرے فقرے میں کامل اطاعت اور نافرمانی (معصیت) سے بچنے کے لیے 'توفیق' مانگی گئی ہے۔ انسان کا ارادہ نفسِ امارہ کے دباؤ میں رہتا ہے۔ جب تک غیبی مدد شامل نہ ہو، گناہوں سے بچنا ناممکن ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی قرآنی اعلان کے مطابق اپنی ہر کامیابی کو اللہ کی توفیق سے جوڑا تھا۔ امام محمد تقی علیہ السلام کے مطابق مؤمن کی پہلی ضرورت ہی اللہ کی توفیق ہے۔ ہم التجا کرتے ہیں کہ گناہ سے ہمیں وحشت ہو اور اطاعت ہماری فطرت بن جائے۔ **جودِ الٰہی کا واسطہ اور سائل کی پکار:** دعا کا اختتام اللہ کو 'جواد السائلین' (مانگنے والوں کو بہت زیادہ عطا کرنے والے) پکارنے پر ہوتا ہے۔ 'جواد' اس سخی کو کہتے ہیں جو مانگنے والے کا استحقاق اور اہلیت نہ دیکھے بلکہ اپنی وسعت کے مطابق عطا کرے۔ بندہ جانتا ہے کہ اس کا عمل اتنا ناقص ہے کہ وہ 'رضائے الٰہی' اور 'کامل اطاعت' جیسے عظیم مقامات نہیں پا سکتا۔ اس لیے وہ ایک عاجز سائل کی طرح اللہ کی جود و سخا کا دامن تھام کر عرض کرتا ہے کہ اے رب، اپنی شانِ کریمی کے صدقے مجھے اپنی دائمی رضا کی خلعت پہنا دے۔

- ❖ رمضان المبارک کے چوبیسویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ بندگی کی معراج محض جنت کا حصول نہیں، بلکہ اللہ کی وہ رضا ہے جو کامل اطاعت اور اس کے مقربین کی محبت سے جڑی ہے۔ اور اس کٹھن منزل تک پہنچنے کے لیے انسان کے پاس واحد سہارا اس ذات کی 'توفیق' اور اس کا بے پناہ 'جود' ہے۔

پچیسویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ اجْعَلْنِي فِيهِ مُحِبّاً لِأَوْلِيَائِكَ، وَمُعَادِياً لِأَعْدَائِكَ، مُسْتَنّاً بِسُنَّةِ خَاتَمِ أَنْبِيَائِكَ، يَا عَاصِمَ قُلُوبِ النَّبِيِّينَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں اپنے دوستوں (اولیاء) سے محبت کرنے والا، اور اپنے دشمنوں سے دشمنی رکھنے والا، اور اپنے آخری نبی ﷺ کی سنت پر چلنے والا قرار دے، اے نبیوں کے دلوں کو (گناہوں سے) بچانے والے۔

پچیسواں دن: محورِ ایمان، انتخابِ حق اور عملی پیروی

ماہِ رمضان کا پچیسواں دن بندگی کے اس عظیم اور فیصلہ کن مقام کی جانب رہنمائی کرتا ہے جہاں ایمان محض ایک انفرادی فعل یا مجرد عقیدہ نہیں رہتا، بلکہ وہ "تولا" (اللہ کے دوستوں سے محبت) اور "تبرا" (اللہ کے دشمنوں سے بیزاری) کی دو واضح، قطعی اور ناقابلِ تفریق بنیادوں پر استوار ہو جاتا ہے۔ انسان جب تک حق کو پہچان کر اس سے والہانہ محبت نہ کرے اور باطل کے مکروہ چہرے کو پہچان کر اس سے شدید نفرت نہ کرے، اس کا ایمان کبھی کامل نہیں ہو سکتا۔ یہ دعا درحقیقت دین کے اسی باطنی اور ظاہری محور کے گرد گھومتی ہے جس میں دل کی محبت، عمل کی پیروی اور قلبی طہارت کا ایک انتہائی جامع نصاب موجود ہے۔ یہ دن ہمیں سکھاتا ہے کہ دل کے ایک ہی برتن میں روشنی اور تاریکی، یا حق اور باطل کی محبت ہرگز جمع نہیں ہو سکتی۔ جس طرح اللہ سے محبت کا لازمی تقاضا اس کے مقربین اور اولیاء سے محبت ہے، بعینہٖ اسی طرح اللہ کے دشمنوں سے دلی اور عملی بیزاری بھی ایمان کی بقا کے لیے شرط ہے۔ مزید برآں، یہ بیان اس غلط فہمی کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے کہ محض زبانی عقیدت نجات کے لیے کافی ہے؛ بلکہ یہ واضح کرتا ہے کہ سچی محبت کا واحد اور عملی ثبوت خاتم الانبیاء ﷺ کی سنت اور شریعت کی مکمل پیروی ہے۔ جب انسان ان کٹھن منازل کو طے کرنے کا ارادہ کرتا ہے، تو وہ جانتا ہے کہ نفس اور شیطان کے فتنوں سے بچنا آسان نہیں، لہٰذا وہ اس پروردگار کا دامن تھامتا ہے جو نبیوں کے دلوں کو گناہوں کی آلودگی سے معصوم اور محفوظ رکھنے والا (عاصم) ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے پچیسویں دن کی دعا ایمان کے دو عظیم ستونوں، یعنی 'تولا' (حق سے محبت) اور 'تبرا' (باطل سے بیزاری)، کے گرد گھومتی ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ دین کا خالص تصور اللہ کی خاطر محبت اور اسی کی خاطر دشمنی رکھنے کا نام ہے۔ یہ دعا محض جذباتی عقیدت کے بجائے، خاتم الانبیاء ﷺ کی سنت کی عملی پیروی کو محبت کا سچا ثبوت قرار دیتی ہے اور دلوں کو گمراہی سے بچانے کے لیے انبیاء کی عصمت کے محافظ (اللہ) کی پناہ مانگنے کا ایک مکمل روحانی لائحہ عمل ہے۔

دعا کے اہم نکات

اولیاء اللہ سے محبت (تولا): ایمان کی تکمیل کے لیے اللہ کے دوستوں اور مقربین (محمد و آلِ محمد ع) سے خالص قلبی محبت رکھنا، کیونکہ دین اللہ کی خاطر محبت کے سوا کچھ نہیں۔ **دشمنانِ خدا سے بیزاری (تبرا):** حق اور باطل کے تضاد کو سمجھتے ہوئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دشمنوں کے ظالمانہ افکار اور نظاموں سے مکمل اور عملی بیزاری کا اعلان کرنا۔ **سنتِ نبوی ﷺ کی عملی پیروی:** محبت کے زبانی دعوے کو اندھی عقیدت سے نکال کر، رسولِ خدا ﷺ کی سنت، شریعت اور احکامات کی عملی پیروی کے سانچے میں ڈھالنا۔ **عصمت کا سرچشمہ اور قلوب کی حفاظت:** حق و باطل کے اس کٹھن انتخاب میں قدم ڈگمگانے سے بچانے کے لیے، اللہ کی اس صفت (عاصم) کا واسطہ دینا جس سے وہ نبیوں کے دلوں کو شیطانی وسوسوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

١. اَللَّهُمَّ اجْعَلْنِي فِيهِ مُحِبّاً لِأَوْلِيَائِكَ

تولا کا فلسفہ اور اولیاء اللہ سے محبت

دعا کا پہلا فقرہ ایمان کی سب سے بنیادی اور شیریں شرط یعنی محبتِ اولیاء پر مبنی ہے: "اے اللہ! مجھے اس مہینے میں اپنے دوستوں (اولیاء) سے محبت کرنے والا قرار دے"۔

اسلامی عقائد میں "تولا" (دوست رکھنا) فروعِ دین کا ایک اہم ستون ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ جس ذات سے محبت کرتا ہے، لاشعوری طور پر اس کے دوستوں سے بھی محبت کرنے لگتا ہے۔ اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ وہ اللہ سے محبت کرتا ہے لیکن اللہ کے دوستوں (اولیاء) سے اسے کوئی انسیت نہیں، تو اس کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ قرآنِ مجید نے اس محبت کو دین کی بنیاد اور رسالت کا اجر قرار دیا ہے: ﴿قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ﴾ "کہہ دیجیے کہ میں تم سے اس (رسالت کی تبلیغ) پر کوئی اجر نہیں مانگتا سوائے (میرے) قرابت داروں کی محبت کے"[1]۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے دین کے خالص اور حقیقی تصور کو واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ایمان نام ہی اللہ کی خاطر محبت کرنے کا ہے: «هَلِ الدِّينُ إِلَّا الْحُبُّ وَالْبُغْضُ» "کیا دین (اللہ کی خاطر) محبت اور (اللہ کی خاطر) دشمنی کے سوا کچھ اور ہے؟"[2]۔

---

[1] قرآن مجید، سورہ الشوریٰ، آیت ۲۳۔

[2] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۲، صفحہ ۱۲۵۔

پچیسویں دن ہم التجا کرتے ہیں کہ یارب! ہمارے دل کو اپنے خالص اولیاء (جس کے کامل ترین مصداق محمد و آلِ محمد علیہم السلام ہیں) کی محبت سے اس قدر سرشار کر دے کہ ہماری ہر دھڑکن میں ان کی ولا اور دوستی کا رنگ بس جائے۔

۲. وَمُعَادِياً لِأَعْدَائِكَ

تبرا کی حقیقت، باطل سے بیزاری اور نور و ظلمت کا تضاد

دعا کا دوسرا تقاضا پہلے تقاضے (محبت) کی منطقی اور ناگزیر دلیل ہے: "اور اپنے دشمنوں سے دشمنی رکھنے والا (قرار دے)"۔

جس طرح روشنی اور اندھیرا ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، اسی طرح اللہ کے دوستوں کی محبت اور اللہ کے دشمنوں کی ہمدردی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتی۔ اسے "تبرا" (بیزاری اور دوری اختیار کرنا) کہا جاتا ہے۔ جو شخص یہ کہے کہ "میں حق کے ساتھ تو ہوں، لیکن باطل سے مجھے کوئی دشمنی نہیں"، وہ درحقیقت منافقت کا شکار ہے۔ قرآنِ مجید اس قلبی تضاد کی صریحاً نفی کرتا ہے: ﴿لَّا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ "آپ کبھی ایسی قوم نہیں پائیں گے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اور پھر بھی وہ ان لوگوں سے دوستی رکھے جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی رکھتے ہیں"[1]۔

دشمنانِ خدا سے دشمنی کا مطلب صرف زبانی نفرت نہیں ہے، بلکہ یہ ان کے ظالمانہ افکار، ان

---

[1] قرآن مجید، سورہ المجادلہ، آیت ۲۲۔

کے باطل نظام، اور ان کی ہر اس رِیت سے بیزاری کا نام ہے جو انسان کو شریعت سے دور کرتی ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اسی اٹل اصول کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «لَيْسَ بِمُؤْمِنٍ مَنْ لَمْ يُعَادِ فِي اللَّهِ وَلَمْ يُوَالِ فِي اللَّهِ» "وہ شخص مؤمن ہو ہی نہیں سکتا جو اللہ کی خاطر کسی سے دشمنی نہ رکھے اور اللہ کی خاطر کسی سے دوستی نہ رکھے"[1]۔

اس فقرے کے ذریعے ہم اللہ کی بارگاہ میں اپنا عقیدہ پیش کرتے ہیں کہ اے خالق! ہم ہر اس شخص اور نظام سے مکمل بیزاری اور دشمنی کا اعلان کرتے ہیں جس نے تیری نافرمانی کی اور تیرے مقربین پر ظلم ڈھائے۔

۳. مُسْتَنّاً بِسُنَّةِ خَاتَمِ أَنْبِيَائِكَ

سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی اور محبت کا عملی ثبوت

تیسرا فقرہ انسان کے جذبۂ محبت اور عقیدے کو عملی سانچے میں ڈھالتا ہے: "اور اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر چلنے والا قرار دے"۔

محبت صرف زبانی دعوے کا نام نہیں ہے۔ جو شخص کسی سے محبت کرتا ہے، وہ اس کے طور طریقوں، اس کی نشست و برخاست، اور اس کے احکامات (سنت) کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیتا ہے۔ اگر دل میں اولیاء اللہ کی محبت ہو لیکن عمل میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور شریعت کی پابندی نہ ہو، تو وہ

[1] ابن شہر آشوب، مناقب آل أبی طالب، جلد ۳، صفحہ ۲۰۶۔

محبت صرف ایک وہم ہے۔

قرآنِ مجید نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو انسان کی رہنمائی کے لیے ایک کامل ترین نمونہ (آئیڈیل) قرار دیا ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ "یقیناً تمہارے لیے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں ایک بہترین نمونۂ عمل موجود ہے"[1]۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے اس غلط فہمی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا کہ محض اہل بیت علیہم السلام کی زبانی محبت نجات کے لیے کافی ہے، اور عمل کی شرط کو واضح کرتے ہوئے فرمایا: «فَوَاللَّهِ مَا شِيعَتُنَا إِلَّا مَنِ اتَّقَى اللَّهَ وَأَطَاعَهُ... مَنْ كَانَ لِلَّهِ مُطِيعاً فَهُوَ لَنَا وَلِيٌّ، وَمَنْ كَانَ لِلَّهِ عَاصِياً فَهُوَ لَنَا عَدُوٌّ، وَمَا تُنَالُ وَلَايَتُنَا إِلَّا بِالْعَمَلِ وَالْوَرَعِ» "پس خدا کی قسم! ہمارے شیعہ (پیروکار) صرف وہی ہیں جو اللہ سے ڈریں اور اس کی اطاعت کریں... جو اللہ کا مطیع ہے وہی ہمارا دوست ہے، اور جو اللہ کا نافرمان ہے وہ ہمارا دشمن ہے۔ اور ہماری ولایت (دوستی) سوائے عمل اور تقویٰ (پرہیزگاری) کے کسی اور طرح حاصل نہیں کی جا سکتی"[2]۔

ہم اس دعا میں عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ! میری محبت کو اندھی عقیدت کے بجائے سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عملی اتباع کا مظہر بنا دے۔

---

[1] قرآن مجید، سورہ الاحزاب، آیت ۲۱۔
[2] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۲، صفحہ ۷۴۔

٤. يَا عَاصِمَ قُلُوبِ النَّبِيِّينَ

عصمت کا سرچشمہ اور قلوب کی حفاظت

دعا کا اختتام ذاتِ الٰہی کی اس عظیم صفت کے واسطے پر ہوتا ہے جو انسان کو گناہ کے اندھیروں سے بچاتی ہے: "اے نبیوں کے دلوں کو (گناہوں سے) بچانے والے"۔

"عَاصِم" کا مطلب ہے محفوظ رکھنے والا اور بچانے والا، اور اسی سے عقیدۂ "عصمت" ثابت ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام گناہ کیوں نہیں کرتے؟ اس لیے نہیں کہ وہ مجبور ہیں، بلکہ اس لیے کہ ان کے دلوں میں اللہ کی جلالت، معرفت اور حق کی ایسی روشن دلیلیں موجود ہوتی ہیں کہ وہ گناہ کو اس کے اصلی (غلیظ) روپ میں دیکھتے ہیں، اور اللہ ان کے دلوں کو شیطانی وسوسوں سے محفوظ (معصوم) رکھتا ہے۔

جب روزے دار اللہ سے اولیاء کی محبت، اعداء سے نفرت، اور سنت کی کامل پیروی کا سوال کرتا ہے، تو وہ جانتا ہے کہ یہ ایک انتہائی کٹھن اور نازک مرحلہ ہے۔ ذرا سی غفلت انسان کو حق کے راستے سے بھٹکا سکتی ہے۔ اس لیے وہ اللہ کو انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا واسطہ دے کر پکارتا ہے کہ اے خالق! جس طرح تو نے اپنے مقرب نبیوں کے دلوں کو شیطان کی دستبرد سے محفوظ (عاصم) رکھا ہے، اسی طرح میرے دل کو بھی ان فتنوں، گمراہیوں، اور باطل کی محبتوں سے اپنی پناہ میں رکھنا تاکہ میں روزِ قیامت سرخرو ہو کر تیرے دربار میں حاضر ہو سکوں۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے پچیسویں دن کی دعا در حقیقت دین کی روح، محبت کے تقاضوں اور قلب کی حفاظت کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

- **تولا کا فلسفہ اور اولیاء اللہ سے محبت:** دعا کا آغاز 'تولا' (اللہ کے دوستوں سے محبت) کی التجا سے ہوتا ہے۔ فروعِ دین میں تولا کا مطلب حق سے دوستی کرنا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جس سے محبت ہو، اس کے دوستوں سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ قرآنی نص کے مطابق، رسالت کا اجر ہی قرابت داروں (اہلِ بیت ع) کی محبت ہے۔ امام صادق علیہ السلام کے فرمان کے مطابق، دین کا لبِ لباب اللہ کی خاطر محبت اور دشمنی کے سوا کچھ نہیں۔ روزے دار التجا کرتا ہے کہ اس کی ہر دھڑکن اولیاء کی محبت سے سرشار ہو جائے۔

- **تبرا کی حقیقت اور باطل سے بیزاری:** دعا کا دوسرا تقاضا 'تبرا' (بیزاری) ہے۔ نور اور ظلمت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ جو شخص حق کا دعویٰ کرے مگر باطل سے بیزار نہ ہو، وہ منافق ہے۔ قرآن ایسی قوم کی نفی کرتا ہے جو خدا پر ایمان بھی رکھے اور اس کے دشمنوں سے دوستی بھی کرے۔ امیر المومنین علیہ السلام کی واضح تعلیم ہے کہ اللہ کی خاطر دشمنی اور دوستی کے بغیر ایمان نامکمل ہے۔ یہ فقرہ ہر اس باطل نظام اور شخص سے بیزاری کا اعلان ہے جو شریعت سے دور کرے۔

- **سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی اور محبت کا عملی ثبوت:** دعا کا تیسرا فقرہ عقیدے کو عمل سے جوڑتا ہے۔ محبت صرف زبانی دعوے کا نام نہیں، بلکہ محبوب کے احکامات (سنت) کو

اپنانے کا نام ہے۔ اگر دل میں اولیاء کی محبت ہو مگر عمل میں رسول ﷺ کی سنت نہ ہو، تو وہ محبت ایک وہم ہے۔ امام باقر علیہ السلام نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا کہ محض زبانی محبت کافی ہے؛ آپؑ نے فرمایا کہ اللہ کا مطیع ہی ہمارا دوست ہے اور ہماری ولایت تقویٰ اور عمل کے بغیر نہیں ملتی۔ یہ دعا اندھی عقیدت کے بجائے عملی پیروی کا تقاضا ہے۔

- **عصمت کا سر چشمہ اور قلوب کی حفاظت:** دعا کا اختتام اللہ کو 'عاصم قلوب النبیین' (نبیوں کے دلوں کو بچانے والے) پکارنے پر ہوتا ہے۔ انبیاء اس لیے گناہ نہیں کرتے کیونکہ اللہ ان کے دلوں کو حق کی ایسی روشن دلیلوں سے بھر دیتا ہے کہ وہ گناہ کو اس کے غلیظ روپ میں دیکھتے ہیں، اور یہی 'عصمت' کا سر چشمہ ہے۔ بندہ جانتا ہے کہ فتنوں کے دور میں حق پر قائم رہنا کٹھن ہے۔ اس لیے وہ عرض کرتا ہے کہ اے خالق! جس طرح تو نے اپنے مقرب نبیوں کے دلوں کو محفوظ رکھا، اسی طرح میرے دل کو بھی باطل کی محبتوں اور شیطانی فتنوں سے اپنی پناہ (عصمت) میں رکھ۔

❖ رمضان المبارک کے پچیسویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ ہمارا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک ہم حق کے سچے محب، باطل کے کٹر دشمن اور سنتِ رسول ﷺ کے عملی پیروکار نہ بن جائیں، اور اس منزل کی بقا کے لیے محافظِ قلوب (اللہ) کی پناہ انتہائی ناگزیر ہے۔

چھبیسویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ اجْعَلْ سَعْيِي فِيهِ مَشْكُوراً، وَذَنْبِي فِيهِ مَغْفُوراً، وَعَمَلِي فِيهِ مَقْبُولاً، وَعَيْبِي فِيهِ مَسْتُوراً، يَا أَسْمَعَ السَّامِعِينَ﴾

اے اللہ !میری کوشش کو اس مہینے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے والا (مقبول/مشکور) فرما، اور میرے گناہوں کو اس میں بخشا ہوا قرار دے، اور میرے عمل کو اس میں قبول فرما، اور میرے عیب کو اس میں چھپا دے (پوشیدہ رکھ)، اے سننے والوں میں سب سے زیادہ سننے والے۔

چھبیسواں دن: قدردانیٔ پروردگار، قبولیتِ اعمال اور پردہ پوشی

رمضان المبارک کا چھبیسواں دن بندگی کے اس انتہائی حساس اور حتمی مرحلے کی عکاسی کرتا ہے جہاں روزے دار اپنی مہینہ بھر کی ریاضتوں، عبادات اور شب بیداریوں کا نتیجہ بارگاہِ الٰہی سے طلب کرنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ انسان بخوبی جانتا ہے کہ اس کا عمل ناقص، اس کی عبادات بے روح اور اس کی کوششیں نہایت محدود ہیں؛ لہٰذا وہ اپنے اعمال کی کثرت پر فخر کرنے کے بجائے، پروردگار کی صفتِ 'الشکور' (انتہائی قدردان) کا دامن تھام لیتا ہے۔ یہ مناجات درحقیقت اس حقیقت کا اعلان ہے کہ اللہ کی ذات اتنی کریم ہے کہ وہ بندے کی ٹوٹی پھوٹی اور ادھوری نیکی کو بھی ضائع نہیں کرتی، بلکہ اسے شرفِ قبولیت بخش کر اس پر لامحدود اجر عطا فرماتی ہے۔ اس دعا کا ایک انتہائی خوبصورت اور باطنی پہلو انسان کی عزتِ نفس کی حفاظت ہے۔ سالک جانتا ہے کہ اس کے باطن میں ایسے بے شمار عیوب اور خامیاں پوشیدہ ہیں، جن سے اگر پردہ اٹھ جائے تو کوئی انسان اس سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرے۔ اس لیے وہ گناہوں کی مغفرت اور اعمال کی قبولیت کے ساتھ ساتھ، شدت سے اپنے عیوب کی پردہ پوشی کی التجا کرتا ہے۔ یہ بیان اس عاجزانہ کیفیت کا بیان ہے کہ جب انسان اپنی تنہائیوں کے گناہ اور باطنی کھوٹ کو یاد کر کے خاموش آنسوؤں سے گریہ کرتا ہے، تو وہ اس ذات کو پکارتا ہے جو بغیر الفاظ کے دل کی سب سے دھیمی آوازوں کو بھی سب سے زیادہ سننے والی (اسمع السامعین) ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے چھبیسیویں دن کی دعا انسان کو عبادات کی تکمیل پر غرور سے بچا کر، عاجزی اور اللہ کے فضل پر انحصار کا درس دیتی ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ اعمال کا محض انجام پا جانا کافی نہیں، بلکہ اصل کامیابی ان کا بارگاہِ صمدیت میں 'مقبول' ہونا اور انسانی کوشش (سعی) کا اللہ کی نگاہ میں 'مشکور' (قابلِ قدر) ٹھہرنا ہے۔ یہ دعا دراصل مہینے بھر کی خطاؤں کو بخشوانے اور دنیا و آخرت کی رسوائی سے بچنے کے لیے اللہ کی صفتِ ستار العیوب (عیب چھپانے والی ذات) کی پناہ مانگنے کا ایک عظیم روحانی لائحہ عمل ہے۔

دعا کے اہم نکات

سعی کا مشکور (قدردانی) ہونا: مہینے بھر کی گئی بھوک پیاس کی مشقت اور ادھوری سی جد و جہد (سعی) کو اللہ کی صفتِ 'شکور' کے صدقے ضائع ہونے سے بچانا اور اسے قابلِ قدر بنانا۔ **گناہوں کی کامل مغفرت:** اپنی تمام تر عبادات کے باوجود بشری کمزوریوں کے باعث دامن پر لگ جانے والے داغوں کی مکمل بخشش مانگنا، تاکہ مہینے کا اختتام گناہوں سے پاکیزگی پر ہو۔ **اعمال کی قبولیت کا معیار:** نمازوں اور روزوں میں شامل غفلتوں کا اعتراف کرتے ہوئے، محض اعمال کی انجام دہی کے بجائے ان کی 'قبولیت' کی التجا کرنا، جس کی حتمی شرط تقویٰ اور خالص نیت ہے۔ **عیوب کی پردہ پوشی اور السمیع کی پکار:** باطنی خامیوں (حسد، ریا) کو لوگوں کی نگاہ سے چھپانے (مستور رکھنے) کی التجا، اور اس خاموش پکار کو اس ذات کے سامنے پیش کرنا جو دل کی ہر سسکی کو سب سے زیادہ سننے والی (اسمع السامعین) ہے۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

١. اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ سَعْيِي فِيهِ مَشْكُوراً

سعیٔ مشکور اور قدر دانیٔ پروردگار

دعا کا پہلا فقرہ انسان کی مسلسل جدوجہد اور اللہ کی طرف سے اس کی قدر دانی کا اعلان ہے:

"اے اللہ! میری کوشش کو اس مہینے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے والا (مقبول) فرما"۔

عربی لغت میں "سَعْي" اس تیز چلنے کو کہتے ہیں جو دوڑنے سے کم ہو، یعنی کسی بھی مقصد کو پانے کے لیے بھرپور، سنجیدہ اور مسلسل جدوجہد کرنا۔ اور "مَشْكُور" کا مطلب ہے جس کا شکر ادا کیا جائے یا جس کی قدر دانی کی جائے۔

یہاں ایک انتہائی لطیف عرفانی نکتہ ابھرتا ہے: بندہ تو اللہ کا محتاج ہے، پھر اللہ بندے کی سعی کا "شکر" (قدردانی) کیسے ادا کرتا ہے؟ اللہ کی صفت "الشکور" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بندے کی چھوٹی سی، ٹوٹی پھوٹی، اور نامکمل سی نیکی کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتا، بلکہ اسے قبول کر کے اس پر لامحدود اجر عطا فرماتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اہلِ بیت (علیہم السلام) کی عظیم الشان قربانیوں اور ایثار (سعی) کی قدر دانی کا اعلان خود اپنی زبانِ قدرت سے ان الفاظ میں فرمایا ہے: ﴿إِنَّ هَٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا﴾ "یقیناً یہ (جنت کی نعمتیں) تمہارے لیے ایک صلہ ہے، اور تمہاری کوشش (سعی) کی

بھرپور قدر دانی کی گئی ہے"[1]۔

اس فقرے میں ہم اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ یا رب! میں نے پورے مہینے بھوک پیاس برداشت کی، راتوں کی نیندیں قربان کیں، میرا یہ عمل اگرچہ تیرے شایانِ شان نہیں، مگر تو اسے رد نہ کرنا، بلکہ اپنی صفتِ شکور کے صدقے میری اس حقیر سی جدوجہد (سعی) کو مشکور (قابلِ قدر) قرار دے۔

۲. وَذَنْبِي فِيهِ مَغْفُوراً

گناہوں کی مغفرت اور رحمتِ بے پایاں

دعا کا دوسرا تقاضا اعمال کے محاسبے اور خطاؤں کی بخشش سے متعلق ہے: "اور میرے گناہوں کو اس میں بخشا ہوا قرار دے"۔

گزشتہ دعاؤں میں انسان نے گناہوں سے غسل (اغسلنی) اور توبہ کی توفیق مانگی تھی، لیکن چھبیسویں دن پہنچ کر وہ عمل کے نتیجے کا خواستگار ہے، یعنی وہ حالت جس میں گناہ مکمل طور پر بخش دیے گئے ہوں (مَغْفُوراً)۔ بندہ جانتا ہے کہ چاہے وہ کتنی ہی کوشش (سعی) کر لے، اس کے دامن پر بشری کمزوریوں کے باعث کوئی نہ کوئی داغ ضرور رہ جاتا ہے۔ وہ اللہ کی اس وسیع رحمت کو پکارتا ہے جس کا وعدہ قرآنِ مجید نے مایوس دلوں کو دیا ہے: ﴿قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾

[1] قرآن مجید، سورہ الانسان، آیت ۲۲۔

"کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ یقیناً اللہ تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے، بیشک وہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے "[۱]۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام انسان کو اس مغفرت کی وسعت اور ناامیدی کے کفر سے بچاتے ہوئے فرماتے ہیں: «أَعْظَمُ الذُّنُوبِ عِنْدَ اللَّهِ سُبْحَانَهُ ذَنْبٌ صَغُرَ عِنْدَ صَاحِبِهِ» "اللہ سبحانہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ وہ ہے جسے اس کا کرنے والا معمولی اور چھوٹا سمجھے "[۲]۔

پس اس فقرے میں ہم اپنے ہر چھوٹے اور بڑے گناہ کا اعتراف کرتے ہیں اور التجا کرتے ہیں کہ اس مہینے کا اختتام ہماری کامل مغفرت پر ہو۔

۳. وَعَمَلِي فِيهِ مَقْبُولاً

اعمال کی قبولیت اور اخلاص کا معیار

تیسرا فقرہ عبادت کی روح اور اس کے حتمی ہدف کی طرف اشارہ کرتا ہے: "اور میرے عمل کو اس میں قبول فرما"۔ "عمل کرنا" اور "عمل کا قبول ہونا" دو بالکل مختلف منازل ہیں۔ ایک شخص پوری زندگی نمازیں پڑھتا ہے اور روزے رکھتا ہے، یہ اس کا عمل ہے۔ لیکن کیا وہ عمل بارگاہِ الٰہی میں شرفِ قبولیت پا سکا یا اسے رد کر دیا گیا؟ یہ قبولیت صرف اور صرف دو شرطوں پر منحصر ہے: پہلا "تقویٰ" اور دوسرا "اخلاص"۔

---

[۱] قرآن مجید، سورہ الزمر، آیت ۵۳۔

[۲] سید رضی، نہج البلاغہ، حکمت ۴۷۷۔

قرآنِ پاک نے واضح طور پر اصولِ قبولیت بیان کر دیا ہے: ﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾: "اللہ تو صرف متقین (پرہیزگاروں) ہی کے اعمال قبول کرتا ہے"[1]۔

امام جعفر صادق علیہ السلام عمل کے خالص ہونے اور اس کی قبولیت کے اس معیار کو مزید واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «وَالْعَمَلُ الْخَالِصُ الَّذِي لَا تُرِيدُ أَنْ يَحْمَدَكَ عَلَيْهِ أَحَدٌ إِلَّا اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ» "اور خالص عمل وہ ہے جس کے بارے میں تم یہ خواہش نہ رکھو کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے سوا کوئی اور شخص اس پر تمہاری تعریف کرے"[2]۔

روزے دار جانتا ہے کہ اس کی نمازوں میں خیالات بھٹکتے رہے ہیں اور اس کے روزے میں بسا اوقات غفلت شامل رہی ہے۔ اس لیے وہ اعمال کی کثرت پر فخر کرنے کے بجائے عاجزی سے گڑگڑاتا ہے کہ یا اللہ، میرے اس ناقص اور ٹوٹے پھوٹے عمل کو اپنے فضل کی چادر میں لپیٹ کر قبول (مقبول) فرما لے۔

٤. وَعَيْبِي فِيهِ مَسْتُوراً، يَا أَسْمَعَ السَّامِعِينَ

عیوب کی پردہ پوشی اور السمیع کی پکار

دعا کا اختتام انسان کی عزتِ نفس کی حفاظت اور ذاتِ الٰہی کی شنوائی کے اعتراف پر ہوتا ہے: "اور میرے عیب کو اس میں چھپا دے، اے سننے والوں میں سب سے زیادہ سننے والے"۔

---

[1] قرآن مجید، سورہ المائدہ، آیت ۲۷۔

[2] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۲، صفحہ ۱٦۔

الف) عَيْبِي فِيهِ مَسْتُوراً **(میرے عیوب چھپادے):** انسان کی شخصیت کے دو پہلو ہیں: ایک وہ ظاہر جو دنیا دیکھتی ہے، اور ایک وہ باطن جس میں بے شمار خامیاں اور عیوب چھپے ہوتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کے باطنی عیوب (حسد، ریا، تکبر، کینہ) اور تنہائی کے گناہوں سے پردہ اٹھادے، تو کائنات میں کوئی شخص اس سے بات کرنا بھی گوارانہ کرے۔ یہ اللہ کی صفت "ستار العیوب" ہے جس نے انسان کا بھرم رکھا ہوا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام دعائے کمیل میں اللہ کے اسی احسان کا ذکر کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں: «وَكَمْ مِنْ قَبِيحٍ سَتَرْتَهُ... وَكَمْ مِنْ ثَنَاءٍ جَمِيلٍ لَسْتُ أَهْلًا لَهُ نَشَرْتَهُ» "اور کتنے ہی برے کام تھے جن پر تونے پردہ ڈال دیا... اور کتنی ہی اچھی تعریفیں تھیں جن کا میں حقدار نہیں تھا لیکن تونے انہیں (لوگوں میں) پھیلا دیا"[1]۔

ب) يَا أَسْمَعَ السَّامِعِينَ **(اے سب سے زیادہ سننے والے):** اس دعا کے آخر میں اللہ کی صفت "السمیع " کا انتہائی خوبصورت استعمال ہوا ہے۔ جب بندہ اپنے دل کے اندر موجود عیوب کے چھپنے اور اپنے پوشیدہ گناہوں کی مغفرت کی التجا کرتا ہے، تو یہ وہ باتیں ہیں جو وہ چیخ کر محفلوں میں نہیں کہہ سکتا۔ وہ سسکیوں اور خاموش آنسوؤں کی زبان میں اپنے رب سے کلام کرتا ہے۔ وہ اللہ کو پکارتا ہے کہ اے "أَسْمَعَ السَّامِعِينَ "! تو وہ ذات ہے جو دل کی تنہائیوں میں اٹھنے والی خاموش التجاؤں، بغیر الفاظ کے ہونٹوں کی جنبش، اور ندامت کی ٹوٹی ہوئی آوازوں کو پوری کائنات میں سب سے بہتر اور سب سے زیادہ سننے والا ہے۔ پس میری اس خاموش پکار کو سن لے اور میرے عیوب کو ہمیشہ کے لیے مجھ تک اور اپنی ذات تک پوشیدہ (مستور) رکھ۔

---

[1] شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، دعائے کمیل۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے چھبیسویں دن کی دعا در حقیقت نامۂ اعمال کو پیش کرنے، فضلِ الٰہی کی امید رکھنے اور عزت کی حفاظت کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

- **سعئ مشکور اور قدردانئ پروردگار:** دعا کا آغاز اپنی کوشش (سعی) کو 'مشکور' بنانے کی التجا سے ہوتا ہے۔ لغت میں سعی اس مسلسل جدوجہد کو کہتے ہیں جو منزل پانے کے لیے کی جائے۔ اللہ بندے کا محتاج نہیں، پھر وہ سعی کا 'شکر' (قدردانی) کیسے کرتا ہے؟ اللہ کی صفت 'الشکور' یہ ہے کہ وہ بندے کی حقیر سی نیکی کو بھی قبول کر کے بڑا اجر دیتا ہے۔ قرآن میں اہلِ بیت علیہم السلام کی عظیم قربانیوں کو 'سعیکم مشکورا' کہہ کر سراہا گیا ہے۔ بندہ عرض کرتا ہے کہ میری ٹوٹی پھوٹی عبادتوں کو ضائع نہ کر بلکہ اپنی شانِ کریمی سے ان کی قدردانی فرما۔
- **گناہوں کی مغفرت اور رحمتِ بے پایاں:** دعا کا دوسرا تقاضا گناہوں کے بخشے جانے (مغفوراً) کا ہے۔ انسان کتنی ہی عبادت کر لے، خطاؤں کا امکان باقی رہتا ہے۔ قرآن مایوس دلوں کو تسلی دیتا ہے کہ اللہ تمام گناہوں کو بخشنے والا ہے۔ امیر المومنین علی علیہ السلام کی تنبیہ ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ وہ ہے جسے انسان معمولی سمجھے۔ اس فقرے میں ہم ہر چھوٹے بڑے گناہ کا اعتراف کر کے ماہِ صیام کا اختتام کامل مغفرت پر مانگتے ہیں۔ **اعمال کی قبولیت اور اخلاص کا معیار:** دعا کا تیسرا فقرہ عمل کے 'مقبول' ہونے سے متعلق ہے۔ عمل کرنا اور عمل کا قبول ہونا دو الگ منزلیں ہیں۔ قبولیت کی دو کڑی شرطیں

تقویٰ اور اخلاص ہیں۔ قرآن واضح کرتا ہے کہ اللہ صرف متقین کے اعمال قبول کرتا ہے۔ امام صادق علیہ السلام کے مطابق، خالص عمل وہ ہے جس پر انسان صرف اللہ کی تعریف کا طالب ہو۔ روزے دار اپنی غفلتوں کا اقرار کر کے التجا کرتا ہے کہ اے رب، میرے اس ناقص عمل کو اپنے فضل کی چادر میں لپیٹ کر قبول فرما۔ **عیوب کی پردہ پوشی اور السمیع کی پکار:** دعا کا اختتام 'عیبی مستورا' (میرے عیب چھپے رہیں) اور 'یا اسمع السامعین' کے پُر سوز واسطے پر ہوتا ہے۔ انسان کا باطن بے شمار خامیوں سے بھرا ہے، اگر اللہ انہیں ظاہر کر دے تو معاشرے میں کوئی منہ نہ لگائے۔ امام زین العابدین علیہ السلام دعائے کمیل میں اسی احسان پر روتے ہیں کہ اللہ نے برے کام چھپا کر جھوٹی تعریفیں پھیلا دیں۔ بندہ اپنے باطنی عیوب اور تنہائی کے گناہوں کی پردہ پوشی کی التجا چیخ کر نہیں، بلکہ خاموش سسکیوں سے کرتا ہے، اور اس ذات کو پکارتا ہے جو بغیر الفاظ کے دل کی سب سے دھیمی آوازوں کو بھی کائنات میں سب سے زیادہ سننے والی ہے۔

- رمضان المبارک کے چھبیسویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ ہماری نجات ہماری کوششوں کے کمال میں نہیں، بلکہ اللہ کی قدردانی، اس کی مغفرت اور اس کی پردہ پوشی میں پوشیدہ ہے۔ جب انسان عاجزی سے اپنی سسکیوں کو 'اسمع السامعین' تک پہنچاتا ہے، تو اللہ اس کی ادھوری کوششوں کو قبولیت کی معراج عطا فرما دیتا ہے۔

ستائیسویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ ارْزُقْنِي فِيهِ فَضْلَ لَيْلَةِ الْقَدْرِ، وَصَيِّرْ أُمُورِي فِيهِ مِنَ الْعُسْرِ إِلَى الْيُسْرِ، وَاقْبَلْ مَعَاذِيرِي، وَحُطَّ عَنِّيَ الذَّنْبَ وَالْوِزْرَ، يَا رَؤُوفاً بِعِبَادِهِ الصَّالِحِينَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں شبِ قدر کی فضیلت کا رزق عطا فرما، اور اس میں میرے معاملات کو تنگی (دشواری) سے آسانی کی طرف موڑ دے، اور میری معذرتوں کو قبول فرما لے، اور مجھ سے گناہ اور بوجھ کو گرا دے (معاف کر دے)، اے اپنے نیک بندوں پر بے حد مہربان (رؤوف)۔

ستائیسواں دن: دوامِ فضیلت، نزولِ آسانی اور بارِ گناہ سے رہائی

ماہِ رمضان کا ستائیسواں دن اس مبارک مہینے کے آخری اور الوداعی لمحات کی آہٹ ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر روزے دار کا دل ایک عجیب سی بے چینی، حسرت اور امید کی ملی جلی کیفیت کا شکار ہوتا ہے۔ شبہائے قدر (لیالیِ قدر) ظاہراً گزر چکی ہیں، لیکن انسان کی روح اب بھی ان عظیم راتوں کی تجلیات کو ہمیشہ کے لیے اپنے اندر سمیٹنے کے لیے بے قرار ہے۔ یہ دعا دراصل اس عرفانی حقیقت کا اعلان ہے کہ شبِ قدر محض جاگنے کا نام نہیں، بلکہ اس کی اصل 'فضیلت' اس بات میں ہے کہ اس رات کی پاکیزگی، دعاؤں کی قبولیت اور تقدیر کی برکات انسان کی بقیہ پوری زندگی کا 'رزق' بن جائیں۔ اس مناجات کا دوسرا اہم پہلو زندگی کی تلخ حقیقتوں اور دشواریوں سے نمٹنا ہے۔ انسان جانتا ہے کہ اس کی اپنی تدبیریں ناکام ہو جاتی ہیں، اس لیے وہ اللہ سے التجا کرتا ہے کہ اس کے مقدر کی ہر تنگی (عُسر) کو اپنی قدرتِ کاملہ سے آسانی (یُسر) میں تبدیل کر دے۔ سب سے بڑھ کر، یہ دعا بارگاہِ صمدیت میں انسان کی شرمساری اور عاجزی کا وہ نقطۂ کمال ہے جہاں وہ بہانے تراشنے کے بجائے اپنے گناہوں کے اس بھاری بوجھ (وزر) کا اعتراف کرتا ہے جس نے اس کی روح کی کمر توڑ دی ہے۔ یہ بیان ہمیں سکھاتا ہے کہ جب بندہ عاجزی سے اپنی معذرت پیش کرتا ہے، تو پروردگار کی وہ خاص مہربانی (رأفت) جو وہ اپنے صالح بندوں پر فرماتا ہے، اس گنہگار کو بھی اپنی آغوش میں لے کر اس کی روح کو گناہوں کے بوجھ سے آزاد کر دیتی ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے ستائیویں دن کی دعا شبِ قدر کی عارضی عبادت کو زندگی کی دائمی فضیلت میں بدلنے کی پکار ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ زندگی کی ہر تنگی اور دشواری کو صرف پروردگار کی قدرت ہی آسانی میں موڑ سکتی ہے۔ یہ دعا دراصل اللہ کے سامنے بہانے تراشنے کے بجائے اپنی خطاؤں کا اعتراف کرنے، گناہوں کے اس بھاری بوجھ سے رہائی پانے، اور پروردگار کی اس خالص شفقت (رأفت) کو پکارنے کا ایک عظیم روحانی لائحہ عمل ہے جو وہ اپنے خاص اور نیک بندوں پر فرماتا ہے۔

دعا کے اہم نکات

شبِ قدر کی فضیلت بطورِ رزق: گزر چکی شبہائے قدر کو واپس لانے کے بجائے، ان راتوں کی برکات، دعاؤں کی قبولیت اور روحانی پاکیزگی کو اپنی آئندہ زندگی کا مستقل رزق مانگنا۔ **تنگی (عُسر) سے آسانی (یُسر) کی طرف منتقلی:** زندگی کے معاشی، جسمانی اور ذہنی مسائل (تنگیوں) کو اپنی تدبیر سے حل کرنے کے بجائے، مدبر الامور (اللہ) کی قدرت سے انہیں مکمل طور پر آسانی اور کشادگی میں تبدیل (صیرورت) کروانا۔ **معذرت کی قبولیت اور گناہوں کا بوجھ:** عالم الغیب کے سامنے جھوٹے بہانے تراشنے کے بجائے، اپنے نفس کی کمزوری کو عذر کے طور پر پیش کرنا، اور گناہوں کے اس بھاری بوجھ (وزر) کو کندھوں سے گرانے کی التجا کرنا جس نے روح کی کمر جھکا دی ہو۔ **رأفتِ الٰہی کا واسطہ:** اللہ کی اس خالص اور لطیف مہربانی (رأفت) کو واسطہ بنانا جس میں سختی کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، اور جو وہ اپنے خاص 'صالحین' (انبیاء و آئمہ ع) پر فرماتا ہے، تاکہ اس کے طفیل گنہگار بھی بخشا جائے۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

۱. اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي فِيهِ فَضْلَ لَيْلَةِ الْقَدْرِ

شبِ قدر کی فضیلت اور رزقِ مستمر

دعا کا پہلا فقرہ بظاہر ایک سوال پیدا کرتا ہے کہ جب شبہائے قدر (انیسویں، اکیسویں اور تیئیسویں راتیں) گزر چکی ہیں، تو ستائیسویں دن "فضلِ لیلۃ القدر" مانگنے کا کیا مقصد ہے؟: "اے اللہ! مجھے اس مہینے میں شبِ قدر کی فضیلت کا رزق عطا فرما"۔ عرفانِ اسلامی میں اس کا نہایت لطیف جواب موجود ہے۔ ہم یہاں شبِ قدر کو واپس لانے کی دعا نہیں کر رہے، بلکہ اس کی "فضیلت" کو بطور "رزق" (ارزقنی) مانگ رہے ہیں۔ کسی رات کا جاگ لینا ایک وقتی عمل ہے، لیکن اس رات میں مانگی گئی دعاؤں کا قبول ہونا، تقدیر کے فیصلوں کا مبارک ہونا، اور روح میں پیدا ہونے والی پاکیزگی کا سارا سال قائم رہنا — یہ شبِ قدر کی اصل "فضیلت" ہے۔

قرآنِ مجید نے اس رات کی فضیلت کو ہزار مہینوں سے افضل قرار دیا ہے: ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ﴾ "شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے"[1]۔ بندہ التجا کرتا ہے کہ یا رب! اگرچہ وہ رات گزر گئی، لیکن تو اس کی انوار و برکات کا تسلسل میری زندگی کے ہر دن میں جاری رکھ۔ میرے علم، میرے عمل اور میرے اخلاص میں وہ وسعت اور فضیلت عطا کر دے جو تو نے اس ایک رات کے دامن میں چھپا رکھی تھی۔

---

[1] قرآن مجید، سورہ القدر، آیت ۳۔

۲. وَصَيِّرْ أُمُورِي فِيهِ مِنَ الْعُسْرِ إِلَى الْيُسْرِ

تنگی سے آسانی کی طرف حتمی منتقلی

دعا کا دوسرا تقاضا انسانی زندگی کے عملی اور روزمرہ مسائل کے حل سے متعلق ہے: "اور اس میں میرے معاملات کو تنگی (دشواری) سے آسانی کی طرف موڑ دے"۔

اس فقرے میں لفظ "صَيِّرْ" (صیرورت سے مشتق) استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب ہے کسی حالت کو مکمل طور پر تبدیل کر کے ایک نئی حالت میں ڈھال دینا۔ زندگی میں قدم قدم پر "عُسْر" (تنگی اور دشواری) کا سامنا ہوتا ہے؛ کبھی یہ دشواری معاشی ہوتی ہے، کبھی جسمانی بیماری کی صورت میں، اور کبھی یہ روحانی اور ذہنی الجھنوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

قرآنِ مجید انسان کو یہ حتمی تسلی دیتا ہے کہ کائنات کے نظام میں ہر تنگی کے دامن میں آسانی چھپی ہوئی ہے: ﴿فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ "پس یقیناً دشواری (تنگی) کے ساتھ ہی آسانی ہے۔ بیشک دشواری کے ساتھ ہی آسانی ہے"[1]۔

انسان کی اپنی تدبیریں جب ناکام ہو جاتی ہیں، تو وہ کائنات کے خالق کو پکارتا ہے کہ اے مدبر الامور! میرے مقدر میں آنے والی ہر تنگی کو اپنی قدرتِ کاملہ سے اس طرح تبدیل (صَيِّر) کر دے کہ میری زندگی کے تمام معاملات میں روحانی اور مادی یُسر (آسانی اور کشادگی) پیدا ہو جائے۔

---

[1] قرآن مجید، سورہ الشرح، آیت ۵-۶۔

۳. وَاقْبَلْ مَعَاذِيرِي، وَحُطَّ عَنِّيَ الذَّنْبَ وَالْوِزْرَ

معذرتوں کی قبولیت اور گناہوں کا بوجھ

تیسرا فقرہ انسان کے عجز، اس کی خطاؤں کے بوجھ اور اللہ کے دربار میں اس کی شرمساری کا اقرار ہے: "اور میری معذرتوں کو قبول فرمالے، اور مجھ سے گناہ اور بوجھ کو گرادے"۔

الف) وَاقْبَلْ مَعَاذِيرِي **(میری معذرتیں قبول فرما):** معاذیر "معذرت" کی جمع ہے۔ جب انسان سے کوئی غلطی ہوتی ہے، تو وہ دنیا والوں کے سامنے بہانے اور حیلے تراشتا ہے تاکہ خود کو سچا ثابت کرسکے۔ لیکن جب وہ اللہ کی بارگاہ میں کھڑا ہوتا ہے، تو جانتا ہے کہ عالم الغیب کے سامنے کوئی بہانہ نہیں چل سکتا۔ یہاں معذرت کا مطلب یہ ہے کہ "اے اللہ! میرے پاس اپنے گناہوں کا کوئی جواز نہیں، بس اپنے نفس کی کمزوری کو بطور عذر پیش کرتا ہوں، پس تو میری اس ٹوٹی پھوٹی معذرت کو اپنے کرم سے قبول فرمالے۔"

ب) وَحُطَّ عَنِّيَ الذَّنْبَ وَالْوِزْرَ **(مجھ سے گناہ اور بوجھ کو گرادے):**

"ذَنْب" کا مطلب گناہ ہے اور "وِزْر" کا مطلب وہ انتہائی بھاری بوجھ ہے جو انسان کی کمر توڑ دے۔ گناہ بظاہر نظر نہیں آتے، لیکن روح پر ان کا بوجھ پہاڑوں سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآنِ مجید میں بھی اسی لفظ کا استعمال ہوا ہے: ﴿وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ﴾ (اور ہم نے آپ سے آپ کا وہ بوجھ اتار دیا، جس نے آپ کی کمر جھکا دی تھی)۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام دعائے کمیل میں اپنے گناہوں کے اسی بوجھ تلے دبے ہونے کا

شکوہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں: «وَقَعَدَتْ بِي أَغْلَالِي، وَحَبَسَنِي عَنْ نَفْعِي بُعْدُ آمَالِي» "اور میری طوق و زنجیروں (گناہوں کے بوجھ) نے مجھے بٹھا دیا ہے، اور میری لمبی آرزوؤں نے مجھے نفع حاصل کرنے سے روک دیا ہے"[1]۔

اس فقرے میں ہم عرض کرتے ہیں کہ اے خالق! ماہ رمضان گزر رہا ہے، میرے کاندھوں سے ان گناہوں کے بوجھ کو نیچے گرا (حُطّ) دے، تاکہ میری روح ہلکی ہو کر تیری بارگاہ میں پرواز کر سکے۔

٤. يَا رَؤُوفاً بِعِبَادِهِ الصَّالِحِينَ

رأفتِ الٰہی کا واسطہ اور صالحین کا مقام

دعا کا اختتام ذاتِ الٰہی کی ایک انتہائی لطیف اور محبت بھری صفت کے واسطے پر ہوتا ہے: "اے اپنے نیک بندوں پر بے حد مہربان (رؤوف)"۔

"رَأْفَت" اور "رَحْمَت" میں ایک بہت ہی باریک اور عرفانی فرق ہے۔ رحمت میں بسا اوقات انسان کی اصلاح کے لیے تنبیہ کا پہلو بھی شامل ہو سکتا ہے (جیسے ایک ماں اپنے بچے کو دوا پلانے کے لیے زبردستی کرتی ہے)، لیکن رأفت خالص نرمی، شفقت، اور ایسی مہربانی کا نام ہے جس میں دکھ کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ "رؤوف" وہ ذات ہے جو یہ گوارا ہی نہیں کرتی کہ اس کے بندے کو ذرہ برابر بھی تکلیف پہنچے۔

---

[1] شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، دعائے کمیل۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے خود کو بندوں کے لیے نہایت رؤوف اور رحیم قرار دیا ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ "یقیناً اللہ لوگوں پر بہت زیادہ شفقت کرنے والا (رؤوف) اور بے حد رحم کرنے والا ہے"[1]۔

جب بندہ گناہوں کا بوجھ گرانے اور دشواریوں کو آسانی میں بدلنے کی التجا کرتا ہے، تو وہ جانتا ہے کہ اس کا اپنا عمل تو "صالحین" (نیکوکاروں) جیسا نہیں ہے، لیکن وہ اللہ کی بارگاہ میں ان صالحین (انبیاء اور آئمہ اطہار علیہم السلام) کا واسطہ دیتا ہے جن پر اللہ کی رأفت کا ہر دم نزول ہوتا ہے۔ وہ عرض کرتا ہے کہ اے اللہ! اسی رأفت کے صدقے جو تو اپنے صالح بندوں پر فرماتا ہے، مجھ گنہگار پر بھی شفقت کی ایک نظر فرما دے، کیونکہ تیرا کرم میری خطاؤں سے بہت بلند ہے۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے ستائیسویں دن کی دعا در حقیقت برکات کے تسلسل، مشکلات کے حل اور روح کی سبکدوشی کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

- **شبِ قدر کی فضیلت اور رزقِ مستمر:** دعا کا آغاز شبِ قدر کی 'فضیلت' کو 'رزق' کے طور پر مانگنے سے ہوتا ہے۔ بظاہر انیسویں، اکیسویں اور تیئیسویں راتیں گزر چکی ہیں، مگر عرفان میں اس التجا کا مقصد رات کو واپس لانا نہیں، بلکہ اس رات کے اثرات (تقدیر کی بہتری، اخلاص اور پاکیزگی) کو سارا سال قائم رکھنا ہے۔ قرآن کے مطابق یہ رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ بندہ عرض کرتا

[1] قرآن مجید، سورہ الحج، آیت ۶۵۔

ہے کہ اے رب، اس ایک رات کے دامن میں چھپی وسعت اور فضیلت کو میری بقیہ زندگی کا دائمی رزق بنا دے۔

- **تنگی سے آسانی کی طرف حتمی منتقلی:** دعا کا دوسرا تقاضا عملی زندگی کے مسائل سے متعلق ہے۔ یہاں لفظ 'صَیِّرْ' استعمال ہوا ہے جس کا مطلب کسی حالت کو مکمل بدل دینا ہے۔ انسان کو قدم قدم پر 'عسر' (تنگی) کا سامنا ہوتا ہے۔ قرآن تسلی دیتا ہے کہ ہر تنگی کے ساتھ آسانی (یسر) ہے۔ جب انسانی تدبیریں دم توڑ دیتی ہیں، تو بندہ التجا کرتا ہے کہ اے اللہ، میرے معاملات کو اپنی قدرت سے اس طرح موڑ دے کہ ہر دشواری کشادگی میں بدل جائے۔

- **معذرتوں کی قبولیت اور گناہوں کا بوجھ:** دعا کا تیسرا فقرہ عجز اور شرمساری کا اقرار ہے۔ 'معاذیر' کا مطلب معذرتیں اور 'وزر' کا مطلب کمر توڑ دینے والا بوجھ ہے۔ انسان دنیا والوں کے سامنے حیلے تراشتا ہے، مگر عالم الغیب کے سامنے اس کی کوئی دلیل نہیں چلتی۔ وہ محض اپنی کمزوری کو عذر کے طور پر پیش کرتا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام دعائے کمیل میں گناہوں کے اسی بوجھ پر روتے ہیں جس نے انہیں نفع کمانے سے بٹھا دیا ہے۔ روزے دار عرض کرتا ہے کہ اے رب، ماہِ صیام گزر رہا ہے، میری روح سے ان گناہوں کا بھاری بوجھ گرا (حطّ) دے تا کہ میں پرواز کر سکوں۔

- **رأفتِ الٰہی کا واسطہ اور صالحین کا مقام:** دعا کا اختتام اللہ کی صفت 'رؤوف' کے واسطے پر ہوتا ہے۔ رحمت میں بسا اوقات اصلاح کے لیے سختی (تنبیہ) شامل ہوتی ہے، مگر رأفت وہ خالص اور لطیف شفقت ہے جس میں تکلیف کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ قرآن اعلان کرتا ہے کہ اللہ لوگوں پر رؤوف ہے۔ بندہ جانتا ہے کہ اس کا اپنا عمل 'صالحین' جیسا نہیں، اس لیے وہ اللہ کو ان صالح بندوں (انبیاء اور اہلِ بیت ع) کا واسطہ دیتا ہے جن پر ہمیشہ رأفت کا نزول ہوتا ہے، تا کہ اس

کرم کے صدقے اس گنہگار کی معذرت بھی قبول ہو جائے۔

❖ رمضان المبارک کے ستائیسویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ شبِ قدر کی اصل کامیابی اس کی فضیلت کا دائمی رزق بن جانا ہے۔ اور جب انسان اپنے گناہوں کے بوجھ کا اعتراف کرکے اللہ کی خالص رأفت کو پکارتا ہے، تو اللہ اس کی ہر تنگی کو آسانی میں بدل کر اس کی معذرت قبول فرمالیتا ہے۔

اٹھائیسویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ وَفِّرْ حَظِّي فِيهِ مِنَ النَّوَافِلِ، وَأَكْرِمْنِي فِيهِ بِإِحْضَارِ الْمَسَائِلِ، وَقَرِّبْ فِيهِ وَسِيلَتِي إِلَيْكَ مِنْ بَيْنِ الْوَسَائِلِ، يَا مَنْ لَا يَشْغَلُهُ إِلْحَاحُ الْمُلِحِّينَ﴾

اے اللہ! اس مہینے میں نوافل (مستحب عبادات) سے میرا حصہ وافر (کثیر) کر دے، اور اس میں (میرے) مسائل (حاجتوں) کو حاضر کر کے (پورا کر کے) مجھے کرامت (عزت) عطا فرما، اور تمام وسیلوں کے درمیان سے میرے وسیلے کو اپنی جانب قریب کر دے، اے وہ ذات جسے اصرار کرنے والوں کا اصرار (دیگر سائلین سے) غافل (مشغول) نہیں کرتا۔

اٹھائیسواں دن: وسعتِ نوافل، کرامتِ سائل اور قربِ وسیلہ

رمضان المبارک کا اٹھائیسواں دن، جو اس مبارک مہینے کے بالکل آخری اور الوداعی لمحات کا احاطہ کرتا ہے، بندگی کے ایک ایسے بلند اور عاشقانہ روحانی مقام کی نشاندہی کرتا ہے جہاں انسان محض واجبات کی ادائیگی سے آگے بڑھ کر مستحبات (نوافل) کی لامتناہی وسعتوں میں قدم رکھتا ہے۔ یہ دعا دراصل اس حقیقت کا اعلان ہے کہ فرض عبادات تو بندے کی ذمہ داری ہیں جنہیں مؤاخذے کے خوف سے ادا کیا جاتا ہے، لیکن 'نوافل' محبت کی وہ زبان ہیں جو انسان کو بارگاہِ صمدیت میں 'محب' (عاشق) سے ترقی دے کر 'محبوب' بنا دیتی ہیں۔ اس مناجات کا دوسرا اہم پہلو انسان کی عزتِ نفس کی حفاظت ہے۔ سالک جب دنیا والوں کے سامنے اپنے مسائل پیش کرتا ہے تو ذلیل ہوتا ہے، لیکن جب وہ اپنی تمام حاجات اور الجھنیں (مسائل) براہِ راست اللہ کے دربار میں حاضر کرتا ہے، تو خالق اسے ذلت کے بجائے 'کرامت' (عزت) عطا فرماتا ہے۔ اس دعا کا سب سے عمیق عرفانی مرکز 'وسیلے' کی قربت ہے۔ انسان کا وجود محدود اور خاکی ہے، جبکہ ذاتِ الٰہی لامحدود ہے؛ اس لیے اسے قربِ الٰہی تک پہنچنے کے لیے کائنات کے سب سے اعظم اور مقرب وسیلے (محمد و آلِ محمد ع) کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ بیان اس یقین پر ختم ہوتا ہے کہ جب کروڑوں انسان رات دن گڑگڑا کر اللہ کو پکار رہے ہوں، تب بھی ان کا ہجوم اور اصرار (الحاح) پروردگار کو ایک گنہگار کی دھیمی اور ٹوٹی پھوٹی آواز سننے سے غافل نہیں کر سکتا۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے اٹھائیسویں دن کی دعا انسان کو واجبات سے آگے بڑھا کر نوافل کے ذریعے اللہ کی محبت پانے کا راستہ دکھاتی ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ اپنی تمام تر حاجات (مسائل) کو مخلوق کے بجائے صرف اللہ کے سامنے پیش کر کے اپنی عزتِ نفس (کرامت) محفوظ رکھی جائے۔ یہ دعا در اصل اللہ کے سب سے مقرب وسیلے (اہلِ بیت ع) کا دامن تھام کر، اس لامحدود ذات سے اپنی التجائیں منوانے کا ایک عظیم روحانی لائحہ عمل ہے، جسے کروڑوں سائلین کا اصرار بھی کسی ایک بندے کی پکار سننے سے غافل نہیں کر سکتا۔

دعا کے اہم نکات

نوافل کی کثرت سے قربِ الٰہی: واجبات کے خوف سے نکل کر، محض اللہ کی محبت میں انجام دی جانے والی مستحب عبادات (نوافل) میں وافر حصہ مانگنا تاکہ بندہ اللہ کا محبوب بن جائے۔ **حاجات کا دربارِ الٰہی میں احضار:** اپنے دنیوی اور دینی الجھنوں (مسائل) کو غیروں کے سامنے لے جا کر ذلیل ہونے کے بجائے، اللہ کے حضور پیش کر کے اس سے 'کرامت' (عزت اور حل) طلب کرنا۔ **کامل ترین وسیلے کی قربت:** اپنے محدود وجود کو لامحدود خدا تک پہنچانے کے لیے، تمام عبادات اور اعمال کے درمیان سے کائنات کے سب سے اعظم وسیلے (رسول اور اہلِ بیت ع) کو بارگاہِ الٰہی میں پیش کرنا۔ **ہجومِ سائلین اور وسعتِ سماعتِ پروردگار:** اس عقیدے کا اقرار کہ رمضان کے آخری ایام میں کروڑوں لوگوں کا بار بار گڑگڑانا (الحاح) بھی اللہ کو میری دھیمی اور انفرادی پکار سننے سے مشغول (غافل) نہیں کر سکتا۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

١. اَللّٰهُمَّ وَفِّرْ حَظِّي فِيهِ مِنَ النَّوَافِلِ

نوافل کی کثرت اور قربِ الٰہی کا راستہ

دعا کا پہلا فقرہ واجبات کے بعد بندگی کے اس اضافی اور عاشقانہ سفر کا آغاز ہے: "اے اللہ! اس مہینے میں نوافل (مستحب عبادات) سے میرا حصہ وافر (کثیر) کر دے"۔

لفظ "نوافل" نفل کی جمع ہے، جس کا مطلب ہے وہ اضافی عمل جو انسان پر واجب (فرض) نہیں، لیکن وہ اسے خالصتاً اللہ کی محبت میں انجام دیتا ہے۔ فرض عبادات تو ایک عبد (بندے) کی ذمہ داری ہیں، جنہیں چھوڑنے پر مؤاخذے کا خوف ہوتا ہے، لیکن نوافل محبت کی وہ زبان ہیں جو انسان کو محب (عاشق) سے محبوب بنا دیتے ہیں۔

حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ نے نوافل کے ذریعے حاصل ہونے والے اس عظیم قرب کا اعلان ان لرزہ خیز اور محبت بھرے الفاظ میں فرمایا ہے: «وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا» "اور میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پس جب میں اس سے محبت کرتا ہوں، تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اور اس کی بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا

ہے، اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے"[1]۔

اٹھائیسویں دن ہم اللہ سے یہی التجا کرتے ہیں کہ اے خالق! جب ماہ رمضان رخصت ہو رہا ہے، تو میرے مقدر میں ان نوافل (نمازِ شب، صدقہ، اور مستحب روزوں) کا اتنا وافر حصہ لکھ دے کہ میں تیرے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ تیرے قرب کی اس معراج تک بھی پہنچ سکوں۔

۲. وَأَكْرِمْنِي فِيهِ بِإِحْضَارِ الْمَسَائِلِ

مسائل کی حضوری اور کرامتِ پروردگار

دعا کا دوسرا تقاضا انسان کی حاجات کے پورا ہونے اور اس کی عزتِ نفس کی حفاظت سے متعلق ہے: "اور اس میں (میرے) مسائل کو حاضر کر کے مجھے کرامت (عزت) عطا فرما"۔

یہاں "مَسَائِل" (مسئلہ کی جمع) سے مراد انسان کی وہ تمام حاجات، الجھنیں، اور دینی و دنیوی تقاضے ہیں جن کے حل کے لیے وہ اللہ کی بارگاہ میں سوال کرتا ہے۔ جب انسان دنیا والوں کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کرتا ہے تو عموماً اسے ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن جب وہ اللہ کے سامنے اپنا مسئلہ حاضر کرتا ہے (إِحْضَارِ الْمَسَائِلِ) تو اللہ اسے ذلیل نہیں کرتا بلکہ اسے "اکرام" (کرامت اور عزت) عطا کرتا ہے۔

قرآنِ مجید نے انسان کی اسی کرامت اور اللہ کی عطا کا ذکر یوں کیا ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ... وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾ "اور یقیناً ہم نے بنی آدم کو

---

[1] ثقۃ الاسلام کلینی، الکافی، جلد ۲، صفحہ ۳۵۲۔

کرامت (عزت) عطا کی ہے... اور ہم نے انہیں اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فضیلت دی ہے"[۱]۔

بندہ عرض کر رہا ہے کہ اے اللہ! میرے جو بھی دینی مسائل (شریعت کی سمجھ) اور دنیوی مسائل (رزق، صحت، اور کٹھن مراحل) ہیں، انہیں اپنے دربار سے اس طرح حل فرما دے کہ مجھے کسی غیر کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے اور میری عزتِ نفس (کرامت) برقرار رہے۔

٣. وَقَرِّبْ فِيهِ وَسِيلَتِي إِلَيْكَ مِنْ بَيْنِ الْوَسَائِلِ

وسیلے کی قربت اور بابُ اللہ کی پہچان

تیسرا فقرہ اس دعا کا سب سے زیادہ عقائدی اور عرفانی مرکز ہے: "اور تمام وسیلوں کے درمیان سے میرے وسیلے کو اپنی جانب قریب کر دے"۔

"وَسِيلَة" عربی زبان میں اس ذریعے، واسطے، اور رابطے کو کہتے ہیں جو انسان کو اس کی منزل اور مقصود تک انتہائی قربت اور محبت کے ساتھ پہنچا دے[۲]۔ اللہ تعالیٰ کی ذات لامحدود ہے اور انسان کا وجود نہایت محدود اور خاکی ہے۔ اس محدود کو اس لامحدود تک پہنچنے کے لیے کسی کامل واسطے (وسیلے) کی ضرورت ہوتی ہے۔

قرآنِ مجید نے مؤمنین کو صریحاً حکم دیا ہے کہ اللہ تک پہنچنے کے لیے وسیلہ تلاش کرو: ﴿يَا أَيُّهَا

---

[۱] قرآن مجید، سورہ الاسراء، آیت ۷۰۔

[۲] راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن۔

الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ﴾ "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کی طرف (قربت کا) وسیلہ تلاش کرو"[۱]۔

کائنات میں عبادات (نماز، روزہ، حج) بھی وسیلہ ہیں، لیکن "مِنْ بَيْنِ الْوَسَائِلِ" (تمام وسیلوں کے درمیان سے) سب سے اعظم، سب سے قریب اور سب سے کامل وسیلہ محمد و آلِ محمد علیہم السلام کی ذواتِ مقدسہ ہیں۔ خاتونِ جنت سیدہ فاطمہ زہرا علیہا السلام اپنے تاریخی خطبے میں اسی عظیم ترین وسیلے کا اعلان کرتے ہوئے فرماتی ہیں: «وَأَحْمَدُ اللَّهَ الَّذِي بِعَظَمَتِهِ وَنُورِهِ ابْتَغَى مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ، وَنَحْنُ وَسِيلَتُهُ فِي خَلْقِهِ» "اور میں اس اللہ کی حمد کرتی ہوں جس کی عظمت اور نور کے سبب آسمانوں اور زمین کی ہر مخلوق اس کی طرف وسیلہ تلاش کرتی ہے، اور اس کی مخلوق میں ہم (اہلِ بیت علیہم السلام) ہی اس کا (سب سے بڑا) وسیلہ ہیں"[۲]۔

روزے دار التجا کرتا ہے کہ یا اللہ! میں نے تیرے مقرب ترین بندوں کو اپنا وسیلہ بنایا ہے، پس اس وسیلے کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت بخش کر مجھے اپنے بے حد قریب کر لے۔

٤. يَا مَنْ لَا يَشْغَلُهُ إِلْحَاحُ الْمُلِحِّينَ

اصرار کرنے والوں کا ہجوم اور وسعتِ سماعتِ پروردگار

دعا کا اختتام ذاتِ الٰہی کی ایک ایسی صفت کے واسطے پر ہوتا ہے جو انسان کے دل سے ہر قسم کی

[۱] قرآن مجید، سورہ المائدہ، آیت ۳۵۔

[۲] ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، جلد ۱۶، صفحہ ۲۱۱۔

مایوسی کو ختم کر دیتی ہے: "اے وہ ذات جسے اصرار کرنے والوں کا اصرار (دیگر سائلین سے) غافل (مشغول) نہیں کرتا"۔

لفظ "إِلْحَاح" کا مطلب ہے بار بار مانگنا، گڑگڑا کر مسلسل ایک ہی چیز کا سوال کرنا۔ دنیا میں اگر کوئی شخص کسی حکمران کے پاس جاکر بار بار سوال کرے، تو وہ تنگ آجاتا ہے اور اسے دھتکار دیتا ہے۔ مزید یہ کہ دنیا کا کوئی بھی انسان ایک ہی وقت میں ہزاروں لوگوں کی پکار نہیں سن سکتا، ایک کی بات سنے گا تو دوسرے سے غافل ہو جائے گا۔

لیکن پروردگار کی ذات اس محدودیت سے پاک ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اللہ کی اس لامحدود وسعتِ سماعت کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں: «لَا يَشْغَلُهُ شَأْنٌ عَنْ شَأْنٍ، وَلَا يُغَيِّرُهُ زَمَانٌ، وَلَا يَحْوِيهِ مَكَانٌ، وَلَا يَصِفُهُ لِسَانٌ» "اسے ایک کام دوسرے کام سے غافل (مشغول) نہیں کرتا، اور کوئی زمانہ اس میں تغیر (تبدیلی) پیدا نہیں کرتا، اور کوئی جگہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتی، اور کوئی زبان اس کی (کامل) صفت بیان نہیں کر سکتی"[1]۔

رمضان کے ان آخری ایام میں کروڑوں بندے، رات کی تاریکیوں اور دن کے اجالوں میں، گڑگڑا کر اس سے اپنی حاجات مانگ رہے ہیں۔ ہم اللہ کو اسی شان کے ساتھ پکارتے ہیں کہ اے لامحدود خالق! اتنے سارے سائلین کا اصرار (الحاح) تجھے میری اس دھیمی اور ٹوٹی پھوٹی آواز سننے سے نہیں روک سکتا۔ پس میری اس التجا کو بھی اپنے دربار میں شرفِ قبولیت عطا فرما۔

---

[1] سید رضی، نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۸۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے اٹھائیسویں دن کی دعا در حقیقت نوافل کی محبت، عزتِ نفس کی حفاظت اور وسیلۂ حق کی پہچان کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

- **نوافل کی کثرت اور قربِ الٰہی کا راستہ:** دعا کا آغاز 'نوافل' (مستحب عبادات) سے وافر حصہ مانگنے پر ہوتا ہے۔ نوافل وہ اضافی عمل ہیں جو واجب نہیں مگر خالص محبت میں کیے جاتے ہیں۔ حدیثِ قدسی کے مطابق، بندہ نوافل کے ذریعے اللہ کا اتنا قرب حاصل کر لیتا ہے کہ اللہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے، اور پھر اللہ ہی اس بندے کی آنکھ، کان اور ہاتھ بن جاتا ہے۔ روزے دار التجا کرتا ہے کہ ماہِ صیام کی رخصتی سے قبل اس کے مقدر میں نوافل (تہجد، صدقہ) کا اتنا حصہ لکھ دیا جائے جو اسے اللہ کا محبوب بنا دے۔

- **مسائل کی حضوری اور کرامتِ پروردگار:** دعا کا دوسرا تقاضا حاجات (مسائل) کے حل اور 'اکرام' (عزت عطا کرنے) سے متعلق ہے۔ انسان کی زندگی دینی اور دنیوی الجھنوں سے بھری ہے۔ جب وہ دنیا کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے تو ذلیل ہوتا ہے، لیکن جب وہ اپنے مسائل اللہ کے دربار میں 'حاضر' کرتا ہے، تو قرآن کے اعلانِ 'ولقد کرمنا بنی آدم' کے مطابق، اللہ اسے ذلیل نہیں کرتا بلکہ کرامت سے نوازتا ہے۔ بندہ عرض کرتا ہے کہ اے رب، میرے تمام مسائل کو اپنے کرم سے حل کر کے میری عزتِ نفس برقرار رکھ۔

- **وسیلے کی قربت اور بابُ اللہ کی پہچان:** دعا کا تیسرا اور سب سے عرفانی فقرہ 'وسیلہ' کی قربت مانگنے پر مبنی ہے۔ وسیلہ وہ واسطہ ہے جو انسان کو محبت کے ساتھ اس کی منزل تک

پہنچائے۔ قرآن واضح حکم دیتا ہے کہ اللہ کی طرف وسیلہ تلاش کرو۔ اگرچہ عبادات بھی وسیلہ ہیں، لیکن کائنات کا سب سے کامل اور اعظم وسیلہ محمد و آلِ محمد علیہم السلام ہیں۔ سیدہ فاطمہ (س) کے تاریخی خطبے کے مطابق، اہلِ بیت علیہم السلام ہی کائنات میں اللہ کی طرف جانے کا سب سے بڑا وسیلہ ہیں۔ ہم التجا کرتے ہیں کہ یا اللہ، میرے اس سچے وسیلے کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت بخش کر مجھے اپنا قرب عطا فرما۔

- **اصرار کرنے والوں کا ہجوم اور وسعتِ پروردگار:** دعا کا اختتام اللہ کی لامحدود وسعتِ سماعت کے نہایت خوبصورت واسطے پر ہوتا ہے۔ دنیا کے بادشاہوں کے پاس اگر لوگ بار بار (الحاح کے ساتھ) ایک ہی سوال کریں تو وہ تنگ آجاتے ہیں، اور ایک کی بات سنیں تو دوسرے سے غافل ہو جاتے ہیں۔ مگر امیر المومنین علی علیہ السلام کی روشنی میں، اللہ وہ ذات ہے جسے ایک کام دوسرے کام سے غافل نہیں کرتا۔ بندہ پکارتا ہے کہ اے لامحدود خالق! رمضان کے ان آخری دنوں میں کروڑوں سائلین کا اصرار تجھے میری یہ دھیمی سی فریاد سننے سے نہیں روک سکتا۔

❖ رمضان المبارک کے اٹھائیسویں دن کی یہ مناجات ہمیں یہ شعور دیتی ہے کہ بندگی کی معراج فرائض کی ادائیگی کے ساتھ نوافل کی محبت میں پوشیدہ ہے۔ اور جب انسان سچے وسیلے (اہلِ بیت علیہم السلام) کا دامن تھام کر اللہ کو پکارتا ہے، تو کروڑوں کی آوازوں کے ہجوم میں بھی پروردگار اس کی حاجت روائی کر کے اسے عزت عطا فرما دیتا ہے۔

انتیسویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ غَشِّنِي فِيهِ بِالرَّحْمَةِ، وَارْزُقْنِي فِيهِ التَّوْفِيقَ وَالْعِصْمَةَ، وَطَهِّرْ قَلْبِي مِنْ غَيَاهِبِ التُّهَمَةِ، يَا رَحِيماً بِعِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ﴾

اے اللہ! مجھے اس مہینے میں (اپنی) رحمت سے مکمل ڈھانپ لے، اور مجھے اس میں توفیق اور (گناہوں سے) تحفظ (عصمت) کا رزق عطا فرما، اور میرے دل کو تہمت (اور شکوک و شبہات) کی تاریکیوں سے پاک کر دے، اے اپنے مؤمن بندوں پر رحم کرنے والے۔

انتیسواں دن: رحمتِ محیط، تحفظِ دائمی اور بصیرت

ماہِ رمضان المبارک کا انتیسواں دن اس عظیم الشان روحانی ضیافت کے بالکل آخری اور الوداعی لمحات کی صدائے بازگشت ہے۔ روزے دار جب اس مقام پر پہنچتا ہے تو اس کے دل پر فراق کا رنج اور امید کی طمانیت بیک وقت طاری ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ رحمتوں اور برکتوں کا یہ مبارک موسم اب رخصت ہونے کو ہے، اس لیے وہ بارگاہِ الٰہی میں محض جزوی طلب کے بجائے رحمت کے اس 'مکمل غلاف' کی التجا کرتا ہے جو اس کے پورے وجود، اس کی خطاؤں اور لغزشوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ یہ دعا درحقیقت محض رمضان کے اختتام کی نہیں، بلکہ آئندہ آنے والی زندگی کے کٹھن سفر اور آزمائشوں کی تیاری کا ایک عظیم منشور ہے۔ انسان اللہ سے 'توفیق' (نیکیوں کے تسلسل) اور 'عصمت' (گناہوں سے ابدی تحفظ) کو بطورِ رزق مانگتا ہے تاکہ جب شیاطین کی زنجیریں دوبارہ کھلیں، تب بھی اس کا روحانی حصار نہ ٹوٹے۔ اس مناجات کا سب سے پُر جلال اور عصری پہلو فکری، نظریاتی اور عقائدی طہارت کی طلب ہے۔ دورِ حاضر میں جب باطل اور ظالم قوتیں اپنے پروپیگنڈے اور جھوٹے بیانیے سے حق کو دھندلانے کی کوشش کرتی ہیں، تو سالک التجا کرتا ہے کہ اس کے دل کو شکوک و شبہات کے گھٹاٹوپ اندھیروں (غیاہبِ تہمت) سے اس قدر پاک کر دیا جائے کہ وہ روزِ روشن کی طرح حق کی پہچان اور اس کا دفاع کر سکے۔ فتنوں کے اس دور میں ثابت قدمی صرف اور صرف اس ذات کی 'رحمتِ خاصہ' سے مل سکتی ہے جو اپنے مؤمن بندوں پر بے حد مہربان (رحیم) ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے انتیسویں دن کی دعا، جو کہ اس مبارک مہینے کے الوداعی لمحات کی عکاس ہے، اللہ کی رحمت میں مکمل طور پر غرق ہونے اور فکری و نظریاتی تحفظ پر مرکوز ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ رمضان کے بعد کی زندگی کے لیے اعمال کی توفیق اور گناہوں سے بچنے کی ڈھال (عصمت) کیسے مانگی جائے۔ یہ دعا دراصل باطل کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات کی تاریکیوں سے دل کو پاک کر کے، اللہ کی اس 'رحمتِ خاصہ' کے پُر امن حصار میں آنے کا نام ہے جو صرف حق کو تسلیم کرنے والے سچے مؤمنین کے لیے مختص ہے۔

دعا کے اہم نکات

رحمتِ الٰہی کا مکمل غلاف: جزوی رحمت کے بجائے، اللہ کی رحمت کے اس مکمل اور محیط غلاف (غشاوۃ) کی التجا جو انسان کی تمام خطاؤں اور کوتاہیوں کو اپنے اندر ڈھانپ لے۔ **توفیق اور عصمت کا دائمی رزق:** رمضان کے بعد نیکیوں اور عبادات کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے 'توفیق' اور شیطانی حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے 'عصمت' کی زرہ مانگنا۔ **تاریکیوں اور شکوک سے قلب کی طہارت:** باطل کے جھوٹے پروپیگنڈے اور شکوک (تہمت) کے گھٹا ٹوپ اندھیروں (غیاہب) سے دل کو پاک کر کے حق پر ثابت قدم رہنے کی نظریاتی بصیرت حاصل کرنا۔ **مؤمنین کے لیے رحمتِ خاصہ:** کائنات کے ہر ذرے پر برسنے والی رحمتِ عامہ کے بجائے، اللہ کی اس صفتِ 'رحیم' کو پکارنا جو اس کی اس خاص رحمت کا مظہر ہے، جو صرف اہلِ ایمان کے لیے ہے۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

۱. اَللّٰهُمَّ غَشِّنِي فِيهِ بِالرَّحْمَةِ

رحمتِ الٰہی کا مکمل غلاف اور سرپرستی

دعا کا پہلا فقرہ رحمت کی ایک ایسی کیفیت کی طلب ہے جو انسان کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لے: "اے اللہ! مجھے اس مہینے میں (اپنی) رحمت سے مکمل ڈھانپ لے"۔ یہاں ایک انتہائی بلیغ قرآنی لفظ "غَشِّنِي "استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں "غِشَاوَة"اس پردے یا غلاف کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو اس طرح ڈھانپ لے کہ اس کا کوئی حصہ باہر نہ رہے۔ ماہِ رمضان کے ابتدائی دنوں (جیسے نویں دن کی دعا) میں ہم نے التجا کی تھی کہ ﴿اجْعَلْ لِي فِيهِ نَصِيباً مِنْ رَحْمَتِكَ﴾ (میرے لیے اپنی رحمت کا ایک حصہ قرار دے)۔ لیکن آج، جب مہینہ ختم ہو رہا ہے، تو مؤمن کی طلب عروج پر پہنچ گئی ہے۔ اب وہ محض "حصہ "نہیں مانگ رہا، بلکہ عرض کر رہا ہے کہ اے خالق! مجھے اپنی رحمت کے غلاف میں اس طرح ڈھانپ لے کہ میرے گناہ، میری کوتاہیاں اور میری لغزشیں اس غلاف کے اندر چھپ جائیں اور تیرے عذاب کی کوئی کرن مجھ تک نہ پہنچ سکے۔

قرآنِ مجید نے اللہ کی اس ڈھانپ لینے والی رحمت اور غلاف کا ذکر نہایت لطیف انداز میں کیا ہے: ﴿فَغَشَّاهَا مَا غَشَّىٰ﴾ "پس اس (رحمت یا عذاب) نے اسے ڈھانپ لیا، جیسا کہ ڈھانپنے کا حق تھا"[1]۔

---

[1] قرآن مجید، سورہ النجم، آیت ۵۴۔

۲. وَارْزُقْنِي فِيهِ التَّوْفِيقَ وَالْعِصْمَةَ

توفیق کا تسلسل اور گناہوں سے ابدی تحفظ

دعا کا دوسرا تقاضا ماہ رمضان کے بعد کی عملی زندگی کے لیے ایک روحانی زِرہ کی طلب ہے: "اور مجھے اس میں توفیق اور (گناہوں سے) تحفظ (عصمت) کا رزق عطا فرما"۔

اس فقرے میں دو عظیم نعمتوں کو "رزق" کے طور پر مانگا گیا ہے:

- التَّوْفِيق **(توفیق):** اسباب کا اس طرح موافق ہو جانا کہ نیکی کا راستہ آسان ہو جائے۔ ماہ رمضان کے بعد سب سے بڑا خوف یہ ہوتا ہے کہ کہیں تلاوت، نمازِ شب اور غریبوں کی مدد کا یہ سلسلہ ٹوٹ نہ جائے۔ توفیق وہ رزق ہے جو اس تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیتا۔

- الْعِصْمَة **(عصمت/تحفظ):** عصمت کا مطلب صرف انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا نہیں ہے، بلکہ لغوی اعتبار سے اس کا مطلب ہر قسم کی برائی اور گناہ سے **"محفوظ رہنا"** ہے۔ انسان اللہ سے التجا کرتا ہے کہ اے رب! جب شیاطین دوبارہ آزاد کر دیے جائیں گے، تو مجھے گناہوں کے حملے سے بچنے کے لیے اپنی عصمت اور تحفظ کی وہ زِرہ پہنا دے جس میں دنیا کی کوئی برائی شگاف نہ ڈال سکے۔

۳. وَطَهِّرْ قَلْبِي مِنْ غَيَاهِبِ التُّهَمَةِ

باطل کا بیانیہ، شکوک کی تاریکیاں اور حق کی مزاحمت

تیسرا فقرہ انسان کے فکری، نظریاتی اور عقائدی تحفظ کی ایک انتہائی پُر جلال التجا ہے: "اور میرے دل کو تہمت (اور شکوک و شبہات) کی تاریکیوں سے پاک کر دے"۔

اس فقرے میں دو انتہائی ثقیل اور عمیق الفاظ استعمال ہوئے ہیں: "غَيَاهِب" اور "التُّهَمَة"۔

- "غَيَاهِب" (غیہب کی جمع) کا مطلب ہے انتہائی گہرا اور گھٹا ٹوپ اندھیرا، وہ تاریکی جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے (جیسے اندھے کنویں کی تاریکی، جسے قرآن نے 'غَيَابَتِ الْجُبِّ' کہا ہے)۔
- "التُّهَمَة" کا مطلب ہے جھوٹی تہمت، پروپیگنڈا، اور وہ شکوک و شبہات جو حق کو دھندلا دیں۔

دورِ حاضر میں جب باطل اور ظالم قوتیں اپنے جھوٹے بیانیے اور پروپیگنڈے کے ذریعے حق کے خلاف شکوک و شبہات کی تاریکیاں پھیلاتی ہیں، تو ایک مؤمن کے لیے سب سے کٹھن مرحلہ اپنے دل اور عقل کو ان "غیاہب" (تاریکیوں) سے پاک رکھنا ہوتا ہے۔ باطل ہمیشہ تہمت اور جھوٹ کا لبادہ اوڑھ کر حق کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے حالات میں، اللہ کی بارگاہ سے وہ

بصیرت درکار ہوتی ہے جو انسان کو اس نظریاتی یلغار سے بچا کر حق کی ثابت قدم مزاحمت کے روشن راستے پر گامزن رکھے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام باطل کی اس آمیزش اور تاریکی کو بے نقاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «فَلَوْ أَنَّ الْبَاطِلَ خَلَصَ مِنْ مِزَاجِ الْحَقِّ لَمْ يَخْفَ عَلَى الْمُرْتَادِينَ... وَلَكِنْ يُؤْخَذُ مِنْ هَذَا ضِغْثٌ، وَمِنْ هَذَا ضِغْثٌ فَيُمْزَجَانِ» "پس اگر باطل حق کی آمیزش سے بالکل الگ ہو کر سامنے آتا، تو وہ حق کے متلاشیوں پر ہرگز پوشیدہ نہ رہتا... لیکن (فتنہ پرور لوگ) کچھ حصہ ادھر (حق) سے لیتے ہیں اور کچھ حصہ ادھر (باطل) سے لیتے ہیں، اور پھر ان دونوں کو آپس میں ملا دیتے ہیں"[1]۔

پس ہم دعا کرتے ہیں کہ اے خالق! ہمارے دلوں کو ان ظالموں کے پھیلائے ہوئے باطل بیانیوں اور نظریاتی تاریکیوں سے اس قدر پاک کر دے کہ ہم روزِ روشن کی طرح حق کا دفاع کر سکیں۔

٤. يَا رَحِيماً بِعِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ

رحمتِ خاصہ اور مؤمنین کا ابدی حصار

دعا کا اختتام اللہ تعالیٰ کی اس صفتِ خاص پر ہوتا ہے جو صرف اور صرف اہلِ ایمان کے لیے مختص ہے: "اے اپنے مؤمن بندوں پر رحم کرنے والے"۔

اللہ کی دو نمایاں صفات "الرحمٰن" اور "الرحیم" ہیں۔ الرحمٰن وہ رحمتِ عامہ ہے جو دوست،

---

[1] سید رضی، نہج البلاغہ، خطبہ ۵۰۔

دشمن، کافر، مؤمن، اور کائنات کے ہر ذرے پر برستی ہے۔ لیکن "الرحیم" وہ رحمتِ خاصہ ہے جو صرف ان مؤمنین کے لیے مختص ہے جنہوں نے اللہ کے احکامات کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا اور اس کے حق کے بیانیے کو سینے سے لگائے رکھا۔

قرآنِ مجید میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا﴾ "اور وہ مؤمنین پر ہمیشہ سے بے حد مہربان (رحیم) ہے"[1]۔

انتیسویں روزے کی اس الوداعی ساعت میں، جب ہم اپنے اعمال نامے کی تکمیل کی طرف دیکھ رہے ہیں، تو ہم اللہ کی اسی رحمتِ خاصہ کا واسطہ دے کر عرض کرتے ہیں کہ اے پروردگار! ہم نے تیرے حکم پر بھوک اور پیاس کی شدت کو برداشت کیا اور باطل کی تمام تاریکیوں کو مسترد کر کے تیرے حق کو تسلیم کیا ہے۔ پس ہمیں اپنے ان مؤمن بندوں کی صف میں شامل فرما لے جن پر تیرا غضب نہیں بلکہ تیری دائمی رحمت اور عصمت کا سایہ ہوتا ہے۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے انتیسویں دن کی دعا درحقیقت رحمتِ الٰہی کی سرپرستی، اعمال کی بقا اور نظریاتی دفاع کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے:

- **رحمتِ الٰہی کا مکمل غلاف اور سرپرستی:** دعا کا آغاز 'غشّنی' (مجھے مکمل ڈھانپ لے) کے نہایت بلیغ قرآنی لفظ سے ہوتا ہے۔ نویں دن روزے دار نے رحمت کا محض ایک 'حصہ'

[1] قرآن مجید، سورہ الاحزاب، آیت ۴۳۔

مانگا تھا، مگر اب مہینے کے اختتام پر اس کی طلب عروج پر پہنچ چکی ہے۔ عربی میں غشاوۃ اس غلاف کو کہتے ہیں جو شے کو مکمل چھپا لے۔ بندہ التجا کرتا ہے کہ اے رب! مجھے اپنی رحمت کے ایسے غلاف میں چھپا لے جس سے تیرے عذاب کی کوئی کرن مجھ تک نہ پہنچ سکے۔

- **توفیق کا تسلسل اور گناہوں سے ابدی تحفظ:** دعا کے دوسرے فقرے میں آئندہ عملی زندگی کے لیے دو عظیم نعمتوں کو 'رزق' قرار دیا گیا ہے۔ پہلی 'توفیق'، جس کا مقصد یہ ہے کہ رمضان کے بعد بھی نمازِ شب، تلاوت اور ہمدردی کا یہ سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے، بلکہ اسباب ساز گار رہیں۔ دوسری 'عصمت'، جس کا لغوی مطلب گناہوں سے محفوظ رہنا ہے۔ بندہ التجا کرتا ہے کہ شیاطین کے دوبارہ آزاد ہونے پر مجھے تحفظ کی ایسی روحانی زرہ پہنا دے جس میں دنیا کی کوئی برائی شگاف نہ ڈال سکے۔

- **باطل کا بیانیہ، شکوک کی تاریکیاں اور مزاحمت:** دعا کا تیسرا اور نہایت پُر جلال حصہ فکری اور نظریاتی تحفظ پر مبنی ہے۔ 'غیاہب' کا مطلب اندھے کنویں جیسی تاریکی اور 'تہمت' کا مطلب باطل کا جھوٹا پروپیگنڈا اور شکوک ہیں۔ ظالم قوتیں حق کو دھندلانے کے لیے یہی حربہ استعمال کرتی ہیں۔ امیر المومنین علی علیہ السلام کی تنبیہ کے مطابق، باطل ہمیشہ حق کی آمیزش کے ساتھ فتنہ برپا کرتا ہے۔ روزے دار اللہ سے وہ بصیرت مانگتا ہے جو اس کے دل کو باطل کے بیانیوں کی تاریکیوں سے پاک کر دے تاکہ وہ مزاحمت کے روشن راستے پر گامزن رہ سکے۔

- **رحمتِ خاصہ اور مؤمنین کا ابدی حصار:** دعا کا اختتام اللہ کو 'رحیماً بعبادہ المؤمنین' پکارنے پر

ہوتا ہے۔ رحمان وہ رحمتِ عامہ ہے جو دوست اور دشمن سب پر محیط ہے، جبکہ 'رحیم' وہ رحمتِ خاصہ ہے جو صرف ان مؤمنین کے لیے ہے جنہوں نے حق کو سینے سے لگایا۔ ان الوداعی ساعتوں میں بندہ عرض کرتا ہے کہ اے پروردگار! میں نے تیرے حکم پر پیاس سہی اور باطل کی تاریکیوں کو مسترد کیا ہے، پس مجھے اپنے ان مؤمن بندوں کی صف میں شامل کرلے جن پر تیری دائمی رحمت کا سایہ رہتا ہے۔

تیسویں دن کی دعا



﴿اَللَّهُمَّ اجْعَلْ صِيَامِي فِيهِ بِالشُّكْرِ وَالْقَبُولِ، عَلَىٰ مَا تَرْضَاهُ وَيَرْضَاهُ الرَّسُولُ، مُحْكَمَةً فُرُوعُهُ بِالْأُصُولِ، بِحَقِّ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾

اے اللہ! میرے اس مہینے کے روزے کو شکر اور قبولیت سے ہمکنار فرما، ان شرائط پر جنہیں تو اور تیرا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پسند فرمائے، جس کی فروع (شاخیں) اس کے اصول (جڑوں) کے ساتھ محکم (مضبوط) جڑی ہوں، ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی پاکیزہ آل (علیہم السلام) کے حق کے واسطے، اور تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔

تیسواں دن: احساسِ تشکر، فروع و اصول کا ربط اور حمدِ ابدی

ماہِ رمضان المبارک کا تیسواں اور آخری دن، در حقیقت بندگی کے اس طویل اور کٹھن سفر کے اختتام پر اپنے نامۂ اعمال کو لپیٹنے اور اسے بارگاہِ صمدیت میں پیش کرنے کا انتہائی حساس مقام ہے۔ یہ الوداعی ساعت اس بات کی متقاضی ہے کہ انسان اب کوئی نئی مادی یا روحانی طلب پیش کرنے کے بجائے، اپنے انجام دیے گئے اعمال (روزہ، قیام، تلاوت) کی بقا اور ان کی حتمی قبولیت کی التجا کرے۔ اس دعا کا سب سے خوبصورت اور عمیق عرفانی پہلو یہ ہے کہ بندہ اپنے اعمال پر فخر یا غرور کرنے کے بجائے سراپا تشکر بن جاتا ہے، اور اپنی ہر عبادت کو اللہ اور اس کے محبوب رسول ﷺ کی رضا کے تابع کر دیتا ہے۔ یہ بیان ہمیں دین کے اس بنیادی فلسفے سے آشنا کرتا ہے کہ جب تک اعمال کی شاخیں (فروع) عقائد کی مضبوط جڑوں (اصول) کے ساتھ پیوستہ نہ ہوں، کوئی عمل بارآور نہیں ہوتا۔ پس روزے دار اس یقین کے ساتھ اپنے سفر کا اختتام کرتا ہے کہ کائنات کے سب سے اعظم وسیلے (محمد و آلِ محمد ع) کے صدقے میں اس کی یہ ٹوٹی پھوٹی بندگی شرفِ قبولیت پائے گی، اور اس کے لبوں پر کائنات کا سب سے ابدی اور سچا کلمہ "الحمد للہ رب العالمین" جاری ہو جاتا ہے۔

دعا کا مرکزی پیغام

ماہِ رمضان کے تیسویں دن کی دعا بندگی کے سفر کے اختتام پر اعمال کی قبولیت، احساسِ تشکر اور عقیدے کی پختگی کا اعلان ہے۔ یہ مناجات سالک کو سکھاتی ہے کہ عبادت کا کمال اس کی کثرت میں نہیں بلکہ اس کا اللہ اور رسول ﷺ کی مرضی کے مطابق ہونا اور عقائد (اصول) کے ساتھ مضبوطی

سے جڑا ہونا ہے۔ یہ دعا دراصل اپنے تمام تر اعمال کو محمد و آلِ محمد علیہم السلام کے نورانی واسطے سے بارگاہِ الٰہی میں پیش کر کے، کائنات کے پالنے والے کی حتمی حمد و ثنا پر اپنی بندگی کی مہر ثبت کرنے کا نام ہے۔

دعا کے اہم نکات

- **شکر اور قبولیت کا مقام:** مہینہ بھر کی عبادت کے بعد نفس کے غرور سے بچتے ہوئے، اللہ کی دی گئی توفیق پر سراپا شکر بن جانا اور اعمال کی حتمی قبولیت کی التجا کرنا۔

- **رضائے الٰہی اور رضائے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وحدت:** اپنی مرضی سے کی گئی عبادت کے بجائے، عمل کو اس سانچے میں ڈھالنے کی پکار جو خالق اور اس کے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں کی پسند کے عین مطابق ہو۔

- **فروع اور اصول کا محکم رابطہ:** اپنے اعمالِ عبادی (شاخوں/فروع) کو اپنے نظریات، معرفت اور ولایت کی بنیادوں (جڑوں/اصول) کے ساتھ اس قدر مضبوط جوڑنا کہ کوئی فتنہ اسے متزلزل نہ کر سکے۔

- **وسیلۂ طاہرہ اور حمدِ ابدی:** اپنے ناقص اعمال کی قبولیت کے لیے طہارتِ مطلقہ کے پیکر (رسول اور آلِ رسول ع) کا واسطہ پیش کرنا، اور اپنی ہر سانس کو پروردگار کی حمد (الحمد للہ) کے لیے وقف کر دینا۔

دعائیہ فقرات کی تشریح

١. اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صِيَامِي فِيهِ بِالشُّكْرِ وَالْقَبُولِ

شکر کا مقام اور اعمال کی قبولیت

دعا کا پہلا فقرہ بندگی کے اختتام پر غرور کے بجائے احساسِ تشکر کو بیدار کرتا ہے: "اے اللہ! میرے اس مہینے کے روزے کو شکر اور قبولیت سے ہمکنار فرما"۔ جب انسان ایک مہینہ مسلسل عبادات انجام دیتا ہے، تو نفسِ امارہ کے دھوکے میں آکر اسے اپنے اعمال پر فخر محسوس ہونے لگتا ہے۔ لیکن ایک عارف اور سچا مؤمن جانتا ہے کہ اگر اللہ کی توفیق شاملِ حال نہ ہوتی تو وہ ایک دن کی بھوک بھی برداشت نہ کر سکتا۔ اس لیے وہ اپنے عمل پر "شکر" ادا کرتا ہے کہ اے پروردگار، تیرا احسان ہے کہ تو نے مجھے اپنی بندگی کے قابل سمجھا۔ اور "قَبُول" (قبولیت) عمل سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ امام علی رضاعلیہ السلام اعمال کی قبولیت کے اس حتمی معیار کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: «مَنْ لَمْ يَشْكُرِ الْمُنْعِمَ مِنَ الْمَخْلُوقِينَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ» "جس شخص نے مخلوق میں سے احسان کرنے والے کا شکر ادا نہیں کیا، اس نے (گویا) اللہ عَزَّوَجَلَّ کا شکر ادا نہیں کیا"[1]۔

بندہ التجا کر رہا ہے کہ یارب! میرے روزے کو ایسا بنا دے جو تیرے حضور شکر کا عملی مظہر ہو اور شرفِ قبولیت پا کر میرے نامۂ اعمال میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے۔

---

[1] شیخ صدوق، عیون اخبار الرضا (علیہ السلام)، جلد ۲، صفحہ ۲۴۔

٢. عَلَىٰ مَا تَرْضَاهُ وَيَرْضَاهُ الرَّسُولُ

رضائے الٰہی اور رضائے مصطفیٰ ﷺ کی وحدت

دعا کا دوسرا تقاضا قبولیت کے قطعی اور حتمی معیار کو بیان کرتا ہے: "ان شرائط پر جنہیں تو اور تیرا رسول ﷺ پسند فرمائے"۔ بسا اوقات انسان اپنی مرضی اور پسند کے مطابق عبادت کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اللہ راضی ہو گیا، لیکن بندگی کا اصل کمال یہ ہے کہ عمل اس معیار پر پورا اترے جو خالق اور اس کے محبوب رسول ﷺ کو پسند ہو۔ قرآنِ مجید نے رضائے الٰہی کو رضائے رسول ﷺ کے ساتھ اس طرح جوڑ دیا ہے کہ انہیں الگ کرنا ناممکن ہے: ﴿وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَن يُرْضُوهُ إِن كَانُوا مُؤْمِنِينَ﴾ "حالانکہ اللہ اور اس کا رسول اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ یہ انہیں راضی کریں، اگر یہ واقعی مؤمن ہیں"[1]۔ اس فقرے میں ہم اپنے ہر علمی، فکری اور عبادتی عمل کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی کے تابع کر دیتے ہیں۔ اگر ہم نے پورے مہینے ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کیا ہے، تو التجا کرتے ہیں کہ ہمارے اس عمل کو معاف فرما کر اسے اپنی پسند کے سانچے میں ڈھال لے۔

---

[1] قرآن مجید، سورہ التوبہ، آیت ٦٢۔

۳. مُحْكَمَةً فُرُوعُهُ بِالْأُصُولِ

فروع اور اصول کا محکم رابطہ، نظریے اور عمل کی وحدت

تیسرا فقرہ اس دعا کا سب سے بڑا اور طاقتور عقائدی اور عملی مرکز ہے: "جس کی فروع (شاخیں) اس کے اصول (جڑوں) کے ساتھ محکم (مضبوط) جڑی ہوں"۔ اسلامی عقائد میں "اصول" وہ جڑیں ہیں جن پر دین کی عمارت کھڑی ہے (جیسے توحید، عدل، نبوت، امامت، اور قیامت)، اور "فروع" ان جڑوں سے پھوٹنے والی شاخیں اور اعمال ہیں (جیسے نماز، روزہ، حج، جہاد، امر بالمعروف)۔ اگر جڑ کمزور ہو تو شاخیں کبھی ہری نہیں رہ سکتیں۔ عقائد کی جڑیں جب مضبوط ہوتی ہیں، تو عمل کی شاخیں خود بخود ثمر آور ہو جاتی ہیں۔ خواہ وہ کلامِ الٰہی کے مفاہیم، علومِ الٰہی اور معارف اہل بیت علیہم السلام کو دنیا تک پہنچانے کی اعلیٰ تحقیقی کاوش ہو، یا عالمی استکبار اور باطل کے غاصبانہ بیانیے کے خلاف قلمی استقامت، آگاہی اور مقاومت کا محاذ ہو—یہ سب فروع اسی وقت بارگاہِ الٰہی میں شرفِ قبولیت پاتے ہیں جب ان کا رشتہ توحید، ولایت اور حق کے اصولوں سے نہایت محکم اور اٹوٹ ہو۔ قرآنِ پاک اس محکم اور غیر متزلزل رابطے کی مثال یوں پیش کرتا ہے: ﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ﴾ "کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کلمہ طیبہ (پاکیزہ بات/عقیدے) کی کیسی مثال بیان کی ہے؟ وہ ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہے، جس کی جڑ (اصول) نہایت محکم اور مضبوط ہے اور اس کی شاخیں (فروع) آسمان سے باتیں کر رہی ہیں"[1]۔ ہم التجا کرتے ہیں کہ یا اللہ، میرے روزے اور میری بندگی (فروع) کو میری ولایت اور معرفت (اصول) کے ساتھ ایسا محکم کر دے کہ دنیا کا کوئی فتنہ اس عمارت کو نہ گرا سکے۔

---

[1] قرآن مجید، سورہ ابراہیم، آیت ۲۴۔

٤. بِحَقِّ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

وسیلۂ طاہرہ اور حمدِ ابدی

دعا کا اختتام اس نورانی کائنات کے سب سے عظیم وسیلے اور حمدِ پروردگار پر ہوتا ہے: "ہمارے سردار محمد ﷺ اور ان کی پاکیزہ آل علیہم السلام کے حق کے واسطے، اور تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے"۔ جب ایک انسان پورے تیس دن کی مشقت کے بعد اپنا نامۂ اعمال لے کر رب کے سامنے پیش ہوتا ہے، تو وہ جانتا ہے کہ اس کا عمل سراسر نقص ہے۔ اس لیے وہ ان ہستیوں کا "حق" اور واسطہ پیش کرتا ہے جن کے وجود کی برکت سے یہ کائنات تخلیق کی گئی ہے۔ وہ ان ہستیوں کا وسیلہ لاتا ہے جو طہارتِ مطلقہ کا پیکر (آلِ طاہرین علیہم السلام) ہیں۔ اور بالآخر، سفر کا اختتام اس کلمے پر ہوتا ہے جس پر کائنات کے ہر وجود کا اختتام ہوتا ہے: ﴿وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾۔ بندہ اعتراف کرتا ہے کہ اے اللہ، اس مہینے کی ابتدا تیری توفیق سے ہوئی، اس کا درمیانی حصہ تیری مغفرت سے آباد رہا، اور اب اس کا اختتام تیری حمد اور ثناء پر ہو رہا ہے۔ میری زندگی کی ہر دھڑکن اور ہر سانس تیری ہی حمد کی گواہ ہے۔

خلاصہ

ماہِ رمضان المبارک کے تیسویں دن کی دعا درحقیقت نامۂ اعمال کی پیشکش، عقائد کی درستگی اور شکرِ پروردگار کا ایک مکمل نصاب ہے۔ اس تشریح کا نچوڑ درج ذیل اہم نکات پر مشتمل ہے: **شکر کا مقام اور اعمال**

کی قبولیت: دعا کا آغاز روزے کو 'شکر' اور 'قبولیت' سے ہمکنار کرنے کی التجا سے ہوتا ہے۔ ایک ماہ کی مسلسل عبادت کے بعد نفسِ امارہ انسان کو غرور میں مبتلا کر سکتا ہے۔ لیکن سچا مؤمن جانتا ہے کہ اللہ کی توفیق کے بغیر وہ ایک دن کی بھوک نہیں سہہ سکتا تھا، اس لیے وہ فخر کے بجائے شکر ادا کرتا ہے۔ امام رضاؑ کے مطابق مخلوق کا شکر نہ کرنا خدا کا شکر نہ کرنے کے مترادف ہے۔ بندہ عرض کرتا ہے کہ میرے روزے کو ایسا بنا دے جو تیرے حضور شکر کا عملی مظہر ہو اور شرفِ قبولیت پا لے۔ **رضائے الٰہی اور رضائے مصطفیٰ ﷺ کی وحدت:** دعا کا دوسرا تقاضا قبولیت کا حتمی معیار بتاتا ہے؛ یعنی عمل کا ان شرائط پر پورا اترنا جو اللہ اور رسول ﷺ کو پسند ہوں۔ قرآن نے رضائے الٰہی اور رضائے رسول ﷺ کو آپس میں اس طرح جوڑ دیا ہے کہ انہیں الگ کرنا ناممکن ہے۔ روزے دار التجا کرتا ہے کہ اگر پورے مہینے مجھ سے تیری اور تیرے حبیب ﷺ کی مرضی کے خلاف کوئی کام ہوا ہے، تو اسے معاف فرما کر میرے ہر عمل کو اپنی پسند کے سانچے میں ڈھال لے۔ **فروع اور اصول کا محکم رابطہ:** دعا کا تیسرا اور طاقتور ترین حصہ 'فروع' (اعمال جیسے روزہ، نماز) کو 'اصول' (عقائد کی جڑوں جیسے توحید اور ولایت) کے ساتھ مضبوط (محکم) کرنا ہے۔ اگر جڑ کمزور ہو تو شاخیں کبھی ہری نہیں رہتیں۔ قرآن نے کلمہ طیبہ کی مثال ایک ایسے پاکیزہ درخت سے دی ہے جس کی جڑ محکم اور شاخیں آسمان میں ہیں۔ ہم التجا کرتے ہیں کہ ہماری بندگی اور روزے کو ہماری معرفت کے ساتھ ایسا مضبوط جوڑ دے کہ حق و باطل کے معرکوں میں ہمارا قدم کبھی نہ ڈگمگائے۔ **وسیلۂ طاہرہ اور حمدِ ابدی:** دعا اور اس مبارک مہینے کا اختتام کائنات کے عظیم ترین وسیلے (محمد و آلِ محمد ع) کے حق کے واسطے اور اللہ کی حمد پر ہوتا ہے۔ تیس دن کی مشقت کے بعد انسان اپنے عمل کو ناقص پا کر ان ہستیوں کا وسیلہ لاتا ہے جو طہارتِ مطلقہ کا پیکر ہیں۔ اور بالآخر، سفر کا اختتام ﴿وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ پر ہوتا ہے۔ بندہ اعتراف کرتا ہے کہ اس مہینے کی ابتدا تیری توفیق تھی، وسط تیری مغفرت تھی، اور اب اس کا اختتام تیری حمد و ثنا پر ہو رہا ہے۔

حرفِ آخر

ماہِ صیام کی ان تیس نورانی دعاؤں کی تشریح اور ان کے مفاہیم کا یہ طویل، علمی اور روحانی سفر اللہ رب العزت کی توفیق اور محمد و آلِ محمد علیہم السلام کی خاص عنایت کے بغیر ہرگز ممکن نہ تھا۔ یہ کاوش محض الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ بندگی، طہارت اور عرفان کی اس بلند منزل تک پہنچنے کی ایک ادنیٰ سی سعی ہے جس کا تعین مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام نے کیا ہے۔ جب قلم اپنے اختتامی کلمات کی جانب بڑھتا ہے، تو دل میں فقط ایک ہی آرزو اور تمنا مچلتی ہے کہ اس کاوش کو کائنات کے اس حقیقی وارث کے حضور پیش کیا جائے، جس کے وجودِ مسعود کی برکت سے یہ کائنات قائم و دائم ہے۔

ہم اپنی اس پوری علمی و تحقیقی ریاضت، اور اس میں پوشیدہ ہر سچے جذبے کو اپنے وقت کے امام، حجتِ خدا، بقیۃ اللہ الاعظم، امام مہدی عَجَّلَ اللّٰهُ تَعَالَىٰ فَرَجَهُ الشَّرِيف کی بارگاہِ اقدس میں ہدیہ کرتے ہیں:

اے ہمارے آقا و مولا! ہماری عقلیں محدود، ہمارے اعمال ناقص، اور ہمارے قلم کی استطاعت نہایت کمزور ہے۔ ہم نے ماہِ مبارک کی ان دعاؤں کے اسرار کو سمجھنے اور انہیں قرطاس پر منتقل کرنے کی جو کوشش کی ہے، اس میں اگر کوئی خوبی، کمال اور حقانیت ہے، تو وہ خالصتاً آپ کے در کی خیرات اور آپ کی غیبی دستگیری کا نتیجہ ہے؛ اور جو خامی، کوتاہی یا لغزش ہے، وہ سراسر ہمارے نفس کی کمزوری ہے۔ آپ 'عینُ اللہ' ہیں اور ہمارے ظاہر و باطن سے بخوبی واقف ہیں۔ ہماری اس شکستہ کاوش اور اس حقیر سے علمی ہدیے کو اپنی وسعتِ شفقت اور نگاہِ کرم کے صدقے شرفِ قبولیت عطا فرمائیں۔

اے وارثِ علمِ انبیاء! ہم نے کلامِ الٰہی اور فرامینِ معصومین علیہم السلام کو ان کی اصل روح کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کٹھن راستے میں جو بھی لغزشِ قلم ہوئی ہو، اسے اپنے حلم اور درگزر کی

چادر میں چھپا لیجیے۔ ہم اس بات کا کھلے دل سے اقرار کرتے ہیں کہ آپ کے جدِ امجد امیر المومنین علیہ السلام اور دیگر آئمہ طاہرین علیہم السلام کے کلام کی جو وسعت اور گہرائی ہے، ہم اس کے ایک قطرے کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے۔ پس ہماری اس حقیر سی پونجی کو اسی طرح قبول فرما لیجیے، جیسے کریم اپنے سائلین کے ٹوٹے ہوئے پیالوں کو موتیوں سے بھر دیتے ہیں۔

اے پروردگار! اس علمی اور تحقیقی کاوش کو ہمارے لیے، ہمارے مرحومین کے لیے، اسے مرتب کرنے والوں کے لیے، اور اس کے پڑھنے والوں کے لیے دنیا اور آخرت میں نجات کا حتمی ذریعہ بنا دے۔ ہمارے دلوں کو نورِ ولایت سے منور رکھ اور ہمیں اپنے امام عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے حقیقی منتظرین، آپ کے اعوان و انصار، اور آپ کے ظہور کے بعد آپ کے عالمی نظامِ عدل کے سچے خادموں میں شمار فرما۔ وہ نظام جو حق کا حقیقی اور ناقابلِ تسخیر مرکز ہوگا، اور جس کے سامنے کائنات کا ہر باطل نظام گھٹنے ٹیک دے گا۔

﴿اَللَّهُمَّ كُنْ لِوَلِيِّكَ الْحُجَّةِ بْنِ الْحَسَنِ، صَلَوَاتُكَ عَلَيْهِ وَعَلَى آبَائِهِ، فِي هَذِهِ السَّاعَةِ وَفِي كُلِّ سَاعَةٍ، وَلِيّاً وَحَافِظاً، وَقَائِداً وَنَاصِراً، وَدَلِيلًا وَعَيْناً، حَتَّى تُسْكِنَهُ أَرْضَكَ طَوْعاً، وَتُمَتِّعَهُ فِيهَا طَوِيلاً﴾

آمین، یا رب العالمین

فہرستِ منابع و مآخذ

القرآن الکریم

۱) ابن منظور، محمد بن مکرم، **لسان العرب**، بیروت، دار صادر، ۱۴۱۴ق۔

۲) آمدی، عبدالواحد بن محمد، **غرر الحکم و درر الکلم**، قم، دفتر تبلیغات، ۱۳۶۶ش۔

۳) بحرانی، سید ہاشم، **البرہان فی تفسیر القرآن**، تہران، بنیاد بعثت، ۱۴۱۶ق۔

۴) طبرسی، فضل بن حسن، **مجمع البیان فی تفسیر القرآن**، تہران، ناصر خسرو، ۱۳۷۲ش۔

۵) طوسی، محمد بن حسن، **مصباح المتہجد و سلاح المتعبد**، بیروت، مؤسسہ فقہ الشیعہ، ۱۴۱۱ق۔

۶) طریحی، فخر الدین، **مجمع البحرین**، تہران، مرتضوی، ۱۳۷۵ش۔

۷) حر عاملی، محمد بن حسن، **وسائل الشیعہ**، قم، مؤسسہ آل البیت (علیہم السلام)، ۱۴۰۹ق۔

۸) حرانی، حسن بن شعبہ، **تحف العقول عن آل الرسول**، قم، جامعہ مدرسین، ۱۴۰۴ق۔

۹) راغب اصفہانی، حسین بن محمد، **مفردات الفاظ القرآن**، بیروت، دار القلم، ۱۴۱۲ق۔

۱۰) سید ابن طاؤس، علی بن موسیٰ، **اقبال الاعمال**، تہران، دار الکتب الاسلامیہ، ۱۳۶۷ش۔

۱۱) شریف رضی، محمد بن حسین، **نہج البلاغہ**، قم، انتشارات ہجرت، ۱۴۱۴ق۔

۱۲) شیخ صدوق، محمد بن علی، **الخصال**، قم، جامعہ مدرسین، ۱۳۶۲ش۔

۱۳) شیخ صدوق، محمد بن علی، **عیون اخبار الرضا (علیہ السلام)**، تہران، نشر جہان، ۱۳۷۸ق۔

۱۴) شیخ صدوق، محمد بن علی، **معانی الاخبار**، قم، دفتر انتشارات اسلامی، ۱۴۰۳ق۔

۱۵) علی ابن الحسین (علیہ السلام)، **الصحیفہ السجادیہ**، قم، نشر الہادی، ۱۳۷۶ش۔

۱۶) قمی، شیخ عباس، **مفاتیح الجنان**، تہران، مرکز نشر آثار اساتذہ، ۱۳۷۹ش۔

۱۷) کلینی، محمد بن یعقوب، **الکافی**، تہران، دار الکتب الاسلامیہ، ۱۴۰۷ق۔

۱۸) مجلسی، محمد باقر، **بحار الانوار الجامعہ لدرر اخبار الائمہ الاطہار**، بیروت، مؤسسہ الوفاء، ۱۴۰۳ق۔

۱۹) مجلسی، محمد باقر، **زاد المعاد**، بیروت، موسسہ الاعلمی للمطبوعات، ۱۴۲۳ق۔

۲۰) مصطفوی، حسن، **التحقیق فی کلمات القرآن الکریم**، تہران، بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب، ۱۳۶۰ش۔



"دعا محض کچھ مانگنے کی غرض سے ہاتھ پھیلانے کا نام نہیں، بلکہ یہ 'خالق سے ہمکلام ہونے'، 'اپنے وجود کو مٹانے' اور حقیقی معنوں میں 'بندہ بننے' کا ایک پُر شکوہ عمل ہے۔ 'تجلیاتِ بندگی' ماہِ رمضان کی تیس یومیہ دعاؤں کی روشنی میں تزکیۂ نفس، عقائد کی پختگی اور قلبی طہارت کا ایک ایسا مستند اور عرفانی سفر ہے، جو قاری کو خوابِ غفلت سے بیدار کر کے رضائے الٰہی کی معراج تک لے جاتا ہے۔ یہ کتاب اس بات کا شعور بخشتی ہے کہ اعمال کی شاخیں (فروع) اس وقت تک شرفِ قبولیت نہیں پاتیں جب تک کہ وہ معرفت اور ولایت کی جڑوں (اصول) کے ساتھ مضبوطی سے پیوستہ نہ ہوں۔"